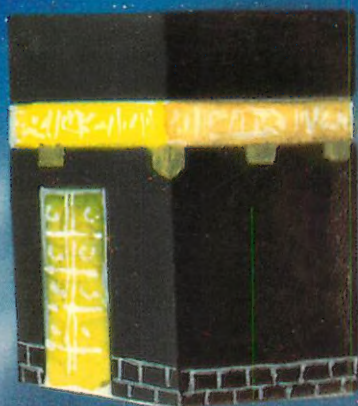


وَاتَّبِعُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ



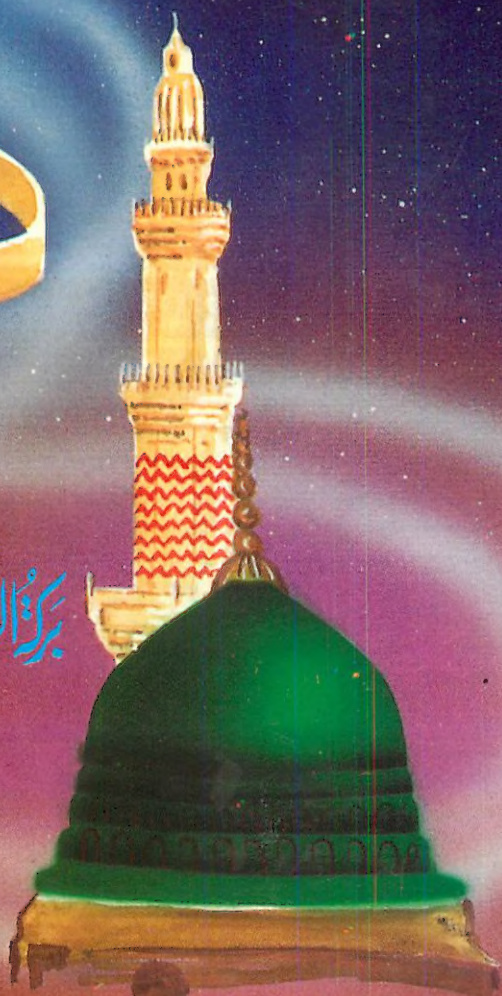
حَجَّ الزُّوَادِ عُمَرَاءُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

تأليف

بِرَّكَاتُ الْعَصْرِ حَضْرَتِ الْحَاجِّ الْخَافِضِ مَوْلَانَا مُحَمَّدُ زَكْرِيَّا كَانِزُ هُلُو شَمْسِ الدِّينِ

ترجمہ

مَوْلَانَا مُحَمَّدُ رُؤُوسُفَ لَدَهِيَانَوِي



ناشر

مَعْمَدُ الْخَلِيلِ لَاسْمَعَلِي

۲۲۵/۳ بہادر آباد، کراچی، پاکستان

وَاتَّبَعُوا الْحُجَّةَ وَالْغَيْثَ

حَجَّةُ الْوَدَاعِ

عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ

تأليف

برکتہ اعظمیہ الحافظ الحاج مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم المدنی

ترجمہ

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

ناشر

مِغْنَمَةُ الْخَلِيلِ الْإِسْلَامِيِّ

۳۴۵/۳، بہادر آباد، سرکاری پاکستان

ملنے کے پتے

- ① اسلامی کُتب خانہ - علامہ بنوری ٹاؤن - کراچی
- ② درخواستی کُتب خانہ - علامہ بنوری ٹاؤن - کراچی
- ③ کُتب خانہ مظہری - گلشن اقبال - کراچی
- ④ مولانا اقبال مُعمانی - آفیسرز کالونی گارڈن روڈ - کراچی
- ⑤ مکتبۃُ الشیخؒ ۳۶۷/۳ بہادر آباد - کراچی
- ⑥ مکتبہ سید احمد شہید - اُردو بازار - لاہور

فہرست مضامین سالانہ حجۃ الوداع

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	سبب تالیف	۱۳	۲۲	قارن پردہ طواف اور دو مرتبہ سعی لازم ہے	۳۱
۲	آنحضرتؐ نے کتنے حج کیے؟	۱۵	۲۳	آنحضرتؐ کے احرام میں چھ قول	۳۲
۳	آنحضرتؐ کے ولادہ حج کا اعلان	۱۶	۲۴	حج پر عمو کا احرام باندھنے کا حکم	۳۴
۴	شرکائے حجۃ الوداع کی تعداد	۱۷	۲۵	افراد و متح کی روایات کا جواب	۳۴
۵	حج کس سال فرض ہوا؟	۱۶	۲۶	تلبیہ کا حکم اور وقت	۳۵
۶	مدینہ سے روانگی : تاریخ، وقت اور دن	۱۸	۲۷	حدیث تلبیہ اور حدیث اشعث میں تعلیق	۳۶
۷	مدینہ سے مکہ جانے کے راستے	۱۹	۲۸	آنحضرتؐ نے کس وقت احرام باندھا	۳۷
۸	وادی حقیق میں فرشتہ کی آمد	۲۰	۲۹	مخبرم کا ہجوم میں سرگرمی اور سامنے میں	۳۸
۹	غسل احرام اور اس کا حکم	۲۱	۳۰	بٹھنا جائز ہے یا نہیں؟	۳۹
۱۰	احرام کے لیے خوشبو لگانا	۲۲	۳۱	آنحضرتؐ نے صحابہ کو تینوں مساک کا اختیار دیا	۴۱
۱۱	دو گنا احرام کا حکم	۲۳	۳۲	محمد بن ابی بکرؓ کی ولادت	۴۱
۱۲	تلبیہ کے حکم میں اختلاف	۲۴	۳۳	حالیہ کا احرام کے لیے غسل کرنا	۴۱
۱۳	میقات سے پہلے احرام باندھنے کا حکم	۲۵	۳۴	تلبیہ کے الفاظ زبان سے کہنا ضروری ہے یا نہیں؟	۴۲
۱۴	آنحضرتؐ نے کس جگہ سے تلبیہ شروع کیا	۲۵	۳۵	تلبیہ کے الفاظ اور ان میں کمی بیشی کا حکم	۴۲
۱۵	ہدی کو قتلہ پہننے کا حکم	۲۵	۳۶	آنحضرتؐ کا موضع خلل میں پہنچنے لگنا	۴۳
۱۶	ہدی کے اشیاء کا حکم	۲۶	۳۷	محرّم کے لیے پہنچنے لگنا جائز ہے یا نہیں؟	۴۳
۱۷	محل اشعار میں اختلاف	۲۷	۳۸	دوسری منزل روحار	۴۴
۱۸	میقات سے ہدی ساتھ لے جانا	۲۷	۳۹	تیسری منزل اثایہ	۴۵
۱۹	آنحضرتؐ قارن تھے : اس کے دلائل	۲۸	۴۰	زخمی برن کا وائے	۴۶
۲۰	حج کی تین اقسام سے کون سی قسم افضل ہے	۲۸	۴۱	محرّم کا شکار حرام ہے	۴۶
۲۱	آنحضرتؐ کے حج کی نوعیت میں اختلاف	۳۰	۴۲	نہجی جبل میں سیب لگوانا	۴۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۴۱	چوتھی منزل : الحرج	۴۸	۶۳	آنحضرت کا اعلیٰ مندر سے داخل ہونا	۶۷
۴۲	آنحضرت اور حضرت ابوبکرؓ کا سامان ایک ہی [۴۸	۶۴	آپؐ عمرو میں اعلیٰ مندر سے داخل ہونے یا پہلے نکلے؟	۶۷
	اوشی پر تھا۔		۶۵	آپؐ کس دن بخون میں داخل ہوئے؟	۶۸
۴۳	حضرت ابوبکرؓ کا غلام کو مارنا	۴۹	۶۶	بیت اللہ شریف کو دیکھنے کے وقت ہاتھ اٹھانا۔	۶۸
۴۴	پانچویں منزل : البراء	۵۰	۶۷	سجدہ حرام میں تحیۃ المسجد کا حکم	۷۰
۴۵	البراء : حضرت کی والدہ ماجدہ کا مدفن	۵۰	۶۸	حجر اسود کا اسلام اور اس کے آداب	۷۰
۴۶	صعب بن جہاش کا گدھ خرید کرنا	۵۱	۶۹	زلزل کا حکم	۷۲
۴۷	محرّم کے شکار میں اختلاف	۵۲	۷۰	اضطباع کا حکم	۷۳
۴۸	حضرت صفیہؓ کے اونٹ کا بیمار ہونا	۵۲	۷۱	زکریاؑ کی تقبیل ثابت نہیں	۷۳
۴۹	آنحضرت کی حضرت زینبؓ سے رضی	۵۲	۷۲	طواف پیدل کیا جائے یا ساری پر؟	۷۴
۵۰	انجشہ کے لیے حکم نبوی : روید سوقك بالقرآن	۵۴	۷۳	طواف قدوم کا حکم	۷۵
۵۱	موضع ہرثی	۵۵	۷۴	دو گانہ طواف کا حکم	۷۷
۵۲	چھٹی منزل : عثمان	۵۵	۷۵	طواف کے بعد حجر اسود کا اسلام کرنا اور نہ فرم لینا	۷۷
۵۳	سراۃ کی جانب سے بیان واضح کی درخواست	۵۸	۷۶	بہ صفا سے صفا کی طرف نکلتا	۷۸
۵۴	منزل سرف	۵۸	۷۷	صفا سے سعی کی ابتداء کرنا	۷۸
۵۵	حضرت عائشہؓ کے حج میں اختلاف	۵۹	۷۸	میلین انضرین کے درمیان دوڑنا	۷۹
۵۶	حضرت عائشہؓ نے عمر فارح کو دیا تھا : [۶۰	۷۹	آنحضرت کی سعی پیدل تھی یا ساری پر؟	۸۰
	حنفیہ کے دلائل		۸۰	ابن خزم کا وہم	۸۱
۵۷	حضرت عائشہؓ کے طہر کی جگہ میں اختلاف	۶۱	۸۱	آنحضرت کا طواف ساری پر تھا یا پیدل؟	۸۱
۵۸	موضع سرف میں صحابہ کو بیچ حج کا اختیار دینا	۶۲	۸۲	سعی کے متعلق تین بحثیں	۸۱
۵۹	حج کا اعرا م فرج حج کے عمر و بنا لینے کا حکم	۶۲	۸۳	سعی کے بعد دو گانہ کا حکم	۸۲
۶۰	ذی طوی میں آپؐ کا نسل زنا اور مکہ میں اہل ہونا	۶۴	۸۴	سعی کا حکم	۸۲
۶۱	ارشاد نبوی : گویا میں نبیؐ کو دیکھ رہا ہوں	۶۵	۸۵	فرج اسرام کا قطعی حکم	۸۳
۶۲	مکہ میں دن کو داخل ہونا بہتر ہے یا رات کو؟	۶۶	۸۶	ارشاد نبوی : لو استقبلت من امری	۸۴

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۹۶	وقوف عرفات پیدل ہر ساری پر؟	۱۰۹	۸۵	۸۷	حق کرانے والوں کے لیے تین بار دعا
۹۷	آنحضرت کا خطبہ عرفات	۱۱۰		۸۸	حضرت معاویہ کی روایت کہ انھوں نے
۹۷	میدان عرفات میں ساری پر آپ کا مدد و نفع و فدا	۱۱۱	۸۵		مردہ پر آنحضرت کا قصر کیا تھا۔
۹۸	حاجی کے لیے عرفہ کے روزے کا حکم	۱۱۲	۸۷	۸۹	ارشاد نبوی: عموچ میں داخل ہو گیا کا مطلب
۹۸	عرفات کا خطبہ ایک سب سے یادو؟	۱۱۳	۸۷	۹۰	ان صحابہ کے ہم جنہوں نے احرام نہیں کھولا
۹۹	عرفات میں اذان و اقامت کی تعداد میں اختلاف	۱۱۴	۸۸	۹۱	یمن سے حضرت علیؑ کی آمد
۱۰۱	عرفات میں قصر اور حج کے سبب میں اختلاف	۱۱۵	۸۸	۹۲	احرام بیہوش و غفلت
۱۰۳	آنحضرت کا وقف عرفات	۱۱۶	۸۹	۹۳	حضرت علیؑ کا حضرت فاطمہؑ سے ناراض ہونا
۱۰۳	حج و قریب عرفہ کا نام ہے	۱۱۷	۸۹	۹۴	آنحضرت کا تحہ سے باہر قیام کرنا
۱۰۳	وقوف عرفہ بالا جماع کرکے ہے	۱۱۸	۹۰	۹۵	حضرت شداد کی عبادت و وصیت
۱۰۳	وقوف عرفہ کا وقت	۱۱۹	۹۰	۹۶	حدیث طہطہ
۱۰۴	عرفات کے علاوہ کئی اور جگہ عرفہ منانا	۱۲۰		۹۷	کیا ان چاروں میں آنحضرت طواف کعبہ
۱۰۵	باجی حق تفسیر کے سراسر میں دھڑلے مغفرت	۱۲۱	۹۰		کے لیے تشریف لے گئے تھے؟
۱۰۵	کا قبول ہونا	۱۲۱	۹۱	۹۸	باب کعبہ کے پس آپ کا خطبہ
۱۰۵	عرفات میں ایک حاجی کا انتقال	۱۲۲	۹۲	۹۹	خطبات حج میں اختلاف
۱۰۵	سوت کے بعد احرام باقی رہتا ہے یا نہیں؟	۱۲۳	۹۲	۱۰۰	منیٰ کو روانگی
۱۰۷	آیت: الیوم اکملت لکم دینکم کا نزول	۱۲۴	۹۲	۱۰۱	الطبع اس احرام باندھنا
۱۰۸	اس آیت کے نازل ہونے پر حضرت عرفہ کا روزہ	۱۲۵	۹۳	۱۰۲	سورۃ الرسالت کا نزول
۱۰۸	عرفات سے روانگی کا وقت	۱۲۶	۹۳	۱۰۳	حجہ کے حج کی فضیلت
۱۰۸	غروب پہلے عرفات سے چلنا	۱۲۷	۹۴	۱۰۴	منیٰ سے عرفات کو روانگی
۱۰۹	نزدانہ پہنچنے سے پہلے مغرب کی نماز پڑھنے کا حکم	۱۲۸	۹۴	۱۰۵	حجس کا عرفات نہ جانا
۱۰۹	نایزین کا راستہ	۱۲۹	۹۴	۱۰۶	صنبت کا راستہ
۱۱۰	ارشاد نبوی: علیکم السکینۃ	۱۳۰	۹۵	۱۰۷	بزرفہ عرفات میں داخل ہونا یا نہیں؟
۱۱۰	انشائے راہ میں پیشاب کے لیے اجزا اور دو حدیں میں	۱۳۱	۹۶	۱۰۸	بشی عرفہ عرفات میں داخل ہونا یا نہیں؟

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱۳۰	کسی شخص کی طرف سے حج بدل جائز ہے یا نہیں؟	۱۵۳		تعارض کا حل	
۱۳۰	مرد و عورت کا ایک دوسرے کی جانب سے [حج بدل صحیح ہے یا نہیں؟	۱۵۴	۱۱۲	آپ زفرم سے دُخو	۱۳۶
۱۳۱	حج بدل کے متعلق دس بحثیں	۱۵۵	۱۱۳	مزدلف پہنچنا اور مزدلفہ کی وجہ تسمیہ	۱۳۷
۱۳۲	ایک شخص کا اپنی والدہ کے بارے میں سوال کرنا	۱۵۶	۱۱۴	آنحضرتؐ نے مغرب کے بعد کھانا [تناول فرمایا یا نہیں؟	۱۳۸
۱۳۳	بطین مختصر میں سواری کو تیز کرنا	۱۵۷	۱۱۵	مزدلفہ میں اذان و اقامت کی تعداد میں اختلاف	۱۳۹
۱۳۳	موتیر کی وجہ تسمیہ	۱۵۸		آپؐ نے مغرب ہفتار کے درمیان نوافل [نہیں پڑھے دان کے بعد	۱۴۰
۱۳۵	جرہ عقبہ کے پاس آنحضرتؐ کی جگہ کھڑے ہونے	۱۵۹	۱۱۶		
۱۳۵	رمی کا حکم	۱۶۰	۱۱۷	مزدلفہ میں جمع بین الصلواتین کا سبب	۱۴۱
۱۳۶	رمی پیدل ہو یا سواری پر؟	۱۶۱	۱۱۸	کیا مزدلفہ کی راستہ آپؐ نے تہجد پڑھی؟	۱۴۲
۱۳۶	جرہ کے پاس سے اٹھائی ہوئی لنگریں رمی کرنا	۱۶۲	۱۱۹	ضخارہ کو رمی کی طرف جلدی جانے کی اجازت	۱۴۳
۱۳۸	رمی کے متعلق سات بحثیں	۱۶۳	۱۲۰	ضخارہ سے کون کوک مراد ہیں۔	۱۴۴
۱۳۹	ساتوں لنگریں ایک ہی بار پھینک دینے کا حکم	۱۶۴	۱۲۱	ان کے جانے کا وقت	۱۴۵
۱۳۹	رمی کی بجائے صرف بجیر کھانا	۱۶۵	۱۲۲	مزدلفہ میں شب گزاری اور وقوف میں اختلاف	۱۴۶
۱۴۱	حاجی تبدیک بے بند کرے؟	۱۶۶	۱۲۳	یوم نحر کی رمی کا وقت	۱۴۷
۱۴۱	خطبہ یوم نحر	۱۶۷	۱۲۴	کیا مزدلفہ کی رات حضرت اُمّ سلمہؓ کی باری تھی؟	۱۴۸
۱۴۳	سورۃ النصر کا نزول	۱۶۸	۱۲۵	باجی حقوق کے بارے میں آپؐ کی دعا کا قبول ہونا	۱۴۹
۱۴۴	خطبہ نحر پر دیا یا اونٹنی پر؟	۱۶۹	۱۲۶	حج سے گناہوں کی مغفرت	۱۵۰
۱۴۵	حضرت علیؓ کا ترجمانی کرنا	۱۷۰	۱۲۷	ارشاد نبویؐ: جرح شخص سواری اس نماز میں حاضر ہونا	۱۵۱
۱۴۷	جرح الوداع کی وجہ تسمیہ اور دیگر نام	۱۷۱	۱۲۸	طلوع آفتاب سے قبل مزدلفہ سے چلنا	۱۵۲
۱۴۹	ارشاد نبویؐ: "شاید میں تمہیں اس سال کے [بعد نہیں دیکھوں گا"	۱۷۲	۱۲۹	شیر مکتے کے پانچ پہاڑوں کا نام	۱۵۳
۱۵۰	ارشاد نبویؐ: "کوئی حرج نہیں، اب کرلو"	۱۷۳	۱۳۰	ابن عباسؓ کا راستہ سے کنکریاں اٹھانا	۱۵۴
۱۵۰	یوم نحر کے چار افعال میں تقدیم و تاخیر کے مباحث	۱۷۴	۱۳۱	قبیلہ خثعم کی ایک خاتون کا سوال	۱۵۵
			۱۳۲	جرح شخص خود قاتل نہ ہو اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟	۱۵۶

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱۵۲	۱۹۷	۱۵۳	۱۹۸	۱۷۱
۱۵۲	۱۹۷	۱۵۴	۱۹۹	۱۷۲
۱۵۳	۱۹۸	۱۵۵	۲۰۰	۱۷۳
۱۵۴	۱۹۹	۱۵۶	۲۰۱	۱۷۴
۱۵۵	۲۰۰	۱۵۷	۲۰۲	۱۷۵
۱۵۶	۲۰۱	۱۵۸	۲۰۳	۱۷۶
۱۵۷	۲۰۲	۱۵۹	۲۰۴	۱۷۷
۱۵۸	۲۰۳	۱۶۰	۲۰۵	۱۷۸
۱۵۹	۲۰۴	۱۶۱	۲۰۶	۱۷۹
۱۶۰	۲۰۵	۱۶۲	۲۰۷	۱۸۰
۱۶۱	۲۰۶	۱۶۳	۲۰۸	۱۸۱
۱۶۲	۲۰۷	۱۶۴	۲۰۹	۱۸۲
۱۶۳	۲۰۸	۱۶۵	۲۱۰	۱۸۳
۱۶۴	۲۰۹	۱۶۶	۲۱۱	۱۸۴
۱۶۵	۲۱۰	۱۶۷	۲۱۲	۱۸۵
۱۶۶	۲۱۱	۱۶۸	۲۱۳	۱۸۶
۱۶۷	۲۱۲	۱۶۹	۲۱۴	۱۸۷
۱۶۸	۲۱۳	۱۷۰	۲۱۵	۱۸۸
۱۶۹	۲۱۴	۱۷۱	۲۱۶	۱۸۹
۱۷۰	۲۱۵	۱۷۲	۲۱۷	۱۹۰
۱۷۱	۲۱۶	۱۷۳	۲۱۸	۱۹۱
۱۷۲	۲۱۷	۱۷۴	۲۱۹	۱۹۲
۱۷۳	۲۱۸	۱۷۵	۲۲۰	۱۹۳
۱۷۴	۲۱۹	۱۷۶	۲۲۱	۱۹۴
۱۷۵	۲۲۰	۱۷۷	۲۲۲	۱۹۵
۱۷۶	۲۲۱	۱۷۸	۲۲۳	۱۹۶
۱۷۷	۲۲۲	۱۷۹	۲۲۴	۱۹۷
۱۷۸	۲۲۳	۱۸۰	۲۲۵	۱۹۸
۱۷۹	۲۲۴	۱۸۱	۲۲۶	۱۹۹
۱۸۰	۲۲۵	۱۸۲	۲۲۷	۲۰۰
۱۸۱	۲۲۶	۱۸۳	۲۲۸	۲۰۱
۱۸۲	۲۲۷	۱۸۴	۲۲۹	۲۰۲
۱۸۳	۲۲۸	۱۸۵	۲۳۰	۲۰۳
۱۸۴	۲۲۹	۱۸۶	۲۳۱	۲۰۴
۱۸۵	۲۳۰	۱۸۷	۲۳۲	۲۰۵
۱۸۶	۲۳۱	۱۸۸	۲۳۳	۲۰۶
۱۸۷	۲۳۲	۱۸۹	۲۳۴	۲۰۷
۱۸۸	۲۳۳	۱۹۰	۲۳۵	۲۰۸
۱۸۹	۲۳۴	۱۹۱	۲۳۶	۲۰۹
۱۹۰	۲۳۵	۱۹۲	۲۳۷	۲۱۰
۱۹۱	۲۳۶	۱۹۳	۲۳۸	۲۱۱
۱۹۲	۲۳۷	۱۹۴	۲۳۹	۲۱۲
۱۹۳	۲۳۸	۱۹۵	۲۴۰	۲۱۳
۱۹۴	۲۳۹	۱۹۶	۲۴۱	۲۱۴
۱۹۵	۲۴۰	۱۹۷	۲۴۲	۲۱۵
۱۹۶	۲۴۱	۱۹۸	۲۴۳	۲۱۶
۱۹۷	۲۴۲	۱۹۹	۲۴۴	۲۱۷
۱۹۸	۲۴۳	۲۰۰	۲۴۵	۲۱۸
۱۹۹	۲۴۴	۲۰۱	۲۴۶	۲۱۹
۲۰۰	۲۴۵	۲۰۲	۲۴۷	۲۲۰
۲۰۱	۲۴۶	۲۰۳	۲۴۸	۲۲۱
۲۰۲	۲۴۷	۲۰۴	۲۴۹	۲۲۲
۲۰۳	۲۴۸	۲۰۵	۲۵۰	۲۲۳
۲۰۴	۲۴۹	۲۰۶	۲۵۱	۲۲۴
۲۰۵	۲۵۰	۲۰۷	۲۵۲	۲۲۵
۲۰۶	۲۵۱	۲۰۸	۲۵۳	۲۲۶
۲۰۷	۲۵۲	۲۰۹	۲۵۴	۲۲۷
۲۰۸	۲۵۳	۲۱۰	۲۵۵	۲۲۸
۲۰۹	۲۵۴	۲۱۱	۲۵۶	۲۲۹
۲۱۰	۲۵۵	۲۱۲	۲۵۷	۲۳۰
۲۱۱	۲۵۶	۲۱۳	۲۵۸	۲۳۱
۲۱۲	۲۵۷	۲۱۴	۲۵۹	۲۳۲
۲۱۳	۲۵۸	۲۱۵	۲۶۰	۲۳۳
۲۱۴	۲۵۹	۲۱۶	۲۶۱	۲۳۴
۲۱۵	۲۶۰	۲۱۷	۲۶۲	۲۳۵
۲۱۶	۲۶۱	۲۱۸	۲۶۳	۲۳۶
۲۱۷	۲۶۲	۲۱۹	۲۶۴	۲۳۷
۲۱۸	۲۶۳	۲۲۰	۲۶۵	۲۳۸
۲۱۹	۲۶۴	۲۲۱	۲۶۶	۲۳۹
۲۲۰	۲۶۵	۲۲۲	۲۶۷	۲۴۰
۲۲۱	۲۶۶	۲۲۳	۲۶۸	۲۴۱
۲۲۲	۲۶۷	۲۲۴	۲۶۹	۲۴۲
۲۲۳	۲۶۸	۲۲۵	۲۷۰	۲۴۳
۲۲۴	۲۶۹	۲۲۶	۲۷۱	۲۴۴
۲۲۵	۲۷۰	۲۲۷	۲۷۲	۲۴۵
۲۲۶	۲۷۱	۲۲۸	۲۷۳	۲۴۶
۲۲۷	۲۷۲	۲۲۹	۲۷۴	۲۴۷
۲۲۸	۲۷۳	۲۳۰	۲۷۵	۲۴۸
۲۲۹	۲۷۴	۲۳۱	۲۷۶	۲۴۹
۲۳۰	۲۷۵	۲۳۲	۲۷۷	۲۵۰
۲۳۱	۲۷۶	۲۳۳	۲۷۸	۲۵۱
۲۳۲	۲۷۷	۲۳۴	۲۷۹	۲۵۲
۲۳۳	۲۷۸	۲۳۵	۲۸۰	۲۵۳
۲۳۴	۲۷۹	۲۳۶	۲۸۱	۲۵۴
۲۳۵	۲۸۰	۲۳۷	۲۸۲	۲۵۵
۲۳۶	۲۸۱	۲۳۸	۲۸۳	۲۵۶
۲۳۷	۲۸۲	۲۳۹	۲۸۴	۲۵۷
۲۳۸	۲۸۳	۲۴۰	۲۸۵	۲۵۸
۲۳۹	۲۸۴	۲۴۱	۲۸۶	۲۵۹
۲۴۰	۲۸۵	۲۴۲	۲۸۷	۲۶۰
۲۴۱	۲۸۶	۲۴۳	۲۸۸	۲۶۱
۲۴۲	۲۸۷	۲۴۴	۲۸۹	۲۶۲
۲۴۳	۲۸۸	۲۴۵	۲۹۰	۲۶۳
۲۴۴	۲۸۹	۲۴۶	۲۹۱	۲۶۴
۲۴۵	۲۹۰	۲۴۷	۲۹۲	۲۶۵
۲۴۶	۲۹۱	۲۴۸	۲۹۳	۲۶۶
۲۴۷	۲۹۲	۲۴۹	۲۹۴	۲۶۷
۲۴۸	۲۹۳	۲۵۰	۲۹۵	۲۶۸
۲۴۹	۲۹۴	۲۵۱	۲۹۶	۲۶۹
۲۵۰	۲۹۵	۲۵۲	۲۹۷	۲۷۰
۲۵۱	۲۹۶	۲۵۳	۲۹۸	۲۷۱
۲۵۲	۲۹۷	۲۵۴	۲۹۹	۲۷۲
۲۵۳	۲۹۸	۲۵۵	۳۰۰	۲۷۳
۲۵۴	۲۹۹	۲۵۶	۳۰۱	۲۷۴
۲۵۵	۳۰۰	۲۵۷	۳۰۲	۲۷۵
۲۵۶	۳۰۱	۲۵۸	۳۰۳	۲۷۶
۲۵۷	۳۰۲	۲۵۹	۳۰۴	۲۷۷
۲۵۸	۳۰۳	۲۶۰	۳۰۵	۲۷۸
۲۵۹	۳۰۴	۲۶۱	۳۰۶	۲۷۹
۲۶۰	۳۰۵	۲۶۲	۳۰۷	۲۸۰
۲۶۱	۳۰۶	۲۶۳	۳۰۸	۲۸۱
۲۶۲	۳۰۷	۲۶۴	۳۰۹	۲۸۲
۲۶۳	۳۰۸	۲۶۵	۳۱۰	۲۸۳
۲۶۴	۳۰۹	۲۶۶	۳۱۱	۲۸۴
۲۶۵	۳۱۰	۲۶۷	۳۱۲	۲۸۵
۲۶۶	۳۱۱	۲۶۸	۳۱۳	۲۸۶
۲۶۷	۳۱۲	۲۶۹	۳۱۴	۲۸۷
۲۶۸	۳۱۳	۲۷۰	۳۱۵	۲۸۸
۲۶۹	۳۱۴	۲۷۱	۳۱۶	۲۸۹
۲۷۰	۳۱۵	۲۷۲	۳۱۷	۲۹۰
۲۷۱	۳۱۶	۲۷۳	۳۱۸	۲۹۱
۲۷۲	۳۱۷	۲۷۴	۳۱۹	۲۹۲
۲۷۳	۳۱۸	۲۷۵	۳۲۰	۲۹۳
۲۷۴	۳۱۹	۲۷۶	۳۲۱	۲۹۴
۲۷۵	۳۲۰	۲۷۷	۳۲۲	۲۹۵
۲۷۶	۳۲۱	۲۷۸	۳۲۳	۲۹۶
۲۷۷	۳۲۲	۲۷۹	۳۲۴	۲۹۷
۲۷۸	۳۲۳	۲۸۰	۳۲۵	۲۹۸
۲۷۹	۳۲۴	۲۸۱	۳۲۶	۲۹۹
۲۸۰	۳۲۵	۲۸۲	۳۲۷	۳۰۰
۲۸۱	۳۲۶	۲۸۳	۳۲۸	۳۰۱
۲۸۲	۳۲۷	۲۸۴	۳۲۹	۳۰۲
۲۸۳	۳۲۸	۲۸۵	۳۳۰	۳۰۳
۲۸۴	۳۲۹	۲۸۶	۳۳۱	۳۰۴
۲۸۵	۳۳۰	۲۸۷	۳۳۲	۳۰۵
۲۸۶	۳۳۱	۲۸۸	۳۳۳	۳۰۶
۲۸۷	۳۳۲	۲۸۹	۳۳۴	۳۰۷
۲۸۸	۳۳۳	۲۹۰	۳۳۵	۳۰۸
۲۸۹	۳۳۴	۲۹۱	۳۳۶	۳۰۹
۲۹۰	۳۳۵	۲۹۲	۳۳۷	۳۱۰
۲۹۱	۳۳۶	۲۹۳	۳۳۸	۳۱۱
۲۹۲	۳۳۷	۲۹۴	۳۳۹	۳۱۲
۲۹۳	۳۳۸	۲۹۵	۳۴۰	۳۱۳
۲۹۴	۳۳۹	۲۹۶	۳۴۱	۳۱۴
۲۹۵	۳۴۰	۲۹۷	۳۴۲	۳۱۵
۲۹۶	۳۴۱	۲۹۸	۳۴۳	۳۱۶
۲۹۷	۳۴۲	۲۹۹	۳۴۴	۳۱۷
۲۹۸	۳۴۳	۳۰۰	۳۴۵	۳۱۸
۲۹۹	۳۴۴	۳۰۱	۳۴۶	۳۱۹
۳۰۰	۳۴۵	۳۰۲	۳۴۷	۳۲۰
۳۰۱	۳۴۶	۳۰۳	۳۴۸	۳۲۱
۳۰۲	۳۴۷	۳۰۴	۳۴۹	۳۲۲
۳۰۳	۳۴۸	۳۰۵	۳۵۰	۳۲۳
۳۰۴	۳۴۹	۳۰۶	۳۵۱	۳۲۴
۳۰۵	۳۵۰	۳۰۷	۳۵۲	۳۲۵
۳۰۶	۳۵۱	۳۰۸	۳۵۳	۳۲۶
۳۰۷	۳۵۲	۳۰۹	۳۵۴	۳۲۷
۳۰۸	۳۵۳	۳۱۰	۳۵۵	۳۲۸
۳۰۹	۳۵۴	۳۱۱	۳۵۶	۳۲۹
۳۱۰	۳۵۵	۳۱۲	۳۵۷	۳۳۰
۳۱۱	۳۵۶	۳۱۳	۳۵۸	۳۳۱
۳۱۲	۳۵۷	۳۱۴	۳۵۹	۳۳۲
۳۱۳	۳۵۸	۳۱۵	۳۶۰	۳۳۳
۳۱۴	۳۵۹	۳۱۶	۳۶۱	۳۳۴
۳۱۵	۳۶۰	۳۱۷	۳۶۲	۳۳۵
۳۱۶	۳۶۱	۳۱۸	۳۶۳	۳۳۶
۳۱۷	۳۶۲	۳۱۹	۳۶۴	۳۳۷
۳۱۸	۳۶۳	۳۲۰	۳۶۵	۳۳۸
۳۱۹	۳۶۴	۳۲۱	۳۶۶	۳۳۹
۳۲۰	۳۶۵	۳۲۲	۳۶۷	۳۴۰
۳۲۱	۳۶۶	۳۲۳	۳۶۸	۳۴۱
۳۲۲	۳۶۷	۳۲۴	۳۶۹	۳۴۲
۳۲۳	۳۶۸	۳۲۵	۳۷۰	۳۴۳
۳۲۴	۳۶۹	۳۲۶	۳۷۱	۳۴۴
۳۲۵	۳۷۰	۳۲۷	۳۷۲	۳۴۵
۳۲۶	۳۷۱	۳۲۸	۳۷۳	۳۴۶
۳۲۷	۳۷۲	۳۲۹	۳۷۴	۳۴۷
۳۲۸	۳۷۳	۳۳۰	۳۷۵	۳۴۸
۳۲۹	۳۷۴	۳۳۱	۳۷۶	۳۴۹
۳۳۰	۳۷۵	۳۳۲	۳۷۷	۳۵۰
۳۳۱	۳۷۶	۳۳۳	۳۷۸	۳۵۱
۳۳۲	۳۷۷	۳۳۴	۳۷۹	۳۵۲
۳۳۳	۳۷۸	۳۳۵	۳۸۰	۳۵۳
۳۳۴	۳۷۹	۳۳۶	۳۸۱	۳۵۴
۳۳۵	۳۸۰	۳۳۷	۳۸۲	۳۵۵
۳۳۶	۳۸۱	۳۳۸	۳۸۳	۳۵۶
۳۳۷	۳۸۲	۳۳۹	۳۸۴	۳۵۷
۳۳۸	۳۸۳	۳۴۰	۳۸۵	۳۵۸
۳۳۹	۳۸۴	۳۴۱	۳۸۶	۳۵۹
۳۴۰	۳۸۵	۳۴۲	۳۸۷	۳۶۰
۳۴۱	۳۸۶	۳۴۳	۳۸۸	۳۶۱
۳۴۲	۳۸۷	۳۴۴	۳۸۹	۳۶۲
۳۴۳	۳۸۸	۳۴۵	۳۹۰	۳۶۳
۳۴۴	۳۸۹	۳۴۶	۳۹۱	۳۶۴
۳۴۵	۳۹۰	۳۴۷	۳۹۲	۳۶۵
۳۴۶	۳۹۱	۳۴۸	۳۹۳	۳۶۶
۳۴۷	۳۹۲	۳۴۹	۳۹۴	۳۶۷
۳۴۸	۳۹۳	۳۵۰	۳۹۵	۳۶۸
۳۴۹	۳۹۴	۳۵۱	۳۹۶	۳۶۹
۳۵۰	۳۹۵	۳۵۲	۳۹۷	۳۷۰
۳۵۱	۳۹۶	۳۵۳	۳۹۸	۳۷۱
۳۵۲				

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
۲۱۹	چرواہوں کو دودن کی رمی جمع کرنے کی اجازت	۱۸۹	۱۳۲	قبرلیت و عمار کے مقام
۲۲۰	آنحضرت نے آیہ تشریق کے تیسرے دن [کی رمی بھی فرمائی۔	۱۸۹	۲۳۳	نماز صبح گم میں ٹپھی یا بیرنگ تکہ؟
۲۲۱	منی سے منسوب کردہ انگلی	۱۹۰	۲۳۴	کدی کے راستہ سے واپسی
۲۲۲	منسوب میں اُترنا سنت ہے یا نہیں؟	۱۹۱	۲۳۵	راستہ بدلنے کی حکمت
۲۲۳	منسوب میں چار نمازوں کا استحباب	۱۹۳	۲۳۶	آپ زکرم کا ساتھ دے جانا
۲۲۴	حضرت کا طواف و دایر کرنا	۱۹۳	۲۳۷	خطبہ غدیر خم
۲۲۵	حضرت مصطفیٰ کی ماہراری کا قصہ	۱۹۴	۲۳۸	بچے کے حج کے مسائل
۲۲۶	حیض و نفاس والی عمر تزل کے طواف و دایر کا حکم	۱۹۵	۲۳۹	بطحہ میں رات گنارنا
۲۲۷	حضرت عائشہؓ کا عمرہ تنعیم	۱۹۵	۲۴۰	مدینہ میں براہ منقرس واحد
۲۲۸	کیا آنحضرت حجۃ الوداع میں بیت اللہ [کے اندر داخل ہوئے؟	۱۹۸	۲۴۱	جبل اُحد سے محبت
۲۲۹	العروۃ الوثقی	۲۰۰	۲۴۲	مدینہ میں داخل ہونے کی دُعا
۲۳۰	دُنیا کی نافر	۲۰۰	۲۴۳	اہم مسئلہ کے تقسیم روایات کا مخرطاب
۲۳۱	مقترم پر کھڑے ہونا	۲۰۰	۲۴۴	رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے
			۲۴۵	خاتمہ رسالہ

رسالہ عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۲۲۱	سبب تالیف	۵	۲۲۵	چوتھا فائدہ: آنحضرت کے عمروں کی تعداد
۲۲۲	فصل اول: چند فرائد	۶	۲۲۶	فصل دوم: عمرہ حدیبیہ
۲۲۲	پہلا فائدہ: عمرہ کے لغوی و اصطلاحی معنی	۷	۲۲۷	حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں داخل ہے
۲۲۳	دوسرا فائدہ: عمرہ کے حکم میں	۷	۲۲۸	عمرہ حدیبیہ کا سبب
۲۲۴	تیسرا فائدہ: میکار عمرہ کے حکم میں	۸	۲۳۰	مدینہ طیبہ سے روانگی

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۲۷۴	صلح نامہ کے شرائط	۳۳	۲۳۰	مٹرائے حدیبیہ کی تعداد	۹
۲۷۶	کیا اب بھی ایسی شرائط پر صلح ہو سکتی ہے؟	۳۴	۲۳۲	ابو جہل کے اونٹ کا قصہ	۱۰
۲۷۶	ابو جہل کی آمد	۳۵	۲۳۴	خدا علیہ سے جاسوس بھیجا	۱۱
۲۸۰	صلح سے قبل دو غلاموں کی آمد	۳۶	۲۳۵	حضرت ابو قحافہ کی آمد اور جاسوس کی واپسی	۱۲
۲۸۰	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضطراب	۳۷	۲۳۶	آپ کر روکنے کے بارے میں مشرکین کا مشورہ	۱۳
۲۸۳	صلح نامہ کا متن اور دس نکات	۳۸	۲۳۹	جاسوسی کے لیے خالد کے لشکر کی آمد	۱۴
۲۸۴	صلح نامہ کے گواہ	۳۹	۲۳۸	صلوۃ خوف کا نزول	۱۵
۲۸۷	رحم اللہ علیہ المخلصین	۴۰	۲۴۰	خزاعی جاسوس کی واپسی	۱۶
۲۸۸	کتنی مدت حدیبیہ میں قیام رہا؟	۴۱	۲۴۱	جنگ کے بارے میں آپ کا صحابہؓ سے مشورہ	۱۷
۲۸۸	احمد کے بارے میں قہمی مباحث	۴۲	۲۴۲	قد قطع اللہ عینا کا مطلب	۱۸
۲۸۸	سورۃ الفتح کا نزول	۴۳	۲۴۴	اوشنی کے بیٹھنے کا واقعہ	۱۹
۲۹۲	ابو بصیر کی آمد	۴۴	۲۴۵	پانی میں برکت کا معجزہ	۲۰
۲۹۶	ابو جہل وغیرہ کا ابو بصیر کے پاس پہنچ جانا	۴۵	۲۴۸	اصبح مومن بی وکافرا بالکواکب	۲۱
۲۹۸	دربار نبوی میں اونٹ کی شکایت	۴۶	۲۴۸	آیت فدیۃ اونی کا نزول	۲۲
۳۰۰	تیسری فصل: عمرۃ القضا	۴۷	۲۴۹	بدلی کی آمد	۲۳
۳۰۱	مختصر پر قضا واجب بنے یا نہیں؟	۴۷	۲۵۲	عروہ کی آمد	۲۴
۳۰۲	عمرۃ قضا کے لیے آنحضرتؐ کی ہدایت	۴۸	۲۶۱	کفانی کی آمد	۲۵
۳۰۲	ہدی کے اونٹوں پر بائیس سالہ کا فقر	۴۹	۲۶۳	حضرت عثمانؓ کو تکہ بھیجا	۲۶
۳۰۳	بطنی یا نج میں چھپا بیچ دینا	۵۰	۲۶۴	بیعت رضوان	۲۷
۳۰۴	موضع نحر میں حضرت میرٹھ سے نکاح	۵۱	۲۶۶	مکڑ کی آمد	۲۸
۳۰۶	احولیم کی حالت میں نکاح کا حکم	۵۲	۲۶۷	سیل کی آمد	۲۹
۳۰۷	آنحضرتؐ کا مکہ میں داخلہ اور قریش کا زور	۵۳	۲۶۸	غزوہ فجع کا سبب	۳۰
۳۰۸	ابن رواحہ کے اشعار	۵۴	۲۶۹	کتنی مدت تک کافروں سے صلح جائز ہے	۳۱
			۲۷۰	صلح نامہ کی تحریر	۳۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۵	زل اور اضطباع کا آغاز اور اس کا سبب	۳۱۰	۹۱	حضرت معاویہؓ کی حدیث کو احقر نے مردہ [۳۲۳
۲۶	آنحضرتؐ عمرہ القضاء میں کعبہ کے اندر داخل نہیں ہوئے	۳۱۲		کے پس آپؐ کا قہر کیا	
۲۷	کعبہ کی حجت پر حضرت بلالؓ کی اذان فتح مکہ میں ہوئی	۳۱۲	۹۲	اصبح بالجعرانۃ کبائت	۳۲۳
۲۸	حضرت سیرینہؓ کی رختی اور ولیدہؓ کا ارادہ فداء [۳۱۲	۹۳	حجرانہ سے کھج	۳۲۳
	اور ولیدہؓ کا انکار		۹۴	جامع الطريق طریق المدینۃ کا مطلب	۳۲۳
۲۹	اطح میں قیام	۳۱۵	۹۵	عتاب بن اسیدؓ کو سحر کا حکم معترفانہ	۳۲۴
۵۰	مدینہ کی طرف واپسی	۳۱۶	۹۶	مدینہ طیبہ واپسی	۳۲۵
۵۱	حضرت عمرہؓ کی صاحبزادی آپؐ کے پیچھے آئے	۳۱۶	۹۷	حضرت ابن عمرؓ کا عمرہ جواز سے انکار	۳۲۵
۵۲	خالد، مال کی مثل ہے	۳۱۷		پانچویں فصل : شغرات	۳۲۶
۵۳	مرضع سرف میں حضرت سیرینہؓ کی وفات ہوئی	۳۱۷			
	چوتھی فصل : عمرہ جواز		۹۸	عمرہ وجب	۳۲۶
			۹۹	عمرہ شرال	۳۲۸
۵۴	حجرانہ کا ضبط حرکات	۳۱۹	۱۰۰	عمرہ رمضان	۳۲۹
۵۵	فتح مکہ کے لیے روانگی کا سبب	۳۱۹		فوائد	۳۳۰
۵۶	خنین کو روانگی	۳۱۹			
۵۷	حجرانہ میں تقسیم خنائم	۳۲۰	۱۰۱	عمرہ کے لیے جبل کی طرف نکل جانا	۳۳۰
۵۸	وفد ہراؤن کی آمد	۳۲۰	۱۰۲	احرام عمرہ کے لیے افضل میقات	۳۳۲
۵۹	عمرہ جواز کا احرام باندھنا	۳۲۱	۱۰۳	حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا	۳۳۳
۶۰	عمرہ شرال کا عمل عمرہ جواز ہے	۳۲۱	۱۰۴	فاتنہ رسالہ	۳۳۴

تقدیم

از: شیخ الاسلام حضرت العلامة مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى، اما بعد

عبادت میں جو فضیلت حج بیت اللہ الحرام ایک عجیب و غریب عبادت ہے، حج کیا ہے؟ بارگاہ قدس کی تجلیات کا ایک کُوح فُجر نظر ہے، ایک سرسبز فانت اپنی استعداد کے مطابق اس مرکز تجلیات سے اپنا حشر حاصل کرتا ہے۔ اس منبع انوار کے جلوں سے نورانی پاتا ہے اور اس سرسبز فیضان سے فدا کرتے روحانی کا سالن مینا کرتا ہے۔ غسل کر کے اور لباس مرگ پہن کر وضوئے محبوب پر مرثیے کا حمد (احرام) باندھ لیتا ہے اور پھر عاشقانہ و الہاد انداز میں نعرۂ توحید بلند کرتا ہے، کبھی حریت کے علم میں بادہ پٹائی، صحرانوردی اور آئینہ پائی کے ذریعہ دل مضطر کا سکون ڈھونڈتا ہے اور کبھی دیوانہ وار تپا کاششِ محبوب میں دیارِ محبوب کے پتھر پر پتھر لگاتا ہے۔ صفاء، مردہ، سخی کے مراحل طے کر کے وادی عرفات پہنچ جاتا ہے جہاں حق تعالیٰ کی رحمت کی موسلا دھار بارش ہر تپتی ہے اور اپنے ظرف و استعداد کے مطابق سیرابی چل نکرتا ہے۔ مزدلفہ و منیٰ میں نفس و شیطان کے مقابلہ کے تمام مراحل طے کر کے اور نعمات الہیہ سے شربار ہو کر دیارِ محبوب کے آخری دیوار سے سرفراز ہوتا ہے اور دنیا و عقبیٰ کی سعادتوں سے الافال ہو کر وطن پہنچ جاتا ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج — جو فضیلت حج کے بعد ادا فرمایا — مدینہ طیبہ سے کیا۔ کس تاریخ کو دوا دہجئے؟ کب ذوالحلیفہ پہنچے؟ احرام کب اور کیسے باندھا؟ منازل سفر کیسے طے فرمائیں؟ راستے کی ایک ایک منزل پر کیا کیا واقعات پیش آئے؟ وہ کیا کیا جلیات فرمائیں؟ مرکز تجلیات الہی — بیت اللہ — کب پہنچے اور کس انداز میں پہنچے؟ طواف کیسے کیا؟ صفاء و مردہ کی سخی کیسے فرمائی؟ منیٰ کو روانگی کب ہوئی اور کس شان سے ہوئی؟ منیٰ سے عرفات کب اور کیسے پہنچے؟ وقوف عرفات کب سے کب تک رہا؟ کیا کیا پڑھا؟ کیا کیا انگٹا؟ اور کیسے انگٹا؟ حق تعالیٰ شاذ کی طرف سے کیا کیا انگٹا کرتی ہیں؟ عرفات سے مزدلفہ کا سفر کیسے ہوا؟ وہاں کب پہنچے؟ نمازیں کیسے پڑھیں؟ رات کیسے گزار دی؟ وہاں کیا کچھ انگٹا؟ کیسے وقوف فرمایا؟ منیٰ کے لیے کب روانگی ہوئی؟ وہی جبرلت کیسے کی؟ حج کی قربانی کیسے کی؟ کتنے جانور ذبح کیے؟ اور کیسے کیے؟ ان باتوں کو وہاں محفل کو کیسے ذکر اللہ میں گزارا؟ وہاں امت کو کیا کیا وصیتیں فرمائیں؟ منیٰ سے کب روانگی ہوئی؟ مصلح کس وقت پہنچے؟ وہاں کتنا ٹھہرے؟ بیت اللہ کا آخری دیدار اور آخری الداعی طواف کیسے کیا؟ مدینہ طیبہ واپسی کب ہوئی؟ سفر عیشی کے یہ تمام مراحل کتنے عرصے میں طے ہوئے؟ اور حیاتِ تقدس کے کتنے ایام باقی تھے؟ حج کے علاوہ عمرے

کہنے کیلئے؟ اور ان تمام اسفار میں کیا کیا واقعات پیش آئے اور کن کن مسائل کی گہرائی فرمائی؟

ان کے تمام سیرات کے تفصیلی جوابات کے لیے دورِ حاضر کے سب سے بڑے محدث، عالم، شیخ الحدیث حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب صدیقی، کاندھلوی ثم الدینی - دستِ بکرا تھم - کی کتاب "حجۃ الوداع و عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کیجیے جو اپنے موضوع پر جامع ترین کتاب ہے۔

یہ کتاب عربی زبان میں تھی جس سے علماء ہی مستفید ہو سکتے تھے۔ حق تعالیٰ برادرِ محترم مولانا محمد یوسف اڈھیالی - مدیر ماہنامہ "بینات" نیوٹاون کراچی کو جنہوں نے خیر عطا فرمائے جنہوں نے اس کا اردو ترجمہ کر کے عام مسلمانوں پر احسان فرمایا کہ اس خوانِ نیما سے ہر شخص فائدہ اٹھائے اور عربی نہ جانتے والے دینی علوم سے ناواقف حضرات بھی خوشہ چینی کر سکیں جس قلم سے علمی انجمن "بینات" وغیرہ میں مشافانِ دین کے داغوں کو معطر فرماتے رہتے ہیں۔ اس کے ترجمہ کے بارے میں کچھ کہنے کی حاجت نہیں۔ "مشک آنت کر خود بید نہ کر عطار" بگوئیڈ - جزاء عن العلم خیرا۔

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

۱۸ ربیع الآخر ۱۳۹۶ھ

مکرم حق بجانب رہی جہاں مولانا یوسف صاحب نے
 ہر قسم کے محنت و محنت سے
 حجتِ رسول کا ترجمہ مکمل ہونے کی وجہ سے
 ساری دینی کتابوں پر اسے دورِ ایک نے اردو
 پر اس نے اس کو حدِ قاریہ بنائے دونوں جہان
 میں برترین درجہ عطا فرمائے۔ یہ ناکارہ و مجزوم
 اردو کیا کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ آپ کی علمی مصروفیت میں
 برکت عطا فرمائے
 حضرت مولانا کے مقدمہ کے بعد کہہ لیتا تو راجِ خود
 درجہ خود رست کا صدق ہے اللہ تعالیٰ زیادہ
 سے زیادہ مولانا کو نورِ عالم کر میری راج سے بہت
 ہی بیجا میں مولانا کو جگتسنی پڑتی ہیں۔

مفت و السلام
 حضرت شیخ محمد تقی شاہ مظفر
 ۱۴ مئی ۱۹۶۶ء

حجۃ الوداع

حجۃ الوداع کا نام حجۃ الاسلام اور حجۃ البدل بھی ہے، جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں ہے اور خمین میں حجۃ التمام بھی ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیل خطبہ منیٰ میں آئے گی۔ ان شاء اللہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَامِدًا وَ مُصَلِّيًا وَ مُسَلِّمًا، اَمَّا بَعْدُ:۔ جب میں پہلی مرتبہ مشکوٰۃ شریف کی تدریس میں کتاب الحج پر پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قصہ حجۃ الوداع میں روایات کی کثرت اختلاف نے ورطہ حیرت میں ڈال دیا، کیونکہ میرے لئے اس فن شریف کی تدیس کا یہ پہلا موقع تھا۔ اگرچہ زمانہ تعلیم ہی سے یہ روایات موجب خلجان تھیں، کیونکہ ان کے طرق و متون اور ان کے درمیان تطبیق و ترجیح میں شدید اختلاف تھا۔ ان احاد پر مشائخ نے اگرچہ طویل کلام کیا ہے، چنانچہ نووی کہتے ہیں کہ قاضی عیاضؒ نے کہا ہے کہ:

”ان احادیث پر لوگوں نے بکثرت کلام کیا ہے۔ چنانچہ بعض نے بڑی عمدہ اور منصفانہ بحث کی ہے اور بعض نے تکلف و کوتاہی سے کام لیا ہے۔ بعض نے کثرت کلام سے بحث کو طویل کر دیا ہے اور بعض نے بقدر ضرورت پر اکتفا کر لیا ہے، اس سلسلہ میں میرے زیادہ تفصیلی کلام ابو جعفر طحاوی حنفی نے کیا ہے چنانچہ موصوف نے ہزار ورق سے زیادہ ہیں اس پر بحث کی ہے، انکے علاوہ ابو جعفر طبری، ابو عبد اللہ بن ابی شفرہ ان کے بھائی مہلب، قاضی ابو عبد اللہ بن مریط، قاضی ابوالحسن بن قسار بغدادی اور حافظ ابو عمر بن عبد البر وغیرہ نے ان احادیث پر بہت کچھ لکھا ہے۔ نووی کا کلام، مع اضافہ از شرح مواہب زرقانی، ختم ہوا تفصیل اوجز میں ہے۔“

اسی طرح قصہ حجۃ الوداع میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سب سے جامع ہے جن محدثین اور اہل یر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک کی تفصیل ذکر کی ہے۔ انہوں نے اسی حدیث کو مدار بنایا ہے اسی بنا پر شیخ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر کی کتاب الحج کے آغاز میں اسی حدیث کو ذکر فرمایا چنانچہ لکھتے ہیں:

”جی چاہا کہ اس رکن رنج کے آغاز میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث طویل سے برکت حاصل کروں، کہ یہ بہت بڑی اصل اور اس باب کی جامع ترین حدیث ہے۔“

اور نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

”یہ ایک عظیم الشان حدیث ہے جو بہت سے فوائد اور نفیس و اہم قواعد پر مشتمل ہے قاضی کہتے ہیں کہ لوگوں نے اس حدیث کے فقہی مسائل پر بکثرت کلام کیا ہے، اور اس حدیث کی شرح میں ابن منذر نے ایک بڑا رسالہ تالیف کیا ہے، اور اس سے دیر بعد سو سے زیادہ مسائل اخذ کئے ہیں اور اگر مزید غور و فکر اور بحث و تفتیش سے کام لیا جاتا تو تقریباً اتنے ہی اور مسائل اس سے نکل سکتے تھے۔“

نووی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

”حجۃ الوداع کی حدیث کو بہترین طریقہ سے روایت کرنے میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ سے سبقت لے گئے ہیں، انہوں نے مدینہ طیبہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی سے لے کر آخر تک حجۃ الوداع کا پورا واقعہ ذکر فرمایا ہے۔“

دہر حال ان احادیث پر متقدمین نے اگرچہ طویل کلام کیا ہے، مگر قصہ حجۃ الوداع پر مشتمل جو کتابیں میرے پاس موجود تھیں ان میں شیخ ابن قیمؒ کی ”زاد المعاد“ سب سے جامع نظر آئی شیخ ابن قیمؒ کے کلام میں واقعہ کی تفصیل اگرچہ موجود تھی مگر ان لوگوں کے لئے جو موصوف کے فقہی مسلک سے متفق نہیں، کچھ زیادہ مفید نہیں تھی، کہ اول تو اس میں جہلی مذہب کی تائید ہے، علاوہ ازیں اس میں احناف کے قول کو دوسروں کے اقوال سے ممتاز نہیں کیا گیا۔ اس لئے جی چاہا کہ ”زاد المعاد“ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک کے بیان کی تلخیص کروں۔ اور اصل قصہ کو اس رسالہ کا متن قرار دوں اور متعلقہ مباحث کہ بمنزلہ اسکی شرح کے بنادوں۔ نیز حضرات احناف کے اقوال اور دلائل و مؤیدات بھی ذکر کروں۔ مگر چونکہ مختصر وقت میں قصہ کا استخراج مقصود تھا، اور تمام متعلقہ مباحث کا ذکر اتنی قلیل فرصت میں ممکن نہ تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس قصہ کا خلاصہ بطور متن کے پہلے مرتب کر لیا جائے اور شرح و تعلیق کا اضافہ وقتاً فوقتاً فارغ اوقات میں ہوتا رہے۔ چنانچہ بتاریخ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۷۲ھ شب جمعہ کو مقامی وقت کے مطابق بارہ بجے اس رسالہ کا آغاز کیا۔ وَاللّٰهُ الْمَوْفِقُ لِكُلِّ خَيْرٍ وَالْمُبْتَغِي لِكُلِّ عُسْرٍ

مُحَمَّدٌ زَكْرِيَّا كَانَدِ هَلَوُیْ مدرسہ مطالعہ العلوم سہانہ پور

قال الشيخ ابن القيم وفصل في هديه صلى الله عليه وآله وسلم في حجة
توجه: شيخ ابن قيم فرماتے ہیں: فصل: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ حج کے بیان میں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجوں کی تعداد | وسلم کے طریقہ حج میں اس میں تو اختلاف نہیں کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد صرف سالہ میں ایک حج کیا، یعنی حجة الوداع [اس کو
حجة الوداع کہنا جائز ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے اور آئندہ بھی اُٹے گا] البتہ اس میں اختلاف
ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے حج کیا یا نہیں؟ - ترمذی شریف میں حضرت جابر
رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حج کئے دو ہجرت سے پہلے الخ امام ترمذی فرماتے
ہیں: "یہ حدیث بروایت سفیان خریج، امام بخاری اسے بروایت ثوری نہیں پہچانتے" — شیخ اکبر ابن
عربی نے اپنی کتاب "محاضرة الابرار ومسامرة الاخيار" میں اسی پر جزم کیا ہے۔ اسی طرح صاحب "سفر السعادة"
نے بھی: چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "جمہور علماء اس پر نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد صرف
ایک حج کیا۔ اور یہ حجة الوداع کہلاتا ہے۔ اور اس میں اختلاف نہیں کہ یہ سالہ میں ہوا ہے۔ باقی رہا
قبل از ہجرت کا سوال؟ سو جامع ترمذی میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل از ہجرت دو حج کئے۔ صاحب
"المحلی" نے نقل کیا ہے کہ آپ نے تین یا چار سے زیادہ حج کئے۔ مگر کوئی "تعداد محفوظ نہیں"۔

ابن اثیر فرماتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے قبل ہر سال حج کیا کرتے تھے" ابن جوزی کہتے ہیں کہ "آپ نے
اتنے حج کئے جنکی تعداد اللہ ہی جانتا ہے" ابن جوزی کا یہ قول حافظ ابن حجر حافظ عینی، قسطلانی نے مواہب میں
زر قانی شامی مواہب اور شامی سفر السعادة نے اسی طرح نقل کیا ہے ابن جوزی کے قول کا مضمون حاکم
نے سفیان ثوری سے بھی روایت کیا ہے۔۔۔ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے حج کیا، آپ نے
ہندوستان سے چالیس حج پیدل کئے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے حج نہ کیا ہو،
جیسا کہ "الاتناع" میں ہے۔ اور القبری، قاسم القرطبی، میں تخریج ازرقی، عثمان بن ساج سے نقل کیا ہے، وہ
فرماتے ہیں کہ مجھے سعید نے خبر دی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے ستر حج پیدل کئے۔ الحدیث۔

۱۔ حضرت شیخ مظاہ نے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ متن اور شرح میں جہاں عبارت "قال" کے لفظ سے شروع ہوگی وہ حافظ ابن
قیم کی عبارت ہے۔ اور قلت "اسے حضرت شیخ مظاہ کی اپنی عبارت ہوگی۔ ترجمہ میں "قال" کی جگہ صرف "وق" کی اور قلت کی
جگہ "وق" کی علامت رکھی گئی ہے۔ یعنی ق سے مراد ابن قیم اور شین سے مراد حضرت شیخ مظاہ۔ (مترجم)

رَقَالَ، وَلَمَّا نَزَلَ الْحَجَّ بِأَدْرِ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِ رَقَالَ، وَلَمَّا عَزَمَ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْلَمَ النَّاسَ أَنَّهُ حَاجٌّ

ترجمہ ابن قیم فرماتے ہیں: جب حج کا حکم نازل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تیاری شروع
کی (حق) اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا تو لوگوں کو عام اطلاع فرمائی کہ آپ حج پر جا رہے ہیں۔

ابن قیم فرماتے ہیں: جب حج کا حکم نازل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

حج کب فرض ہوا؟ | نے بغیر تاخیر کے اس کی تیاری شروع کی۔ اور حج کا حکم ۹ھ یا ۱۰ھ میں نازل

ہوا (دش)، علامہ عینی نے فرضیت حج کے سلسلہ میں ۸ھ سے ۱۰ھ تک متفرق اقوال ذکر کئے ہیں، اور اپنی
جانب سے کسی قول کو ترجیح نہیں دی۔ البتہ امام قسطلی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ۹ھ کو ترجیح دی ہے۔ اسی
طرح ملا علی قاری نے سن فرضیت میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد فرمایا: ”اس میں کل گیارہ اقوال ہیں۔ ان میں سے
اچھے قول بہتر نال کی تعیین کے ساتھ اور جز میں مفصل مذکور ہیں۔ شیخ ابن تیمیہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں: ”اس پر علماء
کا اتفاق ہے کہ ۸ھ سے پہلے حج فرض نہیں ہوا۔“ مگر میں کہتا ہوں کہ اور جز میں ایک قول ۸ھ کا بھی نقل کیا ہے۔
چنانچہ رافعی نے کتاب الحج میں اسی پر جزم کیا ہے، اور یہی المنتقی میں ہے۔ اور صاحب الخیص نے بھی اسی
کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ کہا ہے کہ صحیح قول کے مطابق ۸ھ ہی میں حج فرض ہوا، ”قسطالمنی“ ”المواب“ میں
فرماتے ہیں: ”جمہور کا قول یہ ہے کہ حج ۸ھ میں فرض ہوا کیونکہ آیت ”وَاتِمُوا الْحَجَّ“ اسی سال نازل ہوئی۔ اس کے
علاوہ دوسرے اقوال بھی انہوں نے ذکر کئے ہیں۔ شافعی میں سے صاحب الروضہ نے بھی ۸ھ کا قول جمہور
کی طرف منسوب کیا ہے۔ شافعی نے ۹ھ پر جزم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو شخص اس سے قبل کا دعویٰ کرے اس
کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ قاضی عیاض نے بھی۔ جیسا کہ عطاوی میں ہے۔ اسی کو صحیح کہا ہے۔ ابن عابدین فرماتے
ہیں کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سال حج نہ کرنے میں کئی احتمال ہو سکتے ہیں۔ اور انہوں نے اس احتمال
کو ترجیح دی ہے کہ شاید وقت حج گزرنے کے بعد حج فرض ہوا ہوگا۔ لیکن مظاہر حق میں ہے کہ ”آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم نے پہلے سال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور دوسرے سال خود بنفس نفیس تشریف
لے گئے۔“ مگر شیخ ابن قیم نے حضرت ابوبکر کے بھیجے جانے کو حج کے لئے نہیں بلکہ اطلاع و اعلان کے لئے بتلایا ہے۔
کہ ”اٹھ سال کوئی مشرک حج کو نہ آئے۔ اور کوئی شخص برہنہ طواف نہ کرے (الخ)“

(حق) اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ حج کا اعلان فرمایا تو لوگوں کو عام اطلاع فرمائی کہ آپ حج پر جا رہے ہیں

فتجهزوا للخروج معه وسمع بذلك من حول المدينة فقد موأيريدون الحبح مع رسول الله صلى الله عليه وسلم رقلت، ومع صلى الله عليه وسلم نساء ووافاة في الطريق خلائق لا يحصون - فكانوا من بين يديه ومن خلفه وعن يمينه وعن شماله مد البصر.

ترجمہ: چنانچہ لوگوں نے آپ کے ساتھ حج کو جانے کی تیاری کی اور مدینہ کے گرد و پیش کے لوگوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے ارادے سے جمع ہو گئے (نش) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ازدواج مطہرات بھی تھیں۔ اور بے شمار مخلوق آپ سے راستے میں اکڑتی رہی۔ چنانچہ آپ کے آگے پیچھے دائیں بائیں حد نظر تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے

۔۔۔۔۔ اور آپ نے اس وقت ان کو یہ نہیں بتایا تھا کہ رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے، جیسا کہ ابن جریم کو وہم ہوا ہے۔ ابن قیم فرماتے ہیں: یہ کھلا وہم ہے، کیونکہ یہ بات آپ نے حج سے مدینہ طیبہ واپس آکر ارشاد فرمائی تھی: ”اور یہی صحیح ہے۔ جیسا کہ اس سلسلہ میں متعدد روایات ام سنان وغیرہ کے قصہ میں وارد ہیں جیسا کہ رسالہ کے آخر میں آئے گا۔“

”ان دنوں مدینہ شریف میں چیچک یا گرمی دانوں کے مرض کی وجہ سے بہت سے لوگ حج کیلئے نہیں جاسکے تھے اس لحاظ کی وجوہی کی خاطر، آپ نے فرمایا کہ ”رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے“ یہ بات ابن عربی نے ”المحاضر“ میں کہی ہے۔ اور ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ یہ وہم ہے۔ کیونکہ آپ نے یہ ارشاد حج سے واپسی پر فرمایا تھا کہ ”رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے“

شکر کا لئے حجتہ الوداع کی تعداد | چنانچہ لوگوں نے آپ کے ساتھ حج کی تیاری کی۔ اور مدینہ کے گرد و پیش کے لوگوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے ارادے سے جمع ہو گئے (نش) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ازدواج مطہرات بھی تھیں۔ جو کبادوں میں سوار تھیں۔ جیسا کہ طبقات میں ہے۔ اور بے شمار مخلوق آپ سے راستے میں اکڑتی رہی۔ امام نسائی نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں میں حج کا اعلان کیا تو کوئی ایسا شخص باقی نہ رہا جو سوار یا پیدل آنے کی قدرت رکھتا ہو اور نہ آیا ہو اور نہ چنانچہ آپ کے پیچھے دائیں بائیں حد نظر تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ شرح سفر السعاده میں بھی اسی طرح

وخرج من المدينة نهائاً

اور آپ دن کے وقت

ہے۔ ان کی تعداد میں اختلاف ہے حاشیہ مشکوٰۃ میں "لغات" سے نقل کیا ہے۔ کہ بعض روایات میں ہے کہ ان کی تعداد حساب و شمار سے زیادہ تھی۔ اور ان کی تعداد معین نہیں ہو سکی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری غزوہ "غزوہ تبوک" کے شرکار کی تعداد ایک لاکھ کو پہنچی تھی۔ حجۃ الوداع کا سفر اس کے بعد بولایقیناً اس سفر میں مزید تعداد کا اضافہ ہوا ہوگا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبہ ہزار افراد تھے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے۔ واللہ اعلم۔ ملا علی قاری نے اس پر اضافہ کیا ہے کہ ایک قول کے مطابق ایک لاکھ تیس ہزار تھے۔ اور وجہ میں اسی طرح ہے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز سفر سے پہلے مواقیت کی تعلیم فرمائی۔ چنانچہ ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خطبہ دیا، اس میں فرمایا کہ ہم اہل مدینہ ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں گے الخ اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے مسجد میں کھڑے ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ آپ ہیں کہاں سے احرام باندھنے کا حکم فرماتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اہل مدینہ ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں گے۔

اور آپ نے ابودجانہ کو اور بقول بعض سابع بن عرفطہ

مدینہ سے روانگی کی تاریخ، دن اور وقت کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا جیسا کہ سیرت ابن ہشام اور

الہدایہ والنبایہ میں ہے۔ اور خود دن کے وقت الشجرہ کے راستے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ جیسا کہ "الخمیس" اور

"محاضرة الابرار" میں ہے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری میں باب باندھا ہے "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

براہ شجرہ بکنے کا بیان" اور اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ذکر کی ہے حموی "معجم البلدان"

میں لکھتے ہیں: "الشجرہ ذوالحلیفہ میں وہی درخت ہے جہاں رحلت ابو بکر کی ہوئی" حضرت اسماء رضی

اللہ عنہا کے بطن سے محمد بن ابی بکر کی ولادت ہوئی۔ یہ بھول کا درخت تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول

تھا کہ وہاں نزل فرماتے اور وہاں سے احرام باندھتے تھے۔ یہ مدینہ سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اور

"بذل الجہود" میں ہے: "یہ درخت ذوالحلیفہ میں مدینہ سے چھ میل کے فاصلے پر ہے الخ" اور "الخمیس" میں ہے کہ یہ

مدینہ سے چھ میل ہے بقول بعض چار میل اور بقول بعض سات میل

بعد الظهر لخمس یقین من ذی القعدة یوم السبت۔
ظہر کے بعد ۲۰ ذی القعدة کو بروز شنبہ مدینہ سے روانہ ہوئے۔

واضح رہے کہ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ جانے کے چار راستے مشہور ہیں۔
مدینہ سے مکہ جانے کے راستے | جن کی تفصیل میرے رسالہ ”جزء طرق المدینہ“ میں ہے۔ اور اس کا کچھ حصہ
”لامع الدراری“ کے حاشیہ میں: ”باب المساجد التي علی طرق المدینہ“ کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔ اول طریق سلطانی
دوم الفار، سیم الفرعی، چہارم الشرقی۔ طریق سلطانی یہی طریق الشجرہ ہے۔ میں جب پہلی بار ۱۳۳۸ھ میں
مدینہ حاضر ہوا تھا تو طریق الفار سے حاضر ہوا تھا۔ اور حاشیہ ”لامع“ میں ”مرآة الحریین“ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی تو یہی راستہ اختیار فرمایا تھا۔

ظہر کے بعد ۲۴ ذی القعدة کو بروز پنجشنبہ مدینہ سے روانگی ہوئی۔ یہ ابن حزم اور ابن عربی کا قول ہے۔
اور حافظ عینی نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔ اور یہی مشہور ہے۔ مگر ابن القیم کے نزدیک
راجح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۲۵ ذی القعدة کو بروز شنبہ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اور شیخ ابن قیم نے ابن خزم
کے قول کو وہم قرار دیتے ہوئے اس پر طویل بحث کی ہے۔ اور ابن خزم کے قول کی توجیہ دی ہے جو صاحب
البدایہ والنہایہ نے ذکر کی ہے۔ ابن قیم کا قول میرے نزدیک راجح ہے۔ کیونکہ مکہ مدینہ کی درمیانی منزلیں اس
واقعہ میں، نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث المساجد میں کل آٹھ ہیں، یہ حدیث امام بخاری نے روایت
کی ہے اور اس میں مکہ و مدینہ کی درمیانی مساجد کو شمار کیا گیا ہے۔ پس ظاہر یہ ہے کہ روانگی ۲۵ ذی القعدة
کو بروز شنبہ ہوئی۔ یہ مہینہ ۲۹ دن کا تھا اور ذوالحجہ کی پہلی تاریخ بالاتفاق پنجشنبہ کو تھی۔ اور آپ کا
مکہ مکرمہ پہنچنا بھی بالاتفاق ۴ ذوالحجہ کو بروز یکشنبہ ہوا۔ اور البدایہ والنہایہ میں بروایت بخاری ۵
ذوالحجہ کا جو لفظ ہے یہ کتابت کی غلطی ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں بخاری کے الفاظ یہ ہیں، پس آپ ذوالحجہ کی
چاندرا تیں گزرنے پر مکہ مکرمہ تشریف لائے۔ اس تقریر سے تمام روایات جمع ہو جاتی ہیں صاحب النہیں
نے: ”نیز حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں زرقانی نے شرح موطائیں، ملا علی قاری نے ترقاة میں اور قسطلانی اور
صاحب البدایہ والنہایہ نے بھی اسی کو راجح کہا ہے۔ اور ابن ہشام نے صرف اسی کو ذکر کیا ہے لیکن حافظ
عینی نے اس کو رد کیا ہے انہوں نے اس کو ترجیح دی ہے کہ آپ کی روانگی ۲۴ ذی القعدة پنجشنبہ کو ہوئی تھی اور
صاحب سفر السعاده کا میلان بھی اسی طرف ہے، اس کی تائید حضرت ابن عمر کے اس قول سے ہوتی ہے

فصلی الظهر بالمدينة اربعاً وخطبهم قبل ذالك خطبة .

ثم ترجل وادّهن وارتدى ثم ارتحل . واثاثة ابودى العقيق .

توجہ۔ پس مدینہ شریف میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں اور اس سے پہلے ایک خطبہ دیا۔

پھر سر میں کنگھی کی تیل لگایا، چادریں زیب تن کیں۔ پھر سفر کا آغاز فرمایا۔ اور وادی عقیق میں آپ کے پاس ایک آنے والا فرشتہ آیا۔

جو حافظہ عینی نے بسند و اقدی نقل کیا ہے کہ ذوالحجہ کا چاند پنجشنبہ کو دہانگی سے اٹھوئیں دن ہوا۔ تفصیل کے لئے عمدۃ القاری ملاحظہ فرمائیں۔

پس مدینہ شریف میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں۔ اور اس سے پہلے ایک خطبہ دیا۔ جس میں لوگوں کو احرام کا طریقہ اور اس کے سنن و واجبات کی تعلیم دی۔ ابن قیس نے طبری کے اس قول کو دسم قرار دیا ہے کہ آپ جمعہ کے بعد نکلے کیونکہ بہت سی روایات میں یہ تصریح موجود ہے کہ آپ نے مدینہ شریف میں ظہر کی چار رکعتیں ادا فرمائیں اور ذوالحلیفہ پہنچ کر دو رکعت نماز عصر ادا فرمائی، پھر سر میں کنگھی کی تیل لگایا۔ چادریں زیب تن کیں پھر سفر کا آغاز فرمایا۔

اور وادی عقیق میں آپ کے پاس ایک اینیوالا فرشتہ آیا۔

وادی عقیق میں فرشتے کی آمد [عقیق: بفتح اول، وکسر ثانی۔ ووقف اور ان کے درمیان جیسا

کہ معجم البلدان میں ہے] اور اس آنے والے فرشتے نے عرض کیا: کہیئے: ”عمرہ حج میں“ اور بخاری کے الفاظ یہ

ہیں: ”آج رات میرے پاس ایک اینیوالا میرے رب کی جانب سے آیا۔ اس نے کہا: کہیئے: ”عمرہ حج میں“ اور

البدایہ والنہایہ میں ہے کہ ذوالحلیفہ ہی وادی عقیق ہے۔ ”صاحب معجم نے“ عقیق“ پر مبسوط کلام کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ”عقیق چار ہیں۔ یہ دراصل وہ قدیم وادیاں ہیں جو سیلابوں کی وجہ سے بن گئی تھیں۔ منجملہ ان کے

ایک عقیق وہ ہے جس کے بارے میں یہ حدیث آئی ہے: ”بے شک آپ وادی مبارک میں ہیں۔“ اور یہ وہی ہے

جو وادی ذوالحلیفہ کے اندر ہے۔“ قاضی عیاض فرماتے ہیں: ”العقیق وہ وادی ہے جہاں اہل مدینہ کے

موشی رہا کرتے تھے۔ اور یہ مدینہ سے دو تین میل پر اور بقول بعض چھ یا سات میل پر ہے۔ یہ عقیق اصغر

کہلاتا ہے۔ اور یہیں بئر رومہ ہے۔ اس سے آگے عقیق اکبر ہے اور اس میں بئر عروہ ہے۔ اور اس کے

علاوہ ایک وادی عقیق اور ہے جو ان دونوں سے بڑی ہے۔ اس میں بئر علی ہے۔ پوری تفصیل معجم البلدان

وصلی العصر بذی الحلیفہ رکعتیں، و بات بہا، و طاف علی النساء کلہا، و اغتسل
للاحرام غیر غسل المجنابۃ

توجہ ماورزی الحلیفہ میں آپؐ نے عصر کی دو رکعتیں پڑھیں، اور رات کو وہیں قیام کیا، اور آپؐ
اپنی تمام ازواج سے فارغ ہوئے اور غسل جنابت کے علاوہ احرام کے لئے الگ غسل فرمایا۔

میں ہے۔ اور اسی میں ابو منصور کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ پانی کی ہر ایسی گزرگاہ جو سیلابوں کی وجہ سے زمین
میں کشادہ نہر جیسی بن گئی ہو عرب اسے عقیق کہتے ہیں، آپؐ کے پاس وحی آئی کہ احرام میں آپؐ کو کس چیز پر اعتماد
کرنا ہے یعنی اقسام حج میں کس قسم کا احرام باندھنا ہے، اور ایک روایت میں ہے جیسا کہ کنز العمال میں ہے
کہ ذیقعدہ کے تین دن رہتے تھے کہ میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا کہ قیامت تک کے لئے عمرہ حج میں
داخل ہو گیا۔ اور آپؐ نے ذوالحلیفہ میں جو دینہ سے چھ میل اور ایک قول کے مطابق چار یا سات میل ہے جیسا کہ
انجیس اور شرح سفر السعاده میں ہے۔ عزیز محمد راج مذہبی نے ایک حلیہ میں
”حریم و حجاز کے مشہور مقامات پر ایک مقالہ ۳۸۹ھ میں پڑھا تھا۔ اس میں موصوف نے بتایا ہے کہ ذوالحلیفہ
کو آج کل ایسا رعلی کہا جاتا ہے۔ اور یہ مدینہ شریف سے ۹ کلومیٹر ہے۔ عصر کی دو رکعتیں پڑھیں اور پھر رات کو
وہیں قیام کیا۔ اور آپؐ اس رات اپنی تمام ازواج مطہرات کے پاس سے فارغ ہوئے۔ جیسا کہ شرح سفر السعاده
اور المحاضرہ میں ہے اور امام مسلم نے اسے کئی سندوں سے روایت کیا ہے۔ تمام ازواج مطہرات اس سفر
میں آپؐ کے ساتھ تھیں۔

اور غسل جنابت کے علاوہ احرام کیلئے الگ غسل فرمایا۔ شرح سفر السعاده فرماتے
غسل احرام اور اس کا حکم ہیں: صبح کو غسل جنابت کیا اور ظہر کے بعد احرام کیلئے غسل کیا، و دریر کی شرح کبیر
میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ہی غسل کر لیا تھا۔ جب ذوالحلیفہ پہنچے تو دو گنا احرام ادا کر کے
احرام باندھ لیا۔ یہ معروف روایات کے خلاف ہے۔ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ ابن حزم نے غسل جنابت کے علاوہ
دوسرے غسل کا تذکرہ نہیں کیا۔ المحاضرہ سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے غسل جنابت کے علاوہ
اور کوئی غسل نہیں کیا تھا۔ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: بعض نے اس غسل کو ذکر نہیں کیا۔ یا تو بھول گئے، یا اس وجہ سے
کہ ان کے نزدیک یہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا ہوگا۔ یہ غسل شافعیہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے جیسا کہ شرح مبذ

لے پہلے لکھا ہے کہ آپؐ ۵ ماہی ۷ ذی قعدہ کو ہوئی تھی۔ مگر اسے اشکال کی کوئی بات نہیں کیونکہ اوایل کی گنجائش ہے شیخ مظہر،

ثم طيبته عائشة بيدها بذريزة وطيب - ولم يغسله بعد
مجموعہ: پھر حضرت عائشہؓ نے اپنے ہاتھ سے آپؐ کے ذریعہ اور خوشبو لگائی۔ اور بعد میں آپؐ نے

اسے دھویا نہیں۔
میں ہے۔ اور مالکیہ و حنفیہ کے نزدیک بھی، جیسا کہ اوپر میں ہے اور اسی میں ہے کہ ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ جو شخص احرام کا ارادہ کرے۔ اکثر اہل علم کے نزدیک اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ پہلے غسل کرے اہل ظاہر نے اس غسل کو واجب کہا ہے۔ جیسا کہ اوپر میں ہے۔

پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ہاتھ سے آپؐ کے سر اور بدن پر ذریعہ
احرام کیلئے خوشبو لگانا
نامی خوشبو لگائی، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ذریعہ بر وزن عظیمہ ذال مجہد اور وراؤں
کے ساتھ خوشبو کی ایک خاص قسم ہے۔ جو اہل حجاز وغیرہ کے یہاں معروف ہے۔ امام نوویؒ اور ان کے علاوہ
بہت سے حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ ایک خوشبودار حرمی بوٹی کا برادہ ہے۔ جو ہندوستان سے آتی ہے۔ "صاحب
تحیظ اعظم" نے قصب الذریرہ کے اقسام کو تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندی میں اسے جزائرتہ کہتے
ہیں۔ اور اس کا برادہ خوشبودار ہوتا ہے۔ اور زیر بغل لگانا آپسینہ کی خوشبو کے لئے مفید ہے۔ اور ایسی خوشبو
جس میں مشک ملا ہوا تھا، لگائی۔ حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگ اور ریش مبارک میں مشک
کی چمک نظر آتی تھی۔ اور بعد میں آپؐ نے اسے دھویا نہیں مسلم شریف کی ایک حدیث سے غسل سے
پہلے خوشبو لگانا مفہوم ہوتا ہے۔ اس سے قاضی عیاض کو یہ دہم ہوا ہے کہ آپؐ نے خوشبو لگا کر اسے دھویا
تھا۔ حالانکہ تکرار اور تعدد سے کوئی چیز مانع نہیں یعنی اس کی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ غسل سے پہلے بھی
خوشبو لگائی گئی اور بعد میں بھی (دش) قاضی عیاض کو تاویل کی ضرورت اس واسطے ہوئی کہ وہ مالکی مذہب
کے ہیں، اسی بنا پر آتی ہے بھی شرح مسلم میں اس کی متعدد توجیہات کی ہیں لیکن احرام کے بعد آپؐ کی ناہیہ
مبارک میں مشک کے چمکنے کی احادیث جنہیں صاحب البدایہ والنہایہ نے ذکر کیا ہے، ان توجیہات کی نفی
کہہ تی ہیں۔ ہدایہ میں ہے "اور خوشبو لگائے اگر اس کے پاس موجود ہو، امام محمد کے نزدیک ایسی خوشبو لگانا مکروہ
ہے جو احرام کے بعد بھی باقی رہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ ہمسائے مشہور مذہب کی
دلیل حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خوشبو لگایا کرتی تھی۔ الحدیث، اور جو خوشبو
احرام کے بعد باقی رہے وہ اتصال کی وجہ سے گویا محرم کے تابع ہے۔ بخلاف کپڑے کے کہ محرم سے جدا ہوتا

لے جیسا کہ انہوں نے مؤطا میں فرمایا ہے شیخ مظہر۔

ثم لبس ازاره و سداثة - فصلی الظہور کعتین

ترجمہ: پھر آپ نے احرام کی دو چادریں زیب تن کیں۔ پھر دو گانہ ظہر ادا کیا

ہے۔ مختصراً ابن عابدین کہتے ہیں: (محرّم) اپنے بدن کو خوشبو لگائے خواہ ایسی خوشبو ہو جو باقی ہے۔ مگر کپڑے کو ایسی خوشبو نہیں لگا سکتا۔ جس کا جسم باقی ہے۔ یہی صحیح تر ہے۔ "تسطلانی" الموابب" میں فرماتے ہیں۔ کہ امام شافعی و احمد، امام ابو حنیفہ کے ساتھ ہیں۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ میں اس کو پسند نہیں کرتا۔" شرح سفر میں بھی یہی لکھا ہے۔

میں کہتا ہوں: "مسئلہ خوشبو میں ائمہ کا مسلک بیان کرنے میں ناقلین کا اختلاف ہے! صحیح وہ ہے جو اور جز میں مذاہب اربعہ کی فقہی کتابوں سے نقل کیا ہے اور اس کا خلاصہ حاشیہ لامع میں یہ ہے کہ "محرم کیلئے ایسی خوشبو لگانا جس کا جسم باقی ہے امام مالک اور امام محمد کے نزدیک مطلقاً ممنوع ہے، خواہ بدن پر ہو یا کپڑے پر۔ اور امام شافعی و احمد کے نزدیک مطلقاً مباح ہے خواہ بدن پر ہو یا کپڑے پر۔ اور امام ابو حنیفہ و ابو یوسف کے نزدیک بدن پر مباح ہے اور کپڑے پر مباح نہیں۔" ائمہ کے مذاہب میں بھی تفصیل صحیح ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "حدیث یعلیٰ سے استدلال کیا گیا ہے کہ احرام کے بعد خوشبو کا باقی رہنا ممنوع ہے، جمہور کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ حدیث یعلیٰ کا واقعہ جعزانہ کا ہے، جو بالاتفاق صحیح میں ہوا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ صحیح حدیث کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کے وقت خوشبو لگائی تھی۔ بالاتفاق صحیح کا واقعہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے آخری عمل ہی کو لیا جاتا ہے۔"

پھر آپ نے احرام کی دو چادریں زیب تن کیں و قالوا: "تیس" ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ سے غسل فرما کر اور چادریں پہن کر نکلتے تھے۔ اور صحیح بخاری کے لفظ بروایت ابن عباس یہ ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیل لگا کر گنگھی کر کے اور دو چادریں پہن کر مدینہ سے چلے۔" پھر دو گانہ ظہر ادا کیا، جیسا کہ مسلم و نسائی کی روایت میں تصریح ہے اور بخاری شریف میں ہے۔ کہ آپ نے صبح کی نماز پڑھی پھر سوار ہوئے: بخاری و مسلم کی روایت میں تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ بخاری کی روایت میں "ثم" کا لفظ تراخی بعد کیلئے ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ دو رکعتیں فرض ظہر کی تھیں۔ یا دو گانہ احرام کی؟ پوری بحث دو گانہ احرام کا حکم

۱۰ اجزاء "تیس" صلی بنی الحلیفہ و کعتین کے ذیل میں مذکور ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۰ اجزاء حضرت شیخ مذللہ کی ایک مستقل تالیف ہے، جو متنویر مطبوع ہے۔ مترجم

ثم اهل بالحج والعمرة -

ترجمہ: پھر حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھ کر تلبیہ پڑھا۔

یہ دو رکعتیں دو گانہ احرام تھیں۔ ان میں سورۃ کافرون اور سورۃ اخلاص پڑھی جاتی ہے۔ جیسا کہ قرأت میں ہے۔ نووی فرماتے ہیں: "اس حدیث سے احرام کے وقت دو رکعتیں پڑھنے کا استحباب معلوم ہوا مگر دو رکعتیں احرام سے قبل پڑھی جاتی ہیں۔ اور یہ ہمارے اور تمام علماء کے مذہب میں نفل ہیں۔ البتہ قاضی وغیرہ نے حسن بصری سے ان کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ ان دونوں کا فرض نماز کے بعد ہونا مستحب ہے۔ کیونکہ مروی ہے کہ یہ دو رکعتیں نماز فجر کی تھیں۔ صحیح وہی ہے جو جمہور کا قول ہے اور یہی حدیث کا مفہوم بھی ہے۔" ابن قیم فرماتے ہیں: "یہ کہیں منقول نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض ظہر کے علاوہ دو گانہ احرام بھی ادا فرمایا تھا۔" پوری تفصیل اجزاء میں ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ "اور دو رکعتیں پڑھے۔ کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنی طویل حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دو رکعتیں پڑھنا روایت کیا ہے۔" لیکن مجھے نفل نماز کا ذکر مراد کہیں نہیں ملا۔ اوجز میں بہت ہی سبب و تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ظہر سے ذرا پہلے احرام باندھا تھا لہذا ابن قیم نے اس کی تردید کی ہے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔

پھر جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذوالحلیفہ کے یک روزہ قیام میں تلبیہ کے حکم میں اختلاف | پانچ نمازیں پڑھ چکے تو حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھ کر تلبیہ پڑھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ تلبیہ واجب ہے یا سنت یا رکن؟ اس کی تفصیل اوجز میں ہے جس کا خلاصہ حاشیہ لامع میں یہ ہے کہ: — حافظہ کے قول کے مطابق تلبیہ میں دس مذہب ہیں۔ ان میں سے معروف مذہب چار ہیں۔ اول یہ کہ تلبیہ سنت ہے۔ اس کے ترک سے کچھ واجب نہیں ہوتا۔ یہ امام شافعی و احمد کا قول ہے۔ دوم یہ کہ واجب ہے اور اس کے ترک پر دم واجب ہوگا۔ یہ مالکیہ کے اصحاب الفروع کا مختار قول ہے۔ اور بعض شافعیہ سے بھی منقول ہے۔ سوم یہ کہ واجب ہے مگر افعال حج میں سے کوئی فعل مثلاً راستے کی طرف متوجہ ہو جانا اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ مالکیہ میں سے ابن شاش نے اپنا کلام اس سے شروع کیا ہے۔ اور حنفیہ میں سے صاحب ہدایہ نے اس کی مثل نقل کر کے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ کوئی دوسرا ذکر سنی بھی تلبیہ کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔ چہاں یہ کہ رکن ہے اور یہ اہل ظاہر و غیرہ کا مذہب ہے۔

علہ نووی کی اصل عبارت اسی طرح ہے۔ بظاہر اس کے پہلے یہ لفظ ہونا چاہیے "اسکا یعنی احرام کا فرض نماز کے بعد ہونا، تاکہ استدلال صحیح ہو شیخ غلام

فی مصلّٰہ - وقلد قبل الاحرام بد نہ

ترجمہ: اپنی نماز کی جگہ میں۔ اور احرام سے پہلے اپنی ہدی کے اونٹوں کو قلاوہ پہنایا۔

یہاں ایک اور طویل فقہی بحث ہے وہ یہ کہ کیا احرام مواقیت ہی
میقات سے پہلے احرام باندھنے کا حکم | سے باندھنا واجب ہے اور میقات سے اس کی تقدیم جائز نہیں؟

جیسا کہ اہل ظاہر کا مذہب ہے۔ یا تقدیم بھی جائز ہے؟ جیسا کہ ائمہ اربعہ کا مذہب ہے؟ پھر ائمہ اربعہ کا اس امر میں اختلاف ہے کہ میقات سے پہلے احرام باندھنا افضل ہے یا میقات سے ہمام مالک و احمد فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں مواقیت ہی سے احرام باندھنا افضل ہے۔ اور امام ابو حنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل امت کی آسانی کیلئے تھا، مگر ان احادیث قولیہ کی بنیاد پر جو اوجہ میں ذکر کی ہیں۔ تقدیم مستحب ہے۔ امام ابو داؤد نے حضرت ابو امامہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ: ”جو شخص اپنے گھر سے پاک ہو کر وضو یا غسل کر کے فرض نماز کے لئے نکلا اس کا ثواب ایسا ہے جیسے کوئی (گھر سے) احرام باندھ کر عمرہ کیلئے جائے الخ“ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احرام کی تقدیم افضل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جگہ تلبیہ شروع کیا | اپنی نماز گاہ میں ہی آپؐ نے تلبیہ پڑھنا شروع کیا، اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں: کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جگہ سے احرام باندھا؟ تعلیق متقدم ہے کہ اس بارے میں تین روایتیں وارد ہیں: ۱۔ نماز کی جگہ سے ۲۔ جب سوار ہوئے ۳۔ جب بیدار کی بلندی پر چڑھے۔ ان روایات کے درمیان تطبیق ابن عباسؓ کی روایت میں آگے آرہی ہے۔ امام احمد کے نزدیک تینوں کی گنجائش ہے۔ اور ہمسائے نزدیک پہلی صورت راجح ہے۔ ابن قتیبہ کا میلان بھی اسی جانب ہے۔ شافعیہ و مالکیہ کے نزدیک دوسری صورت راجح ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ”ان تینوں کے جوائز ہر جگہ کے علما متفق ہیں۔ اختلاف صرف افضلیت میں ہے۔“ صاحب البدایہ والنہایہ نے اس سلسلہ کی روایات بڑی تفصیل سے ذکر کی ہیں۔

اور احرام سے پہلے اپنی ہدی کے اونٹوں کو دم و حقول کو قلاوہ پہنایا، | ہدی کو قلاوہ پہنانے کا حکم | جیسا کہ شرح سفر اور الخاصرہ میں ہے اور صحیح مسلم اور ابو داؤد میں بھی ہے۔

اور اوجہ میں ہے کہ قلاوہ پہنانا بالاجماع سنت ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ ایک جوتے کا ہو یا دو کا؟ ابن رشد کہتے ہیں: ہدی، اونٹ یا گائے کی ہو تو اس میں اختلاف نہیں کہ ان کو قلاوہ پہنایا جائے البتہ بکری کو قلاوہ پہنانے میں اختلاف ہے۔ امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ نہ پہنایا جائے، اور امام

واشعرھا

توجہ: اودان کا اشعار کیا۔

شافعیؒ احمداور داؤد ظاہری کہتے ہیں کہ پہنایا جائے "مختصر"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی کے اونٹوں کی نگہداشت پر حضرت ناجیہؓ مقرر تھے۔ جیسا کہ طبقات میں ہے۔ اور زبلی نے واقدی کی مغازی سے بھی نقل کیا ہے۔ اور ذکر کیا گیا ہے کہ عمرہ حدیبیہ اور عمرہ القضاء میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدایا پر حضرت ناجیہ رضی اللہ عنہ ہی مقرر تھے۔ جیسا کہ انجیس میں ہے۔

اودائیں یا بائیں جانب میں ان کا اشعار کیا۔ اس سلسلہ میں روایات و مذاہب ہدی کے اشعار کا حکم مختلف ہیں کہ اشعار دائیں جانب کیا یا بائیں جانب؟ جیسا کہ آگے مفصل آتا ہے۔ رشتہ مسئلہ اشعار مشہور اختلافی مسئلہ ہے، جو اوجز میں اس تفصیل سے مذکور ہے کہ اشعار میں تین بحثیں ہیں۔ اس کی تشریح اس کا حکم مگر کن جانوروں کا اشعار کیا جائے؟..... پہلی بحث ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کی دوسری بحث تو اس کے حکم میں اختلاف ہے، جمہور علماء بشمول ائمہ ثلاثہ اس کو سنت کہتے ہیں، امام ابو یوسف اور امام احمد فرماتے ہیں یہ بہتر ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ان کے نزدیک سنت ہے۔ جیسا کہ بدائع میں ہے۔ اود ہدایہ میں ہے کہ "اشعار امام ابو حنیفہ کے نزدیک مکروہ"۔

صاحبین کے نزدیک افضل اور امام شافعی کے نزدیک سنت ہے۔ امام شافعی کی دلیل یہ ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین سے مروی ہے۔ صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ قلاوہ پہنانے سے مقصود یہ ہے کہ اگر ہدی کا جانور گھاس پانی پر چلے تو اس سے تعرض نہ کیا جائے اور اگر گم ہو جائے تو واپس کر دیا جائے۔ اور یہ مقصود اشعار سے بدرجہ اتم حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ قلاوہ کی نسبت زیادہ لازم ہے۔ اس اعتبار سے یہ سنت ہے۔ مگر اس کے معارض اشعار میں شکل بگاڑنے (مثلاً) کی جہت بھی ہے اس بنا پر ہم اسے حسن کہتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ یہ مثلاً ہے جو ممنوع ہے اور جب جواز و عدم جواز میں تعارض ہو جائے تو عدم جواز کو ترجیح دی جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اشعار کرنا ہدی کے جانوروں کی حفاظت کی غرض سے تھا۔ کیونکہ مشرکین اس کے بغیر تعرض سے باز نہیں آتے تھے۔ اور کہا گیا ہے کہ امام صاحب نے اشعار کو مطلقاً مکروہ نہیں کہا۔ بلکہ اپنے زمانہ کے اشعار کو مکروہ کہا ہے کیونکہ لوگ اس میں حدود سے تجاوز کرتے جاتے تھے۔ اہم پوری تفصیل اوجز میں ہے۔ اور کو کب میں مسئلہ اشعار پر مختصر مگر بہت عمدہ لکھا گیا ہے۔

وسلت عنها الدم وساق الهدايا معه

ترجمہ: اور ان سے خون صاف کیا۔ اور ہدی کے جانور اپنے ساتھ لئے۔

پھر اشعار دائیں جانب ہو یا بائیں جانب؟ اس میں روایات اور مذاہب محل اشعار میں اختلاف | میں اختلاف ہے۔ جن کی تفصیل اوپر دی ہے، ہدایہ میں بائیں جانب ترجیح دی گئی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ بائیں جانب نیزہ مارنا مقصود تھا اور دائیں جانب اتفاقاً تھا۔ شیخ ابن ہمام نے نیزہ مارے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد بہار پوری ثم ملنی نے بدل میں دونوں قسم کی روایات ذکر کی ہیں۔ اس کی پوری تفصیل الاجزہ میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس میں امام مالک سے چار روایتیں منقول ہیں، ان میں سے راجح بائیں جانب کی روایت ہے۔ در دیگر اور ان کے علاوہ عام ناقلین مذاہب نے صرف اسی کے ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے جیسا کہ المغنی میں ہے۔ ان کی دوسری مشہور روایت جو امام شافعی کا قول اور امام ابو یوسف سے ایک روایت ہے۔ جیسا کہ شرح لباب میں ہے۔ یہ ہے کہ دائیں جانب اشعار کیا جائے، باجی کہتے ہیں کہ بائیں جانب اشعار کرنا آپ کی سنت ہے، صاحبین بھی اسی کے قائل ہیں۔ جیسا کہ عینی وغیرہ میں ہے۔ اور امام محمد نے مؤطا میں اسی کو لیا ہے۔

اور ان سے خون صاف کیا۔ جیسا کہ الہدیٰ میں ہے۔ اور صحیح مسلم اور ابوداؤد وغیرہ کی متعدد روایات میں یہ مضمون وارد ہوا ہے۔ ترمذی کے الفاظ یہ ہیں: ہوا ما طعنہ الدم۔ اور اس سے خون صاف کیا۔ کو کتب میں ہے کہ اس سے مراد یہ نہیں کہ اس جگہ سے خون بالکل صاف کر دیا تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بہتے خون سے کوہن کی اس جانب کو رنگ دیا۔ اور اگر ہٹا دینے کے لفظ کے متبادر معنی لئے جائیں۔ تو اشعار کا مقصد ہی قوت ہو جاتا ہے کیونکہ اشعار کی جتنی خراش مسنون ہے۔ دیکھنے والوں کو عموماً نظر نہیں آ سکتی، بالخصوص جب کہ وہاں خون کا بھی کوئی اثر نہ ہو۔

اور ہدی کے جانور اپنے ساتھ لئے۔ ابن قیم نے ابن حزم میقات ہدی کے جانور ساتھ لے جانا | کے اس قول کو وہم قرار دیا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے جانور اپنے ساتھ لئے۔ اور یہ ہدی نفل تھی۔ یہ وہم صرف دوسرے جزی میں ہے یعنی ان کا ہدی نفل ہونا، ورنہ پہلا جزی یعنی ہدی کے جانوروں کو ساتھ لے جانا اس میں وہم نہیں، کیونکہ یہ ایک معروف

(قال) وانما قلنا انه عليه الصلوة والسلام احرم قارئاً لبضعة وعشرين حديثاً۔
ترجمہ: (ق) ایہ جو ہم نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا احرام باندھا تھا، یہ اس لئے کہ اس کی تائید میں بیس سے زائد احادیث موجود ہیں۔

حقیقت ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہدی کے جانور اپنے ساتھ لے گئے تھے۔“ اور بہت سی روایات میں اس کی تصریح آئی ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں حج کے ساتھ عمرہ کو لا کر تمتع کیا۔ اور ہدی کے جانور بھی اپنے ساتھ ذوالحلیفہ سے ہنکائے۔“ الحدیث۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے کہ ”اگر یہ صورت مجھے پہلے معلوم ہو جاتی تو بعد میں سامنے آئی تو میں ہدی کے جانور ساتھ نہ لاتا۔“ اس مضمون کی اور بھی بہت سی روایات مروی ہیں۔ ہدایہ میں ہے: ”اور ہدی کا ساتھ لے جانا افضل ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہدی کے جانور اپنے ساتھ لے گئے تھے۔“ اھ میں کہتا ہوں کہ امام بخاری نے بھی اپنی کتاب میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اس لئے کہ پہلے انہوں نے یہ باب ذکر کیا ہے ”باب من ساق الخ یعنی جو شخص قربانی کے مولیٰ اپنے ساتھ لے جائے۔“ اس کے بعد باب باندھا ہے: ”باب: من اشتد الہدی الخ یعنی جو شخص راستہ میں ہدی خریدے۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارئ تھے اسکے دلائل | (ق) ایہ جو ہم نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا احرام باندھا تھا یہ اس لئے کہ اس کی تائید میں بیس سے زائد صحیح اور صریح احادیث موجود ہیں۔ بعد ازاں شیخ ابن قیم نے ان تمام احادیث کو ذکر کر کے ان پر مفصل کلام کیا ہے، اسی طرح صاحب ”البدایہ والنہایہ“ نے بھی نہایت تفصیل سے احادیث قرآن کو جمع کیا ہے۔ اور جو روایات اس کے خلاف ہیں ان کا جواب دیا ہے۔ اسی طرح صاحب ”المحلی علی الموطا“ نے بھی احادیث قرآن کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ عینی فرماتے ہیں: ”اہم طحاوی نے دس صحابہ کرام سے قرآن کی افضلیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قارئ ہونا نقل کیا ہے۔“

حج کی تین اقسام میں سے افضل کونسی قسم ہے | مخفی نہ رہے کہ بہت سے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کو اپنے مختار مذہب پر منطبق کرتے ہیں۔ جس کی تفصیل اوپر دی گئی ہے۔ اس میں ائمہ اربعہ کے نزدیک احرام کی افضل صورت کو ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ: ”مشائخ کی زبان پر بلکہ بہت سے فقہاء اور شارحین حدیث کی تصانیف میں بھی

یہ بات مشہور ہے کہ یہ اختلاف اس اختلاف پر مبنی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کی کیا صورت تھی؟ اور بعض نے اس کے برعکس یہ کہا ہے کہ ائمہ کے نزدیک احرام کی جو افضل صورت محقق ہوئی ہے اس کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ سب کے نزدیک مطرد نہیں چنانچہ نو دئی کہتے ہیں: "باقی رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حج؟ تو اس میں اختلاف ہے کہ آپ مفرد تھے یا تمتع یا قارن؟ علماء کے یہ تین قول ہیں جو ان کے ساتھ مذاہب کے مطابق ہیں۔ ہر فریق نے اپنے مذہب کو ترجیح دیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حج ایسا ہی تھا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ آپ اولاً مفرد تھے۔ پھر عمرہ کا احرام باندھ کر قارن ہو گئے۔" اھ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ نو دئی نے مذاہب کو بیان کرتے ہوئے افضلیت افراد کو صحیح کہا ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے بیان میں وہ لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ آپ بالآخر قارن ہو گئے تھے۔ فقہ حنبلی کی کتاب "الروض الربیع" میں ہے: "امام احمد فرماتے ہیں کہ مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے۔ لیکن میں تمتع کو پسند کرتا ہوں۔" بہت سے اہل علم نے امام احمد کا یہ قول نقل کیا ہے جس کی تفصیل اوپر میں ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں: "امام احمد سے جو چیز منصوص ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے، حتیٰ کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے ذرا بھی شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے۔ اور یہی قول ائمہ حدیث مثلاً اسحاق بن راہویہ وغیرہ کا ہے۔ اور یہی صحیح ہے جس میں کسی ریب و تردد کی گنجائش نہیں اور اس بن حزم نے اپنی تالیفات میں اسی کی تقریر کی ہے" اھ۔

یہاں یہ جاننا بھی مناسب ہوگا۔ کہ ائمہ اربعہ شکر اللہ سبھم کا اس میں اختلاف ہے کہ اقسام حج میں سے افضل کون سی قسم ہے؟ حج کی تین قسمیں مشہور و معروف ہیں یعنی افراد، قرآن۔ تمتع ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ یہ تینوں صورتیں جائز ہیں۔ اور ایک چوتھی قسم ہے یعنی حج فسخ کر کے عمرہ کا احرام باندھ لینا۔ چنانچہ امام بخاری نے باب باندھا ہے تمتع، قرآن اور افراد کا بیان اور جس کے پاس ہدی نہ ہو اس کے لئے فسخ کا حکم۔ یہ آخری صورت خطابہ کے نزدیک راجح ہے۔ جیسا کہ حاشیہ لاغ میں باب من اهل فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذیل میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ لیکن اوپر میں مذاہب کے بیان میں لکھا ہے کہ امام احمد سے دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ تمتع افضل ہے، پھر افراد، پھر قرآن۔ اور دوسری یہ کہ اگر ساتھ ہدی لایا ہو تو قرآن افضل ہے ورنہ تمتع۔ اور مالکیہ کے نزدیک جیسا کہ ان کی فقہی کتابوں میں ہے۔

افراد افضل ہے پھر قرآن پھر تمتع۔ اور شافعیہ کی اس میں تین روایتیں ہیں جو نو دہائی نے ذکر کی ہیں اور کہا ہے۔ ”کی صحیح یہ ہے کہ افراد افضل ہے پھر تمتع پھر قرآن۔ ان کی عام کتب فقہ میں بھی یہی ہے۔ لیکن افراد کی افضلیت کے لئے ان کے ہاں یہ شرط ہے کہ اسی سال عمرہ بھی کرے۔ ورنہ تمتع اور قرآن افضل ہونگے۔ جیسا کہ شایع اتناغ اور شایع منہاج نے تصریح کی ہے۔ اور حنفیہ کے نزدیک مختار یہ ہے کہ قرآن افضل ہے، پھر تمتع، پھر افراد تفصیل اوجزیں ہے۔

ف
 شیخ ابن قیم لکھتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی نوعیت میں اختلاف
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی نوعیت میں اختلاف
 جماعتوں کو ہم ہوا ہے۔ پہلا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ آپ نے بغیر عمرہ کے صرف حج مفرد کیا تھا۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے اس مضمون کی روایات کو ذکر کر کے ان کے رد و اثبات میں مفصل کلام کیا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا تھا۔ یعنی عمرہ کے احرام سے فارغ ہو کر آپ نے حج کا احرام باندھا تھا۔ اس کو بھی صاحب البدایہ والنہایہ نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ قاضی ابوالعلیٰ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ اور زر قانی شرح مواہب میں بھی یہی ہے۔ تیسرا گروہ جو کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم متمتع تھے۔ قارئین نہیں تھے۔ مگر آپ نے احرام نہیں کھولا تھا۔ کیونکہ آپ اپنے ساتھ ہدی کے جانور لے کر گئے تھے۔ صاحب مغنی وغیرہ کا یہی قول ہے۔ جیسا کہ الہندی میں ہے۔ زر قانی شرح مواہب میں حافظ کی تقلید میں کہتے ہیں کہ امام طحاوی اور ابن حبان وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ چوتھا گروہ جو اس کا قائل ہے کہ آپ نے قرآن کیا تھا۔ اور دو طواف اور دو سعی کی تھیں (دش) حنفیہ اسی کے قائل ہیں۔ جیسا کہ آگے تفصیل سے آتا ہے۔ اور پانچواں گروہ جو کہتا ہے کہ آپ نے حج مفرد کیا تھا اور بعد میں تنعیم سے عمرہ کیا تھا (دش) شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں یہ قول مالکیہ شافعیہ کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ قول غلط ہے۔ قسطلانی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج و عمرہ کا قرآن کیا تھا۔ اور دونوں احرام اکٹھے کھولے تھے۔ اور دونوں کے لئے ایک طواف اور ایک سعی کی تھی۔ تاہم یہ چھٹا قول ہی شیخ ابن قیم کے نزدیک راجح ہے۔ اسی وجہ سے اسے اوصاف میں ذکر نہیں کیا گیا۔ اوساد پر گند چکا ہے کہ جو تھا قول حنفیہ کا ہے۔ ان کے قول اور شیخ ابن قیم کے نزدیک جو قول راجح ہے اس کے درمیان صرف اتنا فرق ہے کہ حنفیہ طواف و سعی کے تکرار کے قائل ہیں۔ اور مصنف ابن قیم، قائل نہیں۔

حنفیہ کے نزدیک قارن پر دو طواف اور دو سعی لازم ہیں | شیخ ابن ہمام نے فتح القدیر میں ان اقسام کو تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے

حنفیہ کے قول کو ترجیح دی ہے نیز اوجز میں حضرت عائشہؓ کی حدیث والذین جمعوا الحج والعمرة فانما طافوا طوافاً واحداً اور جن لوگوں نے حج و عمرہ کو جمع کیا انہوں نے بس ایک ہی طواف کیا، کئی فیل میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔ اور اس حدیث کا نیز اس مضمون کی دیگر احادیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ احادیث کسی کے نزدیک بھی اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہیں۔ کیونکہ تین طواف یعنی طواف تدرؤم، طواف زیارت اور طواف وداع تمام علماء کے نزدیک ثابت ہیں۔ اس لئے بس ایک ہی طواف کیا۔ کی تاویل سب کے قول پر ضروری ہے۔ اس کی متعدد تاویلات اوجز میں تفصیل سے ذکر کی ہیں، سب کے اچھی توجیہ میرے نزدیک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کے دونوں احراموں سے فارغ ہونے کیلئے ایک ہی طواف کیا، بخلاف اس کے جو کہا گیا ہے کہ دونوں احرام کھولنے کے لئے دو طواف اور دو سعییں کرے۔ اس کے بعد اوجز میں حنفیہ کے اس قول کے دلائل بیان کئے ہیں کہ قارن کے ذمہ دو طواف اور دو سعییں ہیں۔ چنانچہ علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مجاہد۔ قاضی شریح، شعبی، نخعی، اوزاعی، ثوری، ابن شبرمہ، ابن ابی سیل، ابو حنیفہ، ان کے اصحاب اور ایک جماعت، جن کے نام اوجز میں مذکور ہیں۔ اس کے قائل ہیں کہ قارن کیلئے دو طواف اور دو سعییں ضروری ہیں، اور یہی قول حضرات عمرؓ، علیؓ، ان کے صاحبزادے، حسن، حسین اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین سے منقول ہے، یہی امام احمدؒ سے بھی ایک روایت ہے۔ مجاہد نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حج و عمرہ کو جمع کیا اور ان کے لئے دو طواف اور دو سعییں کیں اور فرمایا ”میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے جس طرح میں نے کیا“ اور حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اوجز میں اس سلسلہ کی مرفوع روایات کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: امام طحاویؒ وغیرہ نے حضرت علیؓ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً اس کو روایت کیا ہے۔ اور مجموعی طور پر ان کی سندیں ”لاباس بہا“ ہیں۔ (یعنی لائق قبول ہیں)

اور ہدایہ میں ہے کہ ”امام شافعیؒ نے فرمایا: قارن ایک طواف اور ایک سعی کرے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”قیامت تک کیلئے عمرہ حج میں داخل ہو گیا“ اور اس وجہ سے بھی کہ قرآن کا مبنی داخل پر ہے۔ چنانچہ اس میں رجب اور عمرہ دونوں کے لئے ایک ہی تلبیہ ایک ہی سفر اور ایک ہی حلق

پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ پس اسی طرح ارکان میں بھی تداخل ہوگا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ جب صُنبی بن معبد نے دو طواف اور دو سعییں کیں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”تجھے تیرے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت کی طرف ہدایت کی گئی“ نیز اس لئے کہ قرآن ایک عبادت کو دوسری عبادت سے ملا کر ادا کرنے کا نام ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ ہر ایک عبادت کو کامل طور پر ادا کیا جائے۔ نیز اس لئے کہ عبادت مقصودہ میں تداخل نہیں ہوا کرتا۔ اور سفر بیت اللہ تک پہنچنے کے لئے اور تلبیہ احرام باندھنے کے لئے اور حلق احرام کھولنے کے لئے ہے لہذا یہ چیزیں خود مقصود نہیں۔ بخلاف ارکان کے کہ وہ خود مقصود ہیں۔ دیکھئے نقل کے ”دو گانے متداخل نہیں ہوتے مگر ایک تحریر سے ادا ہو جاتے ہیں۔ اور جو حدیث امام شافعی نے استدلال میں پیش کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عمرہ کا وقت حج کے وقت میں داخل ہو گیا۔“ اصرار میں کثیر البدایہ والنبایہ میں لکھتے ہیں کہ ”عراقین کی ایک جماعت مثلاً ابو حنیفہؒ، ان کے اصحاب اور امام ثوریؒ کا مذہب یہ ہے کہ قارن دو طواف اور دو سعییں کرے گا۔ حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ، مجاہدؓ اور شعبیؓ سے بھی یہی مروی ہے۔ یہ حضرات اپنے مسلک پر حضرت جابرؓ کی طویل حدیث سے استدلال کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ہے کہ آپؐ نے صفا و مردہ کی سعی پا پیادہ کی تھی اور اسی حدیث میں بروایت ابو الزبیر یہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا و مردہ کی سعی سواری پر کی تھی یہ اس امر کی دلیل ہے کہ سعی دو مرتبہ ہوئی۔ ایک مرتبہ پا پیادہ اور ایک مرتبہ سواری پر۔“

رق، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کی نوعیت
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام میں چھ قول | میں پانچ جماعتوں کو دوہرا ہے۔ [یہ پانچ اقوال

مع ذکر تالیف کے اور ہر میں مذکور ہیں۔ اور امر میں ہے کہ اس اختلاف مذکور کو بالاختلاف درمیان فرق ہے کہ پہلا اختلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال حج کی کیفیت میں تھا اور یہ صرف احرام کی کیفیت کے متعلق ہے [پہلی وہ جماعت جو اس کی قائل ہے کہ آپؐ نے صرف عمرہ کا تلبیہ پڑھا اور اسی پر قائم ہے۔ دوسری وہ جماعت جو کہتی ہے کہ آپؐ نے صرف حج کا تلبیہ کہا اور پھر اسی پر مستمر رہے۔ امام مالک اسی کے قائل ہیں۔ جیسا کہ البدایہ والنبایہ میں ہے۔ تیسری وہ جماعت جو کہتی ہے کہ آپؐ نے پہلے حج کا تلبیہ کہا پھر اس پر عمرہ کو داخل کر لیا۔ اس جماعت کا خیال ہے کہ یہ (عمل یعنی حج پر عمرہ کا احرام باندھنا) آنحضرتؐ کی خصوصیت تھی کسی اور کے لئے جائز نہیں، یہ قول نوویؒ نے اختیار کیا ہے۔ ان سے صاحب بقرہ بھی اس کو نقل کیا ہے۔ اور صاحب در مختار نے اس کو

ترجیح دی ہے۔ ابن منذر اور محب طبری نے بھی اسی کو راجح کہا ہے۔ عام محقق شافعیہ اور مالکیہ نے اس پر حزم کیا ہے۔ اور اسی کو قاضی عیاض نے اختیار کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ بہت سی روایات میں وارد ہے کہ آپ مفروضہ اور متع کی روایات سے مراد یہ ہے کہ آپ نے اس کا حکم فرمایا تھا۔ اور روایات قرآن میں آپ کی آخری حالت کی خبر دی گئی ہے کیونکہ آپ نے حج کے اوپر عمرہ کا احرام بھی باندھ لیا تھا یا حافظ فرماتے ہیں کہ یہی تطبیق قابل اعتماد ہے۔ پوری تفصیل اور جزئی ہے اور اسی میں یہ بھی ذکر ہے کہ ان حضرات پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ شافعیہ کے نزدیک حج پر عمرہ کا داخل کرنا ممنوع ہے جیسا کہ عینی کے حوالے سے آگے آتا ہے۔

اور جو قطعی جماعت جس نے یہ کہا کہ آپ نے اولاً عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ پھر اس پر حج کا احرام بھی باندھ لیا تھا اور قارن ہو گئے۔ امام طحاوی شرح الآثار میں اسی کی طرف مائل ہیں۔ جیسا کہ حافظ نے فتح الباری میں ان سے نقل کیا ہے، اور زیلعی میں ہے کہ صاحب تنقیح فرماتے ہیں کہ یہ قول بھی ضعیف ہے۔ اگرچہ دوسرے اقوال کی نسبت اقرب ہے۔ اور اور جزئی میں یہ قول خطابی اور ابن حبان سے نقل کیا ہے۔

۶ اور پانچویں جماعت جس نے یہ کہا ہے کہ آپ نے پہلے بلا تعین مطلق احرام باندھا تھا۔ پھر احرام کے بعد اس کی تعیین فرمائی۔ امام شافعیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ حافظ نے فتح الباری میں لکھا ہے۔ اور علامہ قسطلانیؒ مواہب میں فرماتے ہیں: آپ کے احرام میں علماء کے چھ قول ہیں۔ مذکورہ پانچ اقوال کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: چھٹا قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج و عمرہ دونوں کا احرام بیک وقت باندھا۔ ابن قیمؒ نے اس کو ادہام میں ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہی قول مختار ہے۔ ”الہدیٰ“ میں اس کو ثابت کیا ہے اور اس کے مخالف اقوال کا جواب دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ نے جب احرام باندھا تو حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھا۔ اور جب احرام کھولا تو دونوں کا بیک وقت کھولا۔ چنانچہ اس کی دلیل وہ مشہور روایات ہیں جو اس مضمون میں متواتر ہیں۔ اور اس کو اکثر علماء متفقہ جانتے ہیں ابن حزم بھی اس کی طرف مائل ہیں۔ اور باقی احادیث میں تاویل کرتے ہیں۔ جیسا کہ اور جزئی میں ہے۔ (رشد) حافظ عینیؒ فرماتے ہیں کہ اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ عمرہ پر حج کا داخل کرنا جائز ہے اور اس کے عکس میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ اور قول قدیم میں امام شافعیؒ نے اس کو جائز رکھا ہے۔ اور دیگر علماء نے اس کو ممنوع کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔ مگر

خصوصیت کا دعویٰ محتاج دلیل ہے۔

حج پر عمرہ کا اور عمرہ پر حج کا احرام باندھنا، دو حجوں کا احرام باندھنا،
حج پر عمرہ کا احرام باندھنے کا حکم | یا دو عمروں کا احرام باندھنا ان چار مسائل میں ائمہ کے اختلاف

پر اور حرم میں مفصل کلام کیا ہے۔ تفصیل کا شوق ہو تو وہاں دیکھو۔ بحث کے آخر میں لکھا ہے: "محققین
شافعیہ و مالکیہ مثلاً نووی، قاضی عیاض، اور ان کے متبعین پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ حج پر عمرہ کا داخل کرنا جب
ان کے نزدیک جائز نہیں تو انہوں نے اس قول کو کیسے رائج قرار دے دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے اولاً حج کا احرام باندھا اور اس کے بعد اس پر عمرہ داخل کر لیا الخ۔"

شیخ ابن قیمؒ نے روایات افراد کا یہ جواب دیا ہے کہ جن حضرات سے افراد
افراد و تمتع کی روایا کا ہونا کی روایات مروی ہیں ان سے قرآن کی روایات بھی مروی ہیں۔ نیز یہ روایات

افراد میں معافی کے لئے محتمل ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ نے حج مفرد کا احرام باندھا۔ دوم یہ کہ صرف حج کے
افعال ادا کئے۔ سوم یہ کہ آپؐ نے صرف ایک حج کیا، اس کے علاوہ کوئی حج نہیں کیا۔ اور عمرے چار
کئے۔ عمرہ حدیبیہؓ میں۔ عمرہ القضاءؓ میں۔ عمرہ جعرانہؓ میں اور حج کے ساتھ ساتھ
ہیں۔ اس کے بعد قرآن کی روایات کو دوسرے بلکہ پندرہ وجہ سے ترجیح دی ہے۔ میرے نزدیک
سب سے عمدہ وجہ یہ ہے کہ افراد کی روایات میں دوسرے معافی کا بھی احتمال ہے۔ مگر قرآن
کی روایات ایسی صریح ہیں کہ ان میں قرآن کے سوا کوئی دوسری تاویل نہیں ہو سکتی۔ اور اس
سے بھی عمدہ وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن ہی کا حکم
ہوا تھا۔ اس لئے آپؐ اس سے عدول نہیں کر سکتے تھے۔ علامہ قسطلانی نے مواہب میں
تمتع کی روایات کا یہ جواب دیا ہے کہ اس سے مراد تمتع لغوی ہے یعنی ایام حج میں عمرہ کا نفع
حاصل کرنا اور یہ قرآن پر بھی صادق آتا ہے (یا آپؐ کی طرف نسبت مجازی ہے جیسا
کہ رحمہ کی نسبت آپؐ کی طرف کی گئی)۔ اہم مختصراً روایات تمتع کے یہی دو جواب صاحب
سفر السعادة نے دیئے ہیں۔ اور پہلا جواب نوویؒ نے قاضی عیاضؒ سے نقل کیا ہے۔

وقال، ولبتد رسول الله صلى الله عليه وسلم رأسه

توجهہ: (رق) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر مبارک کی تلبید کی (یعنی بالوں کو چپکالیا)

(رق) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر مبارک کی تلبید کی
تلبید کا حکم اور اس کا وقت (یعنی بالوں کو چپکالیا) ”الہندی“ اور ”مرآۃ الحرمین“ میں بھی اسی طرح ہے۔

ان دونوں کتابوں کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے کہ تلبید احرام کے بعد ہوئی، میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ تلبید احرام سے پہلے تیل اور خوشبو استعمال کرتے وقت ہوئی، حافظ ابن حجر اور حافظ مینی کا میلان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ دونوں حضرات امام بخاری کے قول ”باب من اهل ملبتہ“ کے تحت لکھتے ہیں ”یعنی جس نے تلبید کی حالت میں احرام باندھا“ اور امام بخاری کا میلان بھی اسی جانب ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس باب سے پہلے ”باب الطیب عند الاحرام“ ذکر کیا ہے۔ اور اس کے بعد ”باب الابلال عند مسجد ذي الحليفة“ ذکر کیا ہے۔ اور اس سے زیادہ واضح نووی کا قول ہے۔ چنانچہ وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث: ”تلبید کی حالت میں احرام باندھتے تھے“ کے ذیل میں لکھتے ہیں: ”اس سے معلوم ہوا کہ احرام سے پہلے سر کی تلبید مستحب ہے، اور امام شافعی اور ہمارے اصحاب نے اس کی تصریح کی ہے۔“ بدل الجہود میں مجمع البحار سے نقل کیا ہے کہ تلبید کے معنی یہ ہیں کہ احرام کے وقت سر کے بالوں میں گوند جیسی کوئی چیز لگائی جائے تاکہ بال پراگندہ نہ ہوں اور اُن میں جوئیں نہ پڑیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ دیر تک احرام کی حالت میں رہنے کے باوجود محفوظ رہیں۔ اور جن میں دو جگہ تلبید اور اس کے احکام اور تعلقات پر مفصل کلام کیا ہے۔ ایک ”باب الطیب“ میں اور دوسرے ”باب التلبید“ میں۔ اس میں ہے کہ تلبید شافعیہ کے نزدیک سنت ہے، جیسا کہ تمام شراح حدیث نے نقل کیا ہے۔ اور کتب شافعیہ میں بھی اس کی تصریح ہے۔ خواہ تلبید کسی جسم والی چیز سے ہو جس سے سر ڈھک جائے۔ اور جہود نے تلبید کو مطلقاً مستحبات احرام میں شمار نہیں کیا، البتہ شیخ ابن ہمام نے رشید الدین سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس کو بہتر کہا ہے۔ اور غنیہ میں ہے کہ خطی وغیرہ کے ساتھ سر کے بالوں کو چپکالینا اچھا ہے۔ لیکن تلبید ایسی معمولی ہو کہ اس سے سر نہ ڈھک جائے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلبید کو اسی پر محمول کرنا چاہیے۔“

میرے بدل الجہود کے حاشیہ میں ہے کہ ”میں نے شافعیہ کے سوا کسی کو نہیں پایا کہ اس نے اس سئلہ میں اختلاف ائمہ پر مبسوط کلام کیا ہو، بالکی و فیلی کتابیں اس سے خاموش ہیں۔ البتہ صاحب کمال نے ذکر کیا ہے کہ

یہ سنت ہے، اور ابن قیمؒ نے ”البدعی“ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلبید کا ذکر کیا ہے مگر اس کا حکم ذکر نہیں کیا۔ اور ہمارے اخلاف نے اس کو جنایات میں ذکر کیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، صاحب منہل فرماتے ہیں: ”اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ محرم کے لئے بالوں کی تلبید مستحب ہے کیونکہ اس میں اس کے لئے آسانی ہے۔ بال پریشان نہیں ہوں گے اور دیگر تکلیفات سے محفوظ رہیں گے۔ خصوصاً جس کے احرام کی مدت لمبی ہو۔ امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب اور امام احمدؒ اس کے قائل ہیں۔ اور اسی طرح حنفیہ و مالکیہ بھی اس کے قائل ہیں جب کہ تلبید معمولی ہو جس سے سر نہ ڈھکے، لیکن ایسی زیادہ تلبید جس سے چوتھائی سر یا زیادہ ڈھک جائے وہ حرام ہے اگر اسے پورا دن یا اس سے زیادہ مدت رہنے دیا تو دم واجب ہوگا، اور ایک دن رات سے کم ہو تو اس میں صدقہ فطر کی مقدار صدقہ واجب ہوگا۔ پیر کا حکم ہے اور عورت کے لئے احرام میں سر ڈھانکنا ممنوع نہیں“۔ اھ صاحب منہل نے ائمہ اربعہ کا جو نہایت نقل کیا ہے۔ وہ مجھے ان کے فروع فقہی کتابوں میں نہیں ملے۔

حدیث تلبید اور حدیث الشعث میں تطبیق | حاجی تو وہ ہے جس کے بال بکھرے ہوئے اور بدن میلا کچلا ہو شیخ بدل میں فرماتے ہیں: ”اگر کہا جائے کہ تلبید میں بظاہر اس حدیث کی مخالفت ہے جس میں فرمایا کہ حاجی وہ ہے جس کے بال بکھرے ہوئے ہوں اور بدن میلا کچلا ہو۔ میں کہتا ہوں قطعاً کوئی محنت نہیں کیونکہ بالوں کے بکھرے ہونے سے مراد ترک زینت ہے اور تلبید زینت نہیں بلکہ بالوں کے بکھرنے سے جو اذیت ہو سکتی ہے اس کا دفع کرنا مقصود ہے“۔ اھ میں کہتا ہوں کہ امام بیہقی نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ حدیث شعث احرام کے بعد کی حالت پر محمول ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ”اس بات کا بیان کہ حاجی پر گندہ سر اور غبار آلود ہوتا ہے پس احرام کے بعد سر اور ڈاڑھی کو تیل نہ لگائے“۔ اس توجیہ کے مطابق احرام سے پہلے تلبید کرنا اس کے خلاف نہیں جیسا کہ احرام سے پہلے تیل لگانا اس کے خلاف نہیں۔ عارف گنگوہی قدس سرہ نے ”الکوہ“ میں اس پر بہت عمدہ کلام کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اشارہ کیا ہے کہ یہ حدیث جس میں حاجی کے بالوں کے بکھرنے اور بدن کے میلا کچلا ہونے کا ذکر ہے اس سے مقصود مدت احرام کا لمبا ہونا ہے، ظاہر ہے کہ احرام کی مدت جس قدر طویل ہوگی بالوں کے بکھرنے اور بدن کے میل کچیل کی مدت بھی اتنی لمبی ہوگی۔ اور یہ دونوں چیزیں جس قدر زیادہ ہوں گی اسی قدر ثواب میں اضافہ ہوگا۔

بالغسل ماہل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمصلاہ ثم لما ركب علی ناقته
توجہ بغسل کے ساتھ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز کی جگہ تلبیہ پڑھا پھر جب
اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے۔

راپ نے غسل کے ساتھ تلبیہ کی تھی، غسل، بکسرین و سکون سین، خطمی وغیرہ جس سے مرد و عورت
بالوں کو چپکا لیا جائے تاکہ کھلنے سے محفوظ رہیں۔ ایک روایت میں "العسل" عین اور سین کے
ساتھ بھی مروی ہے۔ جیسا کہ ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے۔ نیز حافظ ابن حجر اور حافظ عینی
نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ حافظ عینی نے ابن الصلاح سے نقل کیا ہے کہ روایت میں جملہ کے
ساتھ ضبط نہیں کی گئی۔ سفر السعاده کی شرح میں ہے کہ یہ تصحیف ہے اور نہایت بعید ہے اور
اگر یہ صحیح ہو تو اس کو عطف کے گوید پر محمول کیا جائے گا، تفصیل بدل میں ہے۔ شیخ قدس سرہ نقل
میں فرماتے ہیں کہ "سر میں شہد غسل، لنگا تا بعید بات ہے، خصوصاً حضرت ایدالا نبیاء والمرسلین
صلی اللہ علیہ وسلم تو لطافت و حفاظت میں تمام انسانوں کے امام تھے، آپ کے حق میں تو اس کا تصور
بھی نہیں کیا جاسکتا۔" الخ

ادجیز میں ہے کہ تلبیہ میں اگر خشو نہ ہو تو اس سے حنفیہ کے نزدیک ایک دم واجب ہوتا ہے۔
اد جب اس میں خوشبو بھی ہو تو دو دم واجب ہوں گے۔ ملا علی قاری نے اس حدیث کا یہ جواب
دیا کہ حدیث تلبیہ لغوی پر محمول ہے یعنی بالوں کا مینا اور جمع کرنا۔ نیز وہ فرماتے ہیں: کثرت الماء
کو کوئی غدر ہوگا۔ اور یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کے ساتھ تلبیہ کیا، ان کے خیال میں ملا علی قاری کہتے ہیں
کہ: "اس میں اس امر پر کوئی دلالت نہیں کہ یہ تلبیہ احرام سے پہلے کی تھی" یعنی حدیث غسل میں احرام یا
حج کا ذکر نہیں۔ اور مقدسی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو ایسی مناسب
تلبیہ پر محمول کرنا چاہیے جس سے سر نہیں ڈھکتا۔ کنانی الثامی

رق، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس وقت احرام باندھا نماز کی جگہ تلبیہ پڑھا یعنی نماز کے بعد جیسا کہ اس سے
پہلے مفصل گذر چکا ہے۔ پھر جب اپنی ناقہ قصوا پر سوار ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بترا کی یہ روایت کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے مدینہ سے مکہ تک پیدل حج کیا تھا، منکر اور ضعیف الاسناد

ثم لما استقلت به على البیدا۔ وكان يهمل بالحج والعمرة تارةً وتارةً
توجه۔ پھر جب اوٹنی آپ کو لے کر بیدار کی بلندی پر چڑھی، اور آپ کبھی توجہ و عمرہ دونوں
کا تلبیہ کہتے تھے اور کبھی صرف حج کا۔

ہے۔ جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں ہے۔ رہا یہ سوال کہ قصوا عقبا اور جدار ایک ہی نادر تھی یا الگ الگ؟
نودویؒ نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ ان کا میلان اس طرف ہے کہ یہ تینوں ایک ہی نادر کے مختلف نام
ہیں۔ اور انہوں نے یہ قول محمد بن براءؒ، تیمیمی تابعی وغیرہ سے نقل کیا ہے، اور ابن قتیبہ سے نقل کیا ہے کہ تین
اوٹنیاں تھیں۔ امام بخاریؒ کا میلان پہلے قول کی طرف ہے۔ جیسا کہ حاشیہ لایع میں کتاب المغازی میں
اس پر بہت ہی تفصیل سے کلام کیا ہے۔ پھر جب اوٹنی آپ کو لے کر بیدار کی بلندی پر چڑھی، اس وقت
بھی تلبیہ پڑھا (روشن) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ پڑھنے کی جگہ کی تعیین میں جو مختلف روایات
مردی ہیں ان میں یہی تطبیق ہے، اور یہ تطبیق حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں صراحۃً مذکور ہے، جیسے امام
ابوداؤدؒ، طحاویؒ، حاکمؒ اور بیہقیؒ نے روایت کیا ہے، اور امام حاکمؒ نے کہا ہے کہ یہ مسلم کی شرط پر صحیح
ہے۔ ائمہ اربعہ بلکہ ائمہ ستہ اور ان کے اصحاب کا یہی قول ہے۔ جیسا کہ حافظ عینیؒ نے نقل کیا ہے۔ لیکن اسی
نے ”الاکمال“ میں امام مالکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ سوار اس وقت تلبیہ کہے جب اس کی سواری اٹھے، اور
پیدل اس وقت کہے جب چلنے لگے۔ سوار کے مسئلہ میں امام شافعیؒ ان کے موافق ہیں اور امام ابوحنیفہؒ
فرماتے ہیں کہ دونوں جب نماز سے فارغ ہو جائیں تو تلبیہ پڑھیں۔ اوجہ میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔
اور اس میں امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ تینوں صورتوں کی گنجائش ہے کیونکہ تینوں صحیح روایات سے ثابت
ہیں۔ البتہ بہتر ہے کہ تلبیہ نماز کے فوراً بعد ہو۔

اور آپ کبھی توجہ و عمرہ دونوں کا تلبیہ کہتے تھے اور کبھی صرف حج کا ”الہدی“ میں صرف ان دونوں
صورتوں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ اور صاحب مرآۃ نے اسی کی پیروی کی ہے۔ بظاہر اس کے بعد یہ
بھی کہنا چاہیے کہ کبھی صرف عمرہ کا، عجیب بات یہ ہے کہ شیخ ابن قیمؒ نے اس صورت کو ذکر نہیں کیا۔ اور
ادام احرام میں اس شخص کا مذہب بھی ذکر کیا ہے جس کا قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف
عمرہ کا تلبیہ کہا اور اسی پر قائم ہے۔ اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ موصوف نے اس صورت کا انکار
کیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ کوکب میں ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک میں راویوں کا

وكان الاهدال بعد الظهر۔

ترجمہ: اور آپ نے ظہر کے بعد احرام باندھا تھا۔

جو اختلاف ہے کہ آپ نے صرف حج کا احرام باندھا تھا؟ یا حج و عمرہ دونوں؟ یا پہلے عمرہ کا احرام تھا پھر اس پر حج کا احرام داخل کر لیا تھا؟ _____ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ کے الفاظ مختلف تھے۔ کبھی صرف حج کا تلبیہ کہتے تھے، کبھی حج و عمرہ دونوں کا، اور کبھی صرف عمرہ کا۔ جس نے جیسا مناد لیا نقل کر دیا۔ مگر الہدیٰ کی عبارت سے اس پر اشکال ہو گا چنانچہ اس میں کہا ہے کہ ”کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپ نے صرف عمرہ کا احرام باندھا، یا صرف عمرہ کا تلبیہ پڑھا۔ یا صرف عمرہ ادا کیا“ الخ الہدیٰ کی یہ عبارت بہت ہی مشکل ہے۔ جیسا کہ الہجی گذرا۔ نیز ادھام کی جو تفسیر قسم میں ان لوگوں کا قول ذکر کیا ہے جو کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا تھا، پھر اس پر حج کا احرام داخل کر لیا تھا، اور اس قول کی تائید میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث جو صحیحین میں مروی ہے، ذکر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا احرام باندھا پھر حج کا اور ظاہر ہے کہ جو شخص عمرہ کا احرام باندھے وہ اس کا تلبیہ بھی پڑھے گا۔ شیخ قدس سرہ کے کلام کی تائید ملا علی قاری کے قول سے بھی ہوتی ہے جو موصوفی نے مرقاۃ میں حدیث ”فما من ابل بحج و عمرہ“ کے تحت ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں ”احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوں اور آپ کبھی حج کا تلبیہ کہتے ہوں، کبھی حجرہ کا اور کبھی حج و عمرہ دونوں کا“ اور ہر ایک نے جو سنایا کر دیا اور اجز میں بحر سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے، صاحب بحر فرماتے ہیں کہ ”ہمارے ائمہ نے مختلف روایات میں یہی تطبیق ذکر کی ہے“ اور یہی تطبیق ابن ہمام نے ذکر کی ہے۔ نیز اس کی تائید امام طحاوی کے اس قول سے ہوتی ہے جو حاشیہ کوکب میں بدل سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”ہو سکتا ہے کہ یہ حج مفرد کا تلبیہ، عمرہ مفرد کے تلبیہ کے بعد ہوا ہو، وہ اس طرح کہ آپ نے پہلے صرف عمرہ کا احرام باندھا ہو جیسا کہ قاسم اور محمد بن عبدالرحمن عن عروہ کی حدیث میں ہے بعد ازاں حج کا احرام باندھ لیا ہو۔ یہ تاویل اس بنا پر ضروری ہے تاکہ یہ تمام روایات متحد و متفق ہو جائیں۔“ انتہی اور ان تمام دلائل میں قومی تردید ابن عباس کی حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا احرام باندھا، اور آپ کے صحابہ کرام نے حج کا“ اور آپ نے ظہر سے قبل نہیں بلکہ ظہر کے بعد احرام باندھا۔

وکان حجہ علی رحل۔

اور آپ کاج پالان پر ہوا

جبکہ اس سے پہلے گزر چکا ہے اسباب حرم کو دم ہوا چنانچہ کہتے ہیں کہ آپؐ نے ظہر سے ذرا پہلے احرام باندھا تھا، الہدیٰ میں تو اسی طرح ہے اور ہمارے شیخ المشائخ حضرت گنگوہی قدس سرہ کو کب میں حدیث: ”اہل در الصلوٰۃ“ کے تحت فرماتے ہیں: ”یہ نفل نماز ہے۔ اگر صرف فرض پر اکتفا کیا جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں لیکن بہتر نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نفل نماز چاشت کے وقت پڑھی تھی۔ آپؐ نماز فجر پڑھ کر انتظار میں بیٹھے رہے، جب سورج طلوع ہوا تو غسل فرمایا اور احرام باندھا، میں کہتا ہوں اس کی تائید بخاری کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو پہلے گند چکی ہے۔ کہ آپؐ نے صبح کی نماز ادا کی پھر سوار ہوئے۔“

اور آپ کاج پالان پر ہوا۔ امام بخاری نے اس پر یہ ترجمہ الباب قائم کیا ہے ”باب الحج علی الرحل“ حافظ فرماتے ہیں: ”یہ نفل بفتح ناء و سکون حاء ہے۔ پہلے اونٹ کے کچادے کو کہتے ہیں جس طرح کہ گھوڑے کیلئے زین ہوتی ہے، مصنفؒ اس ترجمہ سے اس طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ حج میں سادگی تنعم سے افضل ہے۔ تنعم نہ محمل میں ہونے کچادے میں، نہ عمار یہ میں، میں کہتا ہوں کہ مرآۃ کے حاشیہ میں ہے کہ محمل بروزن مجلس اونٹ کے کچادے کی دونوں جانبوں کو کہتے ہیں۔ جن میں دونوں طرف آدمی سوار ہوں، اور ہودج: جو دونوں کی سواری جس پر قبہ بنا ہوا ہو، اور عمار یہ ہودج کو کہتے ہیں۔“

اور کیا محرم کے لئے ہودج وغیرہ میں سوار ہونا

جائز ہے؟ اس میں امام احمدؒ سے دو روایتیں ہیں۔

ایک یہ کہ جائز ہے۔ اور یہی امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ

محرم کا ہودج میں سوار ہونا اور سائے میں بیٹھنا جائز ہے یا نہیں؟

کاذہب ہے، دوم یہ کہ جائز نہیں اور یہ امام مالکؒ کا مذہب ہے تفصیل اجزا میں ہے۔ نیز نفل کے ”باب الحرم نفل“ میں بھی ہے: ”شیخ ابن قیمؒ اس محرم کے قصہ میں، جس کا عرف میں انتقال ہوا تھا فرماتے ہیں کہ محرم کے لئے سڑھا کرنا ممنوع ہے۔ اور اس کے تین درجے ہیں، ایک بالاتفاق ممنوع ہے، دوسرا بالاتفاق جائز ہے اور تیسرا مختلف فیہ ہے، اول درجہ میں ہر وہ چیز ہے جو سر سے متصل اور ملائیں ہو اور جو سڑھا کر کے لئے مقصود ہو، جیسے عمامہ وغیرہ۔ دوسرے درجہ میں خیمہ، مکان اور درخت وغیرہ ہیں البتہ امام مالکؒ کے نزدیک محرم کیلئے یہ ممنوع ہے کہ درخت پر کھڑا ڈال کر سایہ حاصل کرے۔ اور اکثر علماء کو ان سے اتفاق نہیں۔ تیسرا درجہ محمل اور ہودج کا ہے، اس میں امام احمدؒ کے تین قول ہیں۔ اول:

رقلت، وقال اللهم اجعله حجاجاً لآبائيه ولا سمعة يد قال، وخيرهم رسول الله
صلى الله عليه وسلم بين الانساك الثلاثة عند الاحرام وولدت اسماء محمد بن ابى بكر
رقلت، وانا جبريل وامرؤ ان يا مرأى صبا به برقم الاصوات
توجه: رش، اور آپ نے دعا کی کہ اے اللہ اس کو ایسا حج بنا جس میں ریا و سمعہ نہ ہو۔ اور آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھنے کے وقت صحابہ کو اختیار دیا کہ وہ حج کی تینوں اقسام میں جس قسم کا
چاہیں احرام باندھ لیں۔ اور اسماء کے بطن سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے۔
رش اور حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ اپنے
صحابہ کو آوازیں بلند کرنے کا حکم فرمائیں۔

جواز۔ یہ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ دوم یہ کہ ممنوع ہے۔ اور اگر اس نے اس کا ارتکاب کیا
توفیر دے۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ سوم یہ کہ ممنوع ہے لیکن اگر اس کا ارتکاب کیا تو فیر واجب نہیں۔
رش، اور آپ نے دعا کی کہ اے اللہ اس کو ایسا حج بنا جس میں ریا و سمعہ نہ ہو۔ جیسا کہ شامل میں ہے۔
اور اسی کی مثل فتح اور البدایہ والنہایہ میں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو
تینوں مناسک کا اختیار دیا
رش، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھنے
کے وقت صحابہ کو اختیار دیا کہ وہ حج کی تینوں اقسام میں
جس قسم کا چاہیں احرام باندھ لیں۔ پھر مکہ کے قریب پہنچے تو
جن لوگوں کے پاس ہدی کے جانور نہیں تھے آپ نے ان کو ترغیب دی کہ وہ حج کو فسخ کر کے عمرہ بنالیں،
پھر مرہ کے پاس اس کا قطعی حکم فرمایا۔

اور ذوالحلیفہ میں حضرت اسماء بنت عمیس زوجہ ابی بکر رضی اللہ عنہ کے بطن
محمد بن ابی بکر کی ولادت
سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے پس انہوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی معرفت
مسئلہ دریافت کیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم فرمایا کہ غسل کر کے احرام باندھ لیں۔ ان کے
اس قصہ میں بہت سے مسائل ہیں۔ ان میں سے شیخ ابن قیمؒ نے تین مسائل ذکر کئے ہیں۔ اول، مجرم کا غسل کرنا۔
دوم یہ کہ حائضہ بھی احرام کے لئے غسل کرے۔ سوم یہ کہ حائضہ کا احرام صحیح ہے۔

حیض و نفاس والی عورت کا احرام کیلئے غسل کرنا تمام علماء کے
حائضہ کا احرام کیلئے غسل کرنا
نزدیک مستحب ہے، مگر ابن حزم کے نزدیک فرض ہے کہ مکی العین
رش، اور حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور
عرض کیا کہ آپ اپنے صحابہ کو آوازیں بلند کرنے کا حکم فرمائیں۔ یہ بات ابن
بآواز بلند تبلیغ کہنے کا حکم

مذکورہ حدیث میں ہے کہ اگر کسی نے کسی چیز کو حلال کر دیا تو اسے حلال کر دیا اور اگر کسی نے کسی چیز کو حرام کر دیا تو اسے حرام کر دیا۔

رقی انتم سار لیلی

ترجمہ (رقی) پھر تلبیہ کہتے ہوئے چلے۔

عربی نئے کبھی سے اور اس سلسلہ میں روایت شہور ہے امام مالک بخلاف میں سائب سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے ہیں انہوں نے مجھ سے کہا اگر میں اپنے صحابہ کو کہوں یا فرمایا اپنے پیغمبروں کو حکم کروں کہ وہ تلبیہ میں اپنی آوازیں بلند کریں، "اور میں اس حدیث پر مفصل کلام کیا ہے، اور اس میں آپ کے ارشاد کہ میں اپنے صحابہ کو حکم کروں" کے تحت ذکر کیا ہے کہ جبریل کے نزدیک یہ حکم استجاب کے لئے ہے اور ظاہر یہ کہ نزدیک یہ حکم وجوب کے لئے ہے۔ اور یہ بات یہ تلبیہ کہنے میں ائمہ کے اختلاف کی تفصیل بھی اور جز میں مذکور ہے۔ خلاصہ یہ کہ امام ابو حنیفہؒ اور قول جلیل بن ابی شامہؒ نے فرمایا کہ نزدیک بلند آواز سے تلبیہ کہنا مستحب ہے۔ اور ان کا قول قیام یہ ہے کہ مسجد جماعت میں بلند آواز سے تلبیہ نہ کہا جائے، البتہ مسجد حرام، مسجد منیٰ اور مسجد عرفہ اس سے مستثنیٰ ہیں اور امام مالکؒ سے اس مسئلہ میں روایات مختلف ہیں۔ ابن قاسم کی روایت ہے کہ مسجد حرام اور مسجد منیٰ کے سوا اگر کوئی بلند آواز سے تلبیہ کہے، ابن رشد فرماتے ہیں: اہل علم کا اجماع ہے کہ غور کا تلبیہ یہ ہے ایک ایسی کی آواز نہ ہو جس سے اپنے آپ کو سنائی دے۔ اسی طرح ظاہر یہ کہ نزدیک بلند آواز سے تلبیہ کہنے کے وجوب کو بہت سے فاضلین نے ثابت کرنے سے انکار کیا ہے۔

حنیفہ نے اس حدیث سے ایک اختلافی مسئلہ پر تلبیہ کے الفاظ زبان کی ضرورت یا نہیں؟

ابن قاسم نے اس کو ناظر میں نہیں لیا اور جزی میں معنی سے نقل کیا ہے کہ آدمی کے لئے احرام کے الفاظ کو زبان سے اور کیا مستحب ہے تاکہ التماس نہ رہے اگر زبان سے اور نہیں کیا بلکہ صرف نیت پر کفایت کی تو جائز ہے۔ امام فخر الدینؒ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک کافی ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں صرف نیت کافی نہیں جب تک کہ نیت کے ساتھ تلبیہ کے الفاظ زبان سے ادا نہ کئے جائیں یا اس کے بجائے ہدی کے جائز روئے کو ہٹا دیا جائے۔ اور تلبیہ کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوالحلیفہ میں احرام لانے کے بعد ہے۔

رقی پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تلبیہ کہتے ہوئے چلے۔

تلبیہ کے الفاظ اور ان میں کی بیشی کا حکم

ابن قاسم کا تلبیہ معروف ہے یعنی بسمک اللهم لبیک لبیک

قلت (واجتمع علی ظهر القدم بملل ترجمہ: رش) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمل میں اپنے قدم کی پشت پر کچھنے لگوائے۔
 لا شریک لک لیک ان الحمد والنعمة لک والملك لا شریک لک۔ آپ کے تلبیس کی روایت
 صاحبہ البدایہ والنہایہ نے تفصیل سے ذکر کی ہیں۔ اور صحابہ ان الفاظ سے کبھی پشتی کر رہے تھے مگر
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر تلبیس نہیں فرمائی۔ یہ مسئلہ مختلف یہ ہے جس کی تفصیل اوچتر میں
 ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیس پر نہ ہادنی جائز ہے یا مکروہ ہے؟ اور بعض روایات میں
 آپ کے معروف تلبیس کچھ زیادہ الفاظ بھی مروی ہیں۔

رش) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمل میں اپنے قدم کی پشت پر کچھنے لگوائے، ملا علی قاری
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نمل میں کچھنے لگوانا
 شرح شمائل میں فرماتے ہیں: نمل: نفخ سیم ولام اولیٰ: مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جو
 مدینہ طیبہ سے سترہ میل ہے، جیسا کہ اوچتر میں ہے اور مرآۃ کے حاشیہ میں ہے کہ یہ مدینہ سے ایک رات کی
 مسافت پر ہے، عزیز محمد رابع نے اپنے مقالہ میں جس کا ذکر ذوالحلیفہ میں کر چکا ہے ذکر کیا ہے کہ عظام
 اس جگہ بھی اسی نام سے معروف ہے۔ مگر منزل نہیں۔ بعد اور محمد البلیان میں ہے یہ مدینہ سے نمل جیل
 مکہ و مدینہ کے درمیان میں ایک منزل ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نمل اور مدینہ کے درمیان دو دن کی مسافت
 ہے۔ اس کو نمل اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ چلنے والا مدینہ سے چل کر وہاں مشقت اور ٹھکن کے بعد
 ہی پہنچ سکتا ہے۔

اور ملا علی قاری کے قول اور صاحب مجمع البلیان کے قول میں اختلاف کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مختلف
 زمانوں میں مختلف راستے ہوتے تھے، چنانچہ آج بھی اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں اسی راستہ
 میں اگر پہاڑ کے اوپر سے جائیں تو راستہ لانا ہوتا ہے اور اگر پہاڑ کے ذامن سے گزر جائیں تو راستہ
 مختصر ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے سفر میں کچھنے لگوائے تھے یا کسی عمرہ کے
 سفر میں؟ دونوں کا احتمال ہے۔ جیسا کہ شرح شمائل میں کچھنے لگوانے کی جگہ اور حصہ بدن کے بارے میں
 جو مختلف روایات مروی ہیں ان کے مابین تطبیق کی یہی صورت اختیار کی ہے تفصیل اوچتر میں ہے۔

نیز اوچتر میں ہے کہ نام نوری اور تابعین کی ایک جماعت کا
 محرر کیلئے کچھنے لگوانا جائز ہے یا نہیں | قول ہے کہ احرام کی حالت میں کچھنے لگوانا مطلقاً جائز ہے، امام

رقال، فلما كانوا بالروحاء

ترجمہ: رقی پس جب روحا پہنچے

ابو خنیفہ، امام شافعی، امام احمد، اور امام اسحاق فرماتے ہیں کہ اگر بال نہ کٹیں تو جائز ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ محرم کے لئے بلا ضرورت احتجام جائز نہیں۔ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور امام مالکؒ اسی کے قائل ہیں، موثق ابن قدامہ فرماتے ہیں: ”رہی حجامت یعنی کچھنے لگوانا، سو اگر بال نہ کٹیں تو جمہور کے قول میں بغیر ندیہ کے مباح ہے کیونکہ یہ ایک علاج ہے جس میں خون نکالا جاتا ہے۔ اس لئے فصد کے مشابہ ہے، اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ بلا ضرورت کچھنے نہ لگوائے۔ نیز اوجز میں ہے کہ اگر سینگیان لگانے کیلئے بال کاٹنے کی ضرورت ہو تو کاٹنا جائز ہے۔ چنانچہ عبداللہ ابن مسعودؓ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے درمیان سینگیان لگوائیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی جگہ سے بال صاف کرنے پڑے ہونگے۔ امام مالکؒ، ابو خنیفہ، شافعی اور امام احمد کا یہی قول ہے اور صاحبین فرماتے ہیں کہ کچھ صدقہ کرنے۔ تفصیل اوجز میں ملاحظہ فرمائیں۔

پھر جب روحا پہنچے، روحاء، دوسری منزل ہے اور یہ مدینہ سے دو دن دوسری منزل روحاء کے فاصلے پر ہے، جیسا کہ حاشیہ لایع میں ہے۔ بخاری کی حدیث میں اس کا ذکر اُن مساجد کے ضمن میں آیا ہے جو مکہ و مدینہ کے مابین واقع ہیں، حاشیہ لایع میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ اس میں ہے کہ زخمشری کی کتاب الحبال میں ہے کہ مدینہ اور روحاء کے درمیان تین میل کم چار برید کا فاصلہ ہے اور صحیح مسلم میں ۳۶ میل کا فاصلہ مذکور ہے، اس کا نام روحاء اس بنا پر ہے کہ یہ بہت عمدہ اور پُر فضا جگہ ہے، عزیز محمد ربیع لکھتے ہیں کہ ”یہ آج کل بھی اسی نام سے معروف ہے۔ مگر اس زمانے میں منزل نہیں۔ اور یہ مدینہ سے ۱۷ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے“ اھ۔

ترمذی شریف میں عمرو بن عوف کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی روحاء میں نماز پڑھی اور فرمایا کہ اس مسجد میں ستر نبیوں نے نماز پڑھی ہے۔ کذا فی الفتح۔ وفاد الفار میں ”مسجد عرق الطبیئہ کے بیان میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بدر سے جہاد کا مشورہ اسی مسجد میں فرمایا تھا اور یہ روحاء سے دو میل اُدھر ہے۔ اسی کتاب میں اس کے بعد مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے پہلے یہاں ستر انبیاء نے نماز پڑھی ہے۔ صلوات اللہ وسلامہ

رأى حمار وحش عقيراً - ثم مضى حتى اذا كان بالاثناية
ترجمہ: تو ایک حمار وحشی دیکھا، جو زخمی تھا، پھر آپ چلے یہاں تک کہ جب اثنایہ پہنچے

عليهم اجمعين" اس مسجد اور موضع کو اس کتاب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

تو ایک حمار وحشی دیکھا۔ یہاں طبری کو وہم ہوا ہے کہ یہ حمار وحشی حضرت ابو قتادہؓ نے شکار کیا تھا۔ حالانکہ ابو قتادہؓ کے شکار کا واقعہ عمرہ حدیبیہ کا ہے۔ کذا فی الہدیٰ۔ غالباً وہم کا منشأ بخاری کی روایت ہے جس میں "حاجاً" کا لفظ ہے۔ حافظؒ نے اس کو ذکر کر کے یہ جواب دیا ہے کہ یہ مجاز ہے اور عینیؒ نے اس کو غلط قرار دیا ہے۔ شیخ ابن ہمامؒ اس طرف مائل ہیں کہ یہ منفرج کا واقعہ ہے۔ صاحب "ذفا" نے حمار کا قصہ تمام عرج میں ذکر کیا ہے۔ جو زخمی تھا۔ آپؐ نے فرمایا اسے رہنے دو۔ عنقریب اس کا مالک آئے گا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد قبیلہ ہنزا کا ایک شخص آیا جس نے اسے زخمی کیا تھا۔ اس نے عرض کیا رسول اللہ! اس حمار کو آپ جو چاہیں کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا اور انہوں نے وہ تقسیم کر دیا۔ بہری کی یہ حدیث امام مالکؒ نے مؤطا میں انہی الفاظ میں۔ اور امام مالک کی سند سے نسائیؒ نے بھی روایت کی ہے، امام طحاویؒ نے اس کو کئی سندوں سے روایت کیا ہے، ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: "بہری آیا، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ میرا شکار ہے اسے کھاؤ، پس آپؐ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تقسیم کرنے کا حکم فرمایا اللہ! اور وفار الوفا میں جو ہے کہ "ایک بہر کا آدمی آیا" غالباً یہ تحریف ناقل ہے، اس حدیث کے مختلف طرق اور جز میں مفصل مذکور ہیں۔ اور ایک حمار وحشی کا قصہ صعب بن جثامہؒ کی حدیث میں عنقریب آتا ہے۔ نیز محرم کو شکار کا گوشت کھانا ناجائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ کا اختلاف بھی آگے آتا ہے۔

پھر آپؐ چلے یہاں تک کہ جب اثنایہ پہنچے: "اثنایہ" تیسری منزل ہے۔

تیسری منزل اثنایہ | اور بخاری کی حدیث المساجد سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تیسری منزل رویشہ ہے۔ صاحب وفار نے "اثنایہ" کو رویشہ کے بعد ذکر کیا ہے، اور الہدیٰ میں ہے کہ "اثنایہ، رویشہ اور عرج کے درمیان ہے، اور مؤطا کی روایت میں بھی اسی طرح ہے، حموی نے اس کا ضبط خوب بسط سے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں اختلاف نقل کیا ہے کہ یہ یا کساۃ اثنایہ ہے یا کساۃ اثنایہ (اثنایہ ہے یا ان کے ساتھ اثنان ہے؟) نوں کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ صحیح اول ہنے یعنی یا کے ساتھ اثنایہ مرآۃ میں ہے

اذا طبی حاقف۔
توجہ: تو دیکھا کہ ایک ہرن ریت کے ٹیلے میں بیٹھا ہے۔

کہ ہنزہ پر مینوں و کتیں صحیح ہیں۔ اور معجم البلدان سے نقل کیا ہے کہ یہ جھفہ کے راستے میں ایک جگہ ہے، مدینہ سے اس کا فاصلہ ۵۴ فرسخ ۲۵ میل ہے، لیکن معجم کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس میں ۲۵ فرسخ (۵۷ بل) مذکور ہے۔ اس کی تائید محلی کی عبارت سے بھی ہوتی ہے جو اوجز میں نقل کی ہے کہ یہ ایک جگہ کا نام ہے جو جھفہ کے راستے میں مدینہ سے ۷۷ میل کے فاصلے پر واقع ہے، اھو اور حاشیہ بخاری میں ہے کہ رویشہ اور روجار کے درمیان ۴۴ میل کا فاصلہ ہے۔ عزیز محمد رابع نے لکھا ہے کہ یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ آجکل اس کا نام کیا ہے۔ اھ

تو دیکھا کہ ایک ہرن ریت کے ٹیلے کے سائے میں بیٹھا ہے۔ اور اس زخمی ہرن کا واقعہ میں تیرہ سوست ہے، آپ نے ایک شخص کو حکم فرمایا کہ اس کے پاس کھڑا ہے تاکہ کوئی شخص اس سے تعرض نہ کرے یہاں تک کہ تمام رفقہ یہاں سے گذر جائیں۔ اس ہرن کے درمیان اور گزشتہ بالا حار و حشی کے درمیان فرق یہ ہے کہ حار و حشی کا شکار کرنے والا احرام میں نہیں تھا۔ اسلئے اس کے کھانے سے منع نہیں فرمایا۔ اور اس ہرن کے شکار کنندہ کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ وہ بغیر احرام کے ہے یا نہیں؟ اس لئے اس کے کھانے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ ایک شخص کو وہاں کھڑا کر دیا تاکہ کوئی اس کو پکڑے نہیں۔ کذا فی الہدی۔ اوجز میں ان دونوں کے درمیان وجہ فرق تفصیل سے ذکر کئے ہیں۔ ایک ان میں سے یہی جو الہدی سے نقل کیا ہے۔ اور اس میں یہ بھی کہیں کہتا ہوں کہ ان دونوں کے درمیان فرق ظاہر ہے وہ یہ کہ ہرن زندہ تھا جیسا کہ اس کی تصریح موجود ہے، اور یہ وجہ فرق سب سے بہتر ہے۔ بلکہ یہی متعین ہے۔ باجی نے دونوں کے درمیان دو وجہ سے فرق بیان کیا ہے۔ ایک یہی جس کو میں نے اختیار کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ جس شخص نے تیرے اس ہرن کا شکار کیا تھا وہ اس کا مالک ہو گیا تھا لہذا اس کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کا حق نہیں تھا۔ اھ

اس قصہ میں اس سئلہ کی دلیل ہے کہ محرم نے جس شکار کو قتل کیا ہو وہ محرم کا شکار حرام ہے۔ مردار کی طرح ہے، کیونکہ اگر حلال ہوتا تو اس کی مالیت ساقط نہ ہوتی۔ کذا فی الہدی۔ اوجز میں حق تعالیٰ کے ارشاد ولا تقتلوا الصيد وانتم حرم سے متعلقہبحاث کے ضمن

دقلت) و اجتمع علی راسہ بلحیی جمل۔
توجہ رشن، اور اپنے سر پر بلحیی جبل نامی جگہ میں سینگ لگوائی۔

میں ذکر کیا ہے کہ غالباً اللہ تعالیٰ نے تعیم کی خاطر ذبح کے بجائے قتل کا لفظ ذکر فرمایا ہے۔ ابو بکر جمل
فرماتے ہیں: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ ہر وہ شکار جس کو محرم قتل کرے وہ حلال نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ
نے اس کو قتل کہا ہے اور مقتول کا کھانا جائز نہیں۔ صرف نہ بوج کا کھانا حلال ہے۔ اور جس کو ذبح
کیا جائے اسے مقتول نہیں کہتے۔ پوری تفصیل اور جز میں دیکھئے۔

رشن، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر پر اور ابن جعفیہ
گنجدی جبل میں سینگ لگوانا۔

وہ مختلف جگہوں میں مختلف ہوتی ہے اور سر میں سب سے سخت ہوتی ہے۔ بلحیی جبل نامی جگہ میں سینگ
لگوائی۔ بلحیی: فتح لام و سکون حائے ہملہ و یاء سے مفقودہ و یاء سے مکثہ بلفظ تنبیہ اور جبل بفتح جیم و
میم یہ مکہ کے راستے میں ایک جگہ کا نام ہے، جیسا کہ موطا امام مالک کی روایت میں ہے، موطا امام محمد کے
تعلیقہ میں کہ مکہ کے راستے میں ایک جگہ میں جس کو بلحیی جبل کہا جاتا ہے، یہ ایک فراتے ہیں بلحیی جبل۔
بعض روایات میں بلفظ تنبیہ ہے، اور بعض میں بلفظ مفقودہ لام مفتوح ہے۔ اور اس کا سر بھی جائز ہے۔
اور خار ساکن ہے۔ بغوی نے اس کو ابی معجم میں اسم عقیق کے ذیل میں ذکر کیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ وہ
بر جبل ہے جس کا تذکرہ ابو جہم کی تعیم والی حدیث میں آیا ہے، ابن رضاح وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ تحفہ کے بعد
تھیلائے سات میل کے فاصلہ پر ایک معروف جگہ ہے۔ کنانی الاوجزہ اور معجم میں ہے کہ بلحیی جبل کی جگہوں
کا نام ہے پھر ان کی تفصیل ذکر کی ہے۔ یہ جگہ مکہ مدینہ کے درمیان ہے اور مدینہ سے قریب تر ہے۔

کنانی المعجم والفتح والعیش۔
بعض کا خیال ہے کہ بلحیی جبل سے مراد وہ آلہ ہے جس سے سینگ لگائی جاتی ہے، یعنی اونٹ کے
دونوں جیروں کی ہڈی سے احجام کیا۔ معجم میں ہے بلحیی جبل ہر جڑے والے جانور کی دو ہڈیاں
جس میں دانت ہوتے ہیں۔ جمع بلحی، اھذا اوجزہ میں ہے، یہاں آلہ مراد لینا وہم ہے اور پہلے معنی ہی محمد
ہیں۔ یعنی یہ جگہ کا نام ہے۔ جیسا کہ موطا مالک، موطا امام بخاری شریف اور دیگر کتابوں میں اس کی

رقال، ثم سار حتى نزل بالعرج - وكانت زاملته وزاملته ابني بكر واحدة
 توجبه (رق) پھر چلے یہاں تک کہ "عرج" میں فروکش ہوئے۔ اور آپ کی اور ابو بکرؓ
 کی سامان بردار اونٹنی ایک ہی تھی۔

تصريح موجود ہے۔ حازمی فرماتے ہیں کہ وسط سر میں احتجام کا واقعہ حجة الوداع کا ہے۔ کذافی الاوجہ
 اور محرم کے سینگی گنوانے کا حکم قریب ہی گندرا ہے۔ جہاں "ملک" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں
 کی پشت پر سینگی گنوانے کا ذکر ہوا۔

رق) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چلے یہاں تک کہ "عرج" میں فروکش
 چوتھی منزل العرج ہوئے۔ "عرج" کا ذکر بخاری شریف کے باب المساجد میں ہے، بخاری کے
 حاشیہ میں عینی سے نقل کیا ہے کہ یہ بفتح عین و سکون را ہے اس کے بعد جمیم ہے۔ مکہ اور مدینہ کے راستے میں
 ایک بڑی بستی ہے، انتہی۔ یہ چوتھی منزل ہے۔ اس کے اور رویشہ کے درمیان ۴ میل کا فاصلہ ہے، یہ
 انس عرج کے علاوہ ہے جو طائف کے پاس ہے۔ کذافی معجم البلدان۔ پوری بحث تلخیص بدل میں ہے۔
 یاقوت حموی نے اس نام کی کئی جگہیں ذکر کی ہیں منجملہ ان کے ایک یہی ہے جو حرمین کے درمیان ہے۔
 اور ایک طائف کے علاقہ میں ہے۔ نیز ایک دہن کے شہر کا نام ہے۔ اور اسکی وجہ تسمیہ میں متعدد اقوال نقل کئے ہیں۔
 اور آپ کی اور ابو بکرؓ کی سامان بردار اونٹنی
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کا
 سامان ایک ہی اونٹنی پر تھا
 ایک ہی تھی حاشیہ امراۃ میں ہے کہ زاملہ وہ اونٹ کہلاتا
 ہے جس پر فیلہ اور سامان لا دیا جائے۔ یزید سے اخوذ

یہ جس کے معنی ہیں لادنا۔ اور زمیل وہ شخص کہلاتا ہے جس کا سامان تمہارے سامان کے ساتھ ایک ہی اونٹ
 پر ہو۔ اس حدیث پر یہ اشکال ہوگا کہ امام بخاری نے "باب الحج علی الرجل" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی
 روایت ذکر کی کہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی ہرج کیا، اور وہی آپ کی زاملہ (سامان بردار) تھی،
 شارحین میں سے کسی نے اس اختلاف سے تعرض نہیں کیا۔ میرے نزدیک اس اشکال کا حل یہ ہے کہ یہ
 مختلف اوقات پر محمول ہے، چنانچہ ابو داؤد کی روایت رجوہاں میں ذکر کی گئی ہے اس میں تصریح ہے
 کہ یہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے راستہ کا واقعہ ہے۔ اور حدیث بخاری سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ وہ مکہ سے

فاضلہا غلامہ فطفت ابو بکر رضیہ و قال بعیر واحد تضلہ،
 ترجمہ: حضرت ابو بکرؓ کے غلام نے اس کو گم کر دیا۔ پس ابو بکرؓ اسے مارنے لگے۔ اور فرمایا: ایک ہی تو
 اونٹ تھا تو نے وہ بھی گم کر دیا؟

عرفات کے راستہ کا قصد ہے پہلا سفر جو تکہ طویل تھا۔ اس بنا پر بہت سا سامان اور بہت سی ضروریات توشرہ
 وغیرہ ساتھ ہو گئی۔ لہذا وہ ایک مستقل سواری پر ہو گئی۔ اس لئے تمام سامان حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ
 کے سامان والی اونٹنی پر تھا۔ لیکن مکہ سے عرفات کا سفر مختصر تھا، اس میں بستر اور سامان وغیرہ کی زیادہ
 ضرورت نہ تھی۔ اس لئے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کی اونٹنی پر ہو گا۔ اس کی تائید حضرت جابرؓ
 کی حدیث طویل سے بھی ہوتی ہے، اس میں مقام عرفہ کے بارے میں یہ لفظ ہیں: "پس جب سورج ڈھلا تو آپؐ نے
 قصوار کی تیاری کا حکم دیا چنانچہ اس پر کچا وہ رکھا گیا" اور ظاہر یہ ہے کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
 سامان بھی ہو گا۔ اور اس پر حدیث ابن ماجہ سے اشکال نہیں ہوتا، جو حضرت اسامہؓ سے بایں الفاظ مروی ہے کہ
 "بہاے اور ابو بکرؓ کے سامان کے لئے ایک ہی اونٹنی تھی۔" صحابہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے غلام کے پاس تھی، کیونکہ ان
 دونوں باتوں کے درمیان کوئی منافات نہیں کہ آنحضرتؐ کا سامان بھی پر ہوا اور حضرت اسامہؓ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سامان
 بھی، اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ البدایہ والنہایہ میں منہاجہ سے حدیث ابن ماجہ کی مثل روایت نقل
 کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضرت ابو بکرؓ کی سامان بردار اونٹنی ایک
 ہی تھی۔"

حضرت ابو بکرؓ کے غلام نے اس اونٹنی کو گم کر دیا۔ ابو داؤد کے لفظ یہ
 حضرت ابو بکرؓ کا غلام کو مارنا | ہیں؟ ابو بکرؓ کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سامان بردار اونٹنی حضرت
 ابو بکرؓ کے غلام کے پاس تھی۔ ابو بکرؓ بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ غلام اونٹنی کو لے کر نکلتے گا۔ وہ آیا تو اس کے
 پاس اونٹنی نہیں تھی۔ فرمایا تمہارا اونٹ کہاں ہے؟ عرض کیا کہ وہ تو گذشتہ رات سے گم ہو گیا ہے۔ پس
 ابو بکرؓ اسے مارنے لگے۔ "شیخ بڈل فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خادم کی گوشمالی، حق تعالیٰ کے
 ارشاد "ولا جدال فی الحج" کے ضمن میں نہیں آتی، ورنہ ابو بکرؓ کبھی اسکی جرأت نہ کرتے۔ اور آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو اس سے منع کر دیے۔ لیکن آپؐ کا ارشاد کہ: "ان محرم صاحب کو دیکھو یہ
 کیا کر رہے ہیں؟" اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ محرم کے لئے یہ بھی مناسب نہیں؟"

اور فرمایا: ایک ہی تو اونٹ تھا تو نے وہ بھی گم کر دیا؟ نہ کافی میں ہے کہ فضالہ سلمیٰ کی آل کو

ثم مضى حتى اذا كان بلالاً بوا.
پھر آپ چلے یہاں تک کہ جب ابوا پہنچے۔

جب خبر پہنچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سامان بردار اونٹنی گم گئی ہے تو حلوے کا ایک ڈبر لائے اور خدمت اقدس میں پیش کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: "اُو ابوبکر! اللہ تعالیٰ نے عمدہ غذا ہیا فرمادی ہے، مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ غلام پر غیظ و غضب کا اظہار فرما رہے تھے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوبکر بس تسلی پکڑو، کیونکہ معاملہ نہ تمہارے اختیار میں ہے نہ ہمارے، اتنے میں حضرت سعدؓ اور ابوقحیس ایک سامان بردار اونٹنی، جس پر توشہ تھا لے کر حاضر ہوئے، سعد نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں خبر ملی ہے کہ آپ کی سامان بردار اونٹنی گم گئی ہے ورنہ اس کے بدلے میں یہ اونٹنی پیش خدمت ہے،" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے ہمارے اونٹنی واپس بھیج دی ہے۔ اب تم اپنی اونٹنی لے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے۔"

پھر آپ چلے یہاں تک کہ جب ابوا پہنچے ابوا: "بفتح الف وسکون بار۔ اس کے پانچویں منزل ابوا، بعد واو اور الف ممدودہ کنافی المعجم۔ پیر پانچویں منزل ہے۔ زرقانی فرماتے ہیں:

اس کے اور تحفہ کے درمیان ۳۳ میل کا فاصلہ ہے "مرآۃ میں بھی اسی طرح ہے اور اس میں اتنا اور اضافہ ہے۔ کہ ان دونوں کے درمیان رابع ہے۔ ابوا مدینہ کی طرف ہے اور تحفہ مکہ کی طرف۔ اور کہا گیا ہے کہ وہاں ایک بلند پہاڑ ہے۔ اسی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی وفات ہوئی اور ابوا مدینہ کی جانب سے رابع سے پہلے ہے۔ زرقانی فرماتے ہیں: اس کو ابوا اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہاں سیلاب ٹھکانا پکڑتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہاں و بار بہت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس صحت میں اس کا نام ابوا ہونا چاہیے تھا، یا یہ کہا جائے کہ ابوا ابوا سے مقلوب ہے۔" حموی نے اور بھی وجوہ تسمیہ ذکر کی ہیں۔ اور اس بستی کے بارے میں مفصل کلام کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کے یہاں دفن ہونے ابوا: حضورؐ کی والدہ ماجدہ کا مدفن | کی وجہ یہ ذکر کی ہے کہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے ان کا یہاں انتقال

ہو گیا تھا۔ اس لئے یہیں دفن ہوئیں۔ عزیز محمد رابع لکھتے ہیں: کہ ابوا ایک وادی کا نام ہے جس میں دان ہے جیسا کہ ابھی آتا ہے۔ وہاں: بفتح واؤ تشدید وال پہلے جحفہ کے قریب میں ایک جگہ کا نام ہے۔ جو ابوا

اھدیٰ لہ الصعب بن جثامہ عجز حمار وحشی فردہ علیہ۔

ترجمہ: تو صعب بن جثامہ نے آپؐ کی خدمت میں حمار وحشی کی ران کا ہدیہ پیش کیا جسے آپؐ نے واپس فرما دیا۔

کی نسبت جحفہ سے قریب تر ہے، ان دونوں کے درمیان اٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ زیر بحث واقعہ ابواء میں پیش آیا یا ودان میں؟ اس میں راوی کو شک ہے بعض راویوں نے ابواء ذکر کیا ہے اور بعض نے ودان۔ کذا فی الزہد قالی۔ اور جز میں مختلف روایات ذکر کرنے کے بعد حافظ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بظاہر یہ شک ابن عباس کی جانب سے ہے۔ نیز اور جز میں ایک اور اختلاف بھی ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ قید میں پیش آیا یا جحفہ میں؟ یہ تمام مقامات قریب قریب ہیں۔ اور اور جز میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔

یا قوت حموی لکھتے ہیں کہ ودان تین حکموں کا نام ہے۔ جن کو انہوں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے، نیز حموی لکھتے ہیں کہ موضع ودان کی طرف صعب بن جثامہ کی نسبت کی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ یہاں قیام کیا کرتے تھے اس لئے اسی کی طرف منسوب ہوئے، معزز محمد رابع لکھتے ہیں کہ ابواء ایک وادی کا نام ہے جس میں ودان ہے۔ نیز اس وادی میں ایک خاص موضع کا نام بھی ابواء ہے۔ شام کے راستہ میں مشرق کی طرف واقع ہے۔ البتہ ودان ابجکل "مستورہ" کے نام سے معروف ہے جو مدینہ سے ۲۸۸ کیلو میٹر پر واقع ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جگہ ان دنوں بہت بڑی منزل ہے۔ یہاں تلی ہوئی مچھلیوں کی فروخت خوب ہوتی ہے، حجاج کرام یہاں سے گزرتے ہیں تو مچھلی کھائے بغیر اگے نہیں جاتے کہ یہاں کی مچھلیاں بہت عمدہ ہوتی ہیں۔

توصعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ نے آپؐ کی خدمت

صعب بن جثامہ کو زہر مدیہ کرنا کا واقعہ | میں حمار وحشی کی ران کا ہدیہ پیش کیا۔ روایات اور کتب تاریخ

میں معروف ہے یہ کہ صعب بن جثامہ کا واقعہ حجة الوداع میں پیش آیا۔ مگر شیخ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ صعب بن جثامہ کی حدیث کا واقعہ حجة الوداع میں پیش آنا ہمارے نزدیک ثابت نہیں۔ الیٰ اخر ما بحث فیہ جسے آپؐ نے واپس فرما دیا۔ اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ سالم بن عمار نے کہا کہ ہدیہ پیش کیا گیا تھا یا اس کے ایک ٹکڑے کا؟ اور یہ کہ آپؐ نے اسے قبول فرمایا تھا یا رد کر دیا تھا؟ اور یہ کہ یہ واقعہ ابواء کا ہے یا ودان کا یا جحفہ کا؟ ان مباحث میں وسیع اختلاف ہے۔ جو فتح وغیرہ مطولات میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور اور جز میں

ان کے کلام کا خلاصہ دیا ہے، اور لامع کے حاشیہ میں اس پر اجمالی کلام کیا ہے۔ امام بیہقی نے ان روایات کیوں جمع کیا ہے کہ زندہ میل گائے کو واپس کر دیا گیا اور اس کے ٹکڑے کو قبول فرمایا، جیسا کہ فتح، مواہب

(قلت) واعتل بعير لصفية نامر زینب ان تعطيها بعيرا۔ فقلت انا ا فقير
بیهود تیک؟ فغضب۔

ترجمہ: (رش) اور حضرت صفیہ کا اونٹ بیمار ہو گیا تو آپ نے حضرت زینب کو حکم فرمایا کہ انہیں
ایک اونٹ دے دیں۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کی یہودن کو دے دوں؟ اس پر آپ ناراض ہو گئے۔

اور شرح مواہب میں ہے، مگر نسائی کی روایت جس میں ٹکڑے کا واپس فرمانا مذکور ہے اس تطبیق کے خلاف
ہے، البتہ کہ اس میں تاویل کی جائے۔ علامہ زر قانیؒ نے حافظ کی متابعت میں کہا ہے کہ قبول کرنے کی روایت
کو مکہ سے واپسی پر محمول کرنا چاہیے۔ اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ یہ قصہ حنفیہ میں پیش آیا۔ امام
بیہقی کی ذکر کردہ تطبیق کو حافظ کا ذکر ناقابل اعتماد نہیں کیونکہ یہ ان کے فقہی مسلک کے خلاف ہے۔

محرم کے شکار کے مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ جیسا کہ اوپر میں

محرم کے شکار میں اختلاف | مفصل ذکر کر چکا ہوں، شیخ قدس سرہ نے الکو ب الدر می میں اس پر بہت
عمدہ کلام کیا ہے: فرماتے ہیں: جاننا چاہیے کہ اس مسئلہ میں ہمارے اور امام شافعیؒ کے درمیان اختلاف ہے
اگر محرم نے خود شکار کیا یا شکار کو ذبح کیا تو بالاتفاق حرام ہے، اور اگر غیر محرم نے محرم کے حکم سے شکار کیا
تب بھی بالاتفاق حرام ہے۔ اور اگر غیر محرم نے شکار کیا اور اس کی نیت یہ تھی کہ محرم کو کھلائیگا مگر محرم نے
اس کا حکم نہیں کیا تو امام شافعیؒ کے نزدیک حرام ہے اور ہمارے نزدیک حرام نہیں، "الیٰ اخر ما افاد۔ میں
کہتا ہوں کہ اس مسئلہ میں تین مذہب ہیں۔ اول یہ کہ مطلقاً ممنوع ہے، یہ قول حافظ عینیؒ نے بعض سلف
سے نقل کیا ہے۔ دوم یہ کہ اگر محرم کی خاطر شکار کیا گیا ہو تو ممنوع ہے، ائمہ ثلاثہ اسی کے قائل ہیں۔ سوم
یہ کہ اگر محرم نے خود شکار کیا ہے یا اس کی اجازت یا دالت سے شکار ہوا ہو تو بالاتفاق حرام ہے۔ یہ اجمالی
بات ہے، ورنہ امام مالکؒ وغیرہ کے مختلف اقوال مروی ہیں۔ جیسا کہ اوپر میں تفصیل بیان کر چکا ہوں۔

(رش) اور اثنار راہ میں اثم المؤمنین حضرت صفیہ بنت حشی
حضرت صفیہ کے اونٹ کا بیمار ہونا | رضی اللہ عنہا کا اونٹ بیمار ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اثم المؤمنین

حضرت زینب بنت حشی رضی اللہ عنہا کو حکم فرمایا کہ انہیں ایک اونٹ دے دیں۔ انہوں نے جواب میں کہا

کہا کیا میں آپ کی یہودن کو دے دوں؟ یہ اس لئے کہا کہ حضرت صفیہؒ حضرت ہارون علی یتنا وعلیہ الصلوۃ
والسلام کی اولاد سے تھیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے۔ چنانچہ اثنار سفر اور ایام منی میں ان

سے گفتگو نہیں فرمائی یہاں تک کہ مدینہ والیسی ہوئی، مدینہ اگر بھی محرم اور صفر میں نہ ان سے بات کی نہ ان کی باری پران کے گھر گئے۔ جب ربیع الاول کا مہینہ آیا تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے، جیسا کہ مسند احمد کی روایت سے ابھی آتا ہے۔ مجھے ابھی تک اس کی تحقیق نہیں ہو سکی کہ یہ واقعہ کس جگہ پیش آیا تھا۔ حافظ ابن قیم اور ان کے متبعین صاحب مرآۃ وغیرہ قسطلانی اور ان کے شاہجہ زرقانی پر تعجب ہے کہ کسی نے بھی حجۃ الوداع کے واقعہ میں اس قصہ کا ذکر نہیں کیا۔ ابو داؤد نے یہ قصہ حضرت عائشہؓ سے مختصر نقل کیا ہے کہ حضرت صفیہ بنت ھیثمؓ کا اونٹ بیمار ہو گیا۔ اور حضرت زینبؓ کے پاس نہاد سواری تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ انہیں (صفیہؓ کو) ایک اونٹ دے دو، حضرت زینبؓ نے کہا: میں اس ہونٹ کو دے دوں؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے، اور ڈوا لہجہ، محرم اور صفر کے کچھ حصہ میں اور مجمع الزوائد میں ہے کہ صفر میں ان سے قطع تعلق کے رکھا، ربیع الاول میں ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اس کی تائید مسند احمد کی روایت سے ہوتی ہے جس میں خود حضرت صفیہؓ سے اس قصہ کو مفصل روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کے ہمراہ حج کیا۔ سفر کے دوران ایک شخص ان کی سواریوں کو تیز ہینکانے لگا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگینوں۔ یعنی عورتوں۔ (کی سواریوں) کیوں ہینکایا کرتے ہیں؟ دیں! اٹنا کہ سفر جاری تھا صفیہ بنت ھیثمؓ کا اونٹ (بیمار ہو کر) اچانک بیٹھ گیا۔ حالانکہ انہی کی سواری سبک عمدہ تھی۔ وہ رونے لگیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی۔ تو ان کے پاس تشریف لائے، اور اپنے دست مبارک سے ان کے آنسو صاف کرتے لگے، مگر ان کے گریہ میں اور اضافہ ہو گیا۔ آپؐ ان کو رونے سے منع فرمایا۔ تاہم جب انہوں نے زیادہ رونا شروع کیا تو آپؐ نے ڈانٹا۔ اور مجبوراً لوگوں کو اترنے کا حکم فرمایا۔ حالانکہ آپؐ کا ارادہ وہاں اترنے کا نہیں تھا۔ بہر حال لوگ اتر گئے، اور یہ میری باری کا دن تھا۔ جب لوگ اترے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ کھنکھایا۔ اور آپؐ اس میں فروکش ہوئے۔ مجھے خبر نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے میرے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا۔ اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں آپؐ کے دل میں کوئی ناگواری نہ ہوئی حضرت عائشہؓ کے پاس گئی، اور ان سے کہا: آپؐ کو معلوم ہے کہ میں کسی بھی چیز کے بدلے اپنی باری کے دن کا سودا بھی نہیں کر سکتی۔ مگر آج میں اپنا دن تمہیں اس شرط پر مہیا کرتی ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے راضی کر دو۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، بہت اچھا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے اپنے سر کا کپڑا لیا، اسے غفران

وایضاً علم من حدیث المسند ان قصۃ النجشۃ المشہورۃ وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم یا انجشش رویدک سوفک بالقواریر ایضاً وقع فی ہذا السفر ترجمہ: نیز مسند کی حدیث سے معلوم ہوا کہ انجشہ کا مشہور قصہ بھی جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ اے انجشہ! بگینوں کو ذرا آہستہ چلاؤ۔ اسی سفر میں پیش آیا تھا۔

سے ملا، پھر اسپر پانی چھڑکا تا کہ اس کی خوشبو مٹک جائے۔ پھر اپنے کپڑے پہنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں۔ نیچے کا کنارہ اٹھایا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عائشہ کیا بات ہے؟ آج تمہاری باری کا دن نہیں؟" انہوں نے عرض کیا کہ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتے ہیں عطا کر دیتے ہیں۔ بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ قبیلہ فرمایا۔ جب چلنے کا وقت ہوا، تو حضرت زینب سے فرمایا کہ اپنی بہن کو ایک اونٹ دے دو۔ ازواج مطہرات میں انہی کے پاس نسب سے زیادہ سواریاں تھیں حضرت زینب نے کہا: میں آپ کی بیہودوں کو دوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ بات سن کر ناراض ہوئے۔ ان سے گفتگو ترک کر دی، مکہ مکرمہ جانے تک ایام منیٰ میں۔ اور مدینہ کی واپسی تک، نیز مدینہ طیبہ میں محرم اور صفر گزرنے تک نہ آپ ان کے پاس تشریف لے گئے، نہ انہیں باری کا حصہ دیا۔ اور وہ آپ سے بالکل ہی مایوس ہو گئیں جب ربیع الاول شروع ہوا تو آنحضرت اللہ کے پاس تشریف لیگے جب انہوں نے آپ کا سایہ دیکھا تو دل میں کہنے لگیں کہ یہ کسی آدمی کا سایہ ہے۔ اور نبی کریم کو میرے پاس تشریف لائے نہیں۔ پھر شخص کن ہو گا؟ جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو کہنے لگیں: یا رسول اللہ! جب آپ میرے پاس تشریف لائے تو میں بیت میں ہوں کہ کیا کروں اور کس طرح آپ کی ناراضگی کی تلافی کروں، ان کے پاس ایک باندی تھی۔ جسے وہ آنحضرت سے پردہ میں کھتی تھیں، اس کے بارے میں عرض کیا کہ فلاں باندی آپ کو مہمہ کرتی ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب کی چار پائی کے پاس گئے وہ اٹھا کر کھٹی ہوئی تھی۔ اپنے دست مبارک سے لے بچایا۔ پھر اپنی اہلیہ محترمہ سے ملے اور ان سے راضی ہو گئے۔

نیز مسند کی اسی حدیث سے معلوم ہوا کہ انجشہ کا مشہور قصہ بھی جس میں انجشہ کیلئے حکم نبوی | آپ نے فرمایا تھا کہ اے انجشہ! بگینوں کو ذرا آہستہ چلاؤ، اسی سفر میں پیش آیا

تھا۔ مگر تعجب ہے کہ شیخ ابن قیم نے اس کو بھی قصہ حجتہ الوداع میں ذکر نہیں کیا۔ یہ قصہ معروف ہے۔ بخاری وغیرہ کتب صحاح میں مروی ہے۔ امام بخاری نے چند مواضع میں اس کی تخریج کی ہے۔ منجملہ ان کے

دَقَالَ فَلَمَّا مَرَّ بِوَادِي عُسْفَانَ
تَوَجَّهَ: (ق) پھر جب آپ وادی عسفان سے گزرے۔

”باب مای جوز من الشعر والرجز“ میں اس کو ذکر کیا ہے۔ اور حافظ نے اس باب میں اس حدیث کے الفاظ اور طرق کو خوب بسط سے ذکر کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض بیویوں کے پاس تشریف لے گئے ان کے ساتھ ام سلیم بھی تھیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ سفر میں تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ اپنی فرودگاہ میں تھے کہ حدی خواں نے حدی پڑھی۔ نسائی کی روایت میں ہے کہ ان کے ساتھ ایک اونٹوں کو ہنکانے والا تھا اور ایک حدی خواں تھا، ابو داؤد و طیالسی کی روایت میں ہے کہ انجستہ مستورات کے حدی خواں تھے۔ اور برابرس مالک مردوں کے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ کسی سفر میں تھے۔ ان روایات کی پوری تفصیل فتح الباری میں ہے۔ مگر حافظ نے کسی روایت سے سفر کی تعیین نہیں کی۔ تعجب ہے کہ انہوں نے مسند احمد کی مذکورہ بالا روایت ذکر نہیں کی جس میں تصریح ہے کہ یہ قصہ سفر ج کا ہے۔ تاحال مجھے تحقیق نہیں کہ یہ دونوں واقعے کس منزل میں پیش آئے۔ اس کی نقیض کر لی جائے۔

یہ آٹھ منزلیں جو شیخ ابن قیم نے ذکر کی ہیں۔ بیشتر ان مساجد کے مطابق ہیں جو حضرت ابن عمرؓ نے بتائی ہیں۔ اور امام بخاری نے ”باب المساجد التي على طرق المدينة“ میں۔ نیز صاحب البدایہ والنہایہ نے انہیں ذکر کیا ہے۔ اور صاحب البدایہ والنہایہ فرماتے ہیں، کہ ان میں سے بیشتر مواضع کے نام تبدیل ہو چکے ہیں اور بہت مقامات آج کل غیر معروف ہیں۔ پہلی چار منزلوں کے نام تو بخاری کی روایت کے موافق ہیں۔ اور یہ پانچویں منزل اور اسی طرح آئندہ منازل کے نام ان ناموں سے مختلف ہیں۔ جو بخاری شریف میں ذکر کئے گئے ہیں۔

بخاری کی روایت میں ”عرج“ کے بعد پانچویں منزل موضع ”ہرشی“ مذکور موضع ہرشی ہے۔ بفتح اول و سکون را۔ اور اس کے بعد شین منقوطہ اور اس کے بعد الف مقصورہ ہے۔ کذا فی الفتح۔ اور معجم میں ہے کہ یہ شام اور مدینہ سے مکہ کے راستوں کے سنگم پر ہے۔ اس سے نیچے مغربی جانب موضع ودان و وکیل کی مسافت پر واقع ہے۔

(ق) پھر جب آپ وادی عسفان سے گزرے۔ عسفان: بروزن عثمان چھٹی منزل عسفان

مگر سے دوسرے پر ہے۔ کذا فی القاموس۔ اور مرآۃ کے حاشیہ میں ہے کہ ”یہ جگہ

قال یا ابوبکر ای وادی عسفان، قال لقد مر به هو ووصاله

تو آپ نے فرمایا: اے ابوبکر! یہ کونسی وادی ہے؟

حجفہ اور مکہ کے درمیان واقع ہے، مکہ سے دوسرے چلنے والے ۳۴ میل۔ اور حجفہ سے تین مرحلوں پر واقع ہے۔ اور عسفان سے ملل تک کو ساحل کہا جاتا ہے۔ اور ملل مدینہ شریف سے ایک دن کی مسافت پر ہے۔ اور معجم میں ہے کہ ”کہا جاتا ہے کہ عسفان ایک قریہ جامعہ ہے جہاں منبر ہے اور کھجوروں کے باغات اور کھیت ہیں۔ مکہ سے ۳۶ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور یہ تہام کی آخری حد ہے“ میں کہتا ہوں کہ یہ ان منازل میں سے چھٹی منزل ہے۔ جنہیں حافظ ابن قیمؒ نے ذکر کیا ہے۔ اور بخاری کی حدیث المساجد میں چھٹی منزل عسفان کے بجائے مرائظہ ان مذکور ہے۔ حافظ فرماتے ہیں۔ یہ میم کے فتح، راکئی نشید، غار کے فتح اور ما کے سکون کے ساتھ ہے۔ یہ وہی وادی ہے جس کو عام لوگ ”بطن مروہ“ اور راک کے سکون کے ساتھ اور اس کے بعد واؤ کہتے ہیں۔ ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ اس کے اور مکہ کے مابین ۱۶ میل کا فاصلہ ہے۔ اور معجم میں ہے کہ مرائظہ ان مکہ مکرمہ سے ایک مرحلہ پر ایک جگہ کا نام ہے۔ عزیز محمد رابع لکھتے ہیں کہ ”مرائظہ ان کو آج کل ”وادی فاطمہ“ کہا جاتا ہے۔ اور یہ نام کوئی دو سو سال سے پڑا ہے۔ فاطمہ ایک مشہور ترک خاتون کا نام ہے۔ اس جگہ اس کے باغات اور زمینیں تھیں۔ یہ مکہ سے ۲۵ کلومیٹر پر واقع ہے“

تو آپ نے فرمایا: اے ابوبکر! یہ کونسی وادی ہے۔ عرض کیا: وادی عسفان؛ زرقانی فرماتے ہیں۔ ”دریافت فرمانے سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ وادی عسفان ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سے کہلوانا مقصود ہو۔ اور یہاں یہ سوال نہیں ہوگا کہ ایسے موقعوں پر تو صحابہ کرامؓ کی عادت اللہ و رسولہؐ علم کہنے کی تھی۔ کیونکہ یہ عادت علمی امور میں تھی اور یہاں ایک محسوس کی خبر ہے۔ رہا یہ سوال کہ جب آپؐ نے خطبہ منیٰ میں فرمایا تھا ”ای بلدنا“ یہ کونسا شہر ہے؟ ”ای شہرنا“ یہ کونسا مہینہ ہے؟ باوجودیکہ یہ دونوں محسوس تھے۔ پھر صحابہؓ نے ”اللہ و رسولہؐ علم کیوں کہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس موقع پر صحابہ کرامؓ کا ”اللہ و رسولہؐ علم“ کہنا اس بنا پر تھا کہ شاید آپؐ ایسی خبر دیں جس کا انہیں علم نہ ہو۔ اہل وغیرہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے“

آپؐ نے فرمایا: اس وادی سے حضرت ہود

اور حضرت صالح علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام گذرے ہیں۔ درمشور میں ہے کہ عسفان میں حضرت

وادی عسفان سے حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کا تلبیہ کہتے ہوئے گزرنا

علی بکر بن احمد بن خطا صہا اللیف یلبون یحجون ۔
 دونوں جوان سرخ اونٹوں پر سوار تھے کچھ کچھ کی چال کتنی تلبیہ کہتے ہوئے حج بیت اللہ کو جا رہے تھے۔

ہود اور حضرت صالح علی نبینا علیہما الصلوٰۃ والسلام کی قبریں ہیں ۔ دونوں درجوان اور سرخ اونٹوں پر سوار تھے یعنی ہر ایک اپنے اپنے زمانے میں سرخ اور جوان اونٹ پر سوار تھے ۔ کیونکہ حضرت ہود کا زمانہ حضرت صالح علی نبینا علیہما الصلوٰۃ والسلام سے پہلے کا ہے ۔ جن کی چار خطام ؛ بکسر خائے معجمہ و فتح طائے مہملہ ۔ وہ رسی جو اونٹ کے منہ اونٹانک میں ڈالی جاتی ہے ۔ کھجور کی چھال کی تھی ۔ یہ ان حضرات کی تواضع مع اللہ تھی اور یہ تواضع اور سادگی انبیاء کرام علیہم السلام کی فطری جبلت ہے ۔ کذافی الزقانی تلبیہ کہتے ہوئے حج بیت اللہ کو جا رہے تھے ۔ یہ حدیث امام احمد نے مسند میں ذکر فرمائی ہے ۔ اور وہاں سے قسطلانی نے مواہب میں لی ہے ۔

میں کہتا ہوں اس پر دُرُ مَشْهُور کی روایت سے اشکال ہوتا ہے جس میں ہے کہ ”ہر نبی نے حج کیا“ بجز ہود اور صالح علیہما السلام کے کیونکہ یہ دونوں اپنی قوم کی مشغولی کی وجہ سے حج نہیں کر سکے۔“ جواب یہ ہو سکتا ہے کہ دُرُ مَشْهُور کی روایت مسند احمد کی روایت کے مقابل نہیں ہو سکتی کیونکہ مسند طبری نے اس کو دو طریقوں سے ذکر کیا ہے ۔ اول بیہقی فی الدلائل ازرقی اوسابن اسحاق کے حوالے سے عروہ کا قول نقل کیا ہے ۔ دوم جرح ازرقی عروہ سے مرسلاً نقل کیا ہے اور جرح میں کتاب الحج کے آغاز میں اس پر مفصل کلام کیا ہے ۔ اس میں ہے کہ ”عروہ بن الزبیر کے قول پر یہ اعتراض ہے کہ بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام نے حج کیا ہے ۔ نیز ایک جماعت کا قول ہے کہ تمام انبیاء نے حج کیا۔“ نیز اس میں روضۃ المحتاجین کے حاشیہ سے نقل کیا ہے کہ آپ کا یہ ارشاد کہ ”ہر نبی نے حج کیا۔“ اس میں قول معتقد کے مطابق ہود اور صالح علیہما السلام بھی داخل ہیں ۔ نیز اس میں ہے کہ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب عسفان پہنچے تو آپ نے فرمایا : ”یہاں سے ہود اور صالح علیہما السلام گذرے ہیں۔“ یہاں انہوں نے مسند احمد کی حدیث ذکر کی ہے۔

رقلت، وهناك سألہ سراقۃ بیانا واضحا فی الحج وقال، فلما کان بسرف
ترجمہ: (ش) اسی جگہ حضرت سراقہؓ نے آپؐ سے حج کے مسائل میں واضح بیان کی درخواست کی۔

رقی! پس جب کہ آپؐ موضع سرف پہنچے

دش، اسی جگہ حضرت سراقہؓ بن مالک بن حثیم
سراقہ کی جانب سے واضح بیان کی درخواست | رحیم اور شہین کے ضمہ کے ساتھ ان دونوں کے درمیان

عین ہملہ - مشہور صحابی ہیں۔ فتح مکہ میں اسلام لائے۔ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے ہجرت مدینہ کے
راستے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تعاقب کیا تھا۔ اس کا قصہ مشہور
ہے۔ کذافی البذل۔ میں کہتا ہوں اس واقعہ کو امام بخاری نے باب البجرت میں ذکر کیا ہے۔ اس میں
ہے کہ سراقہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس کفار قریش کے قاصد آئے۔ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی گرفتاری پر سو ہواؤں کا انعام رکھا تھا۔ یہ حدیث طویل ہے۔ اور
اس میں سراقہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعاقب کرنے، ان کے گھوڑے کے وحنس جانے اور آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے امان طلب کرنے کے واقعات مذکور ہیں۔ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے
حج کے مسائل میں واضح بیان کی درخواست کی۔ چنانچہ امام ابو داؤد نے باب الاقراں میں بلافاظ ذکر
کئے ہیں کہ جب ہم عسفان پہنچے تو سراقہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارے لئے مسائل حج کو ایسا
بیان کر دیجئے، جیسا کہ ان لوگوں کے سامنے کیا جاتا ہے جو گویا آج پیدا ہوئے۔

پس جب کہ آپؐ موضع سرف پہنچے، سرف: بین کے فتح اور رار کے کسر کے
منزل سرف | ساتھ منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔ مکہ سے چھ میل یا

ستہ میل یا بارہ میل پر ایک جگہ کا نام ہے۔ آخری دو قول صحیح نہیں۔ کذافی المرقاة۔ صاحب حمیس نے
۹ میل پڑھنا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ ایک معروف جگہ ہے۔ اس مقام کے عجائب میں سے یہ ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۃ القضا میں اسی جگہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ واپسی پر اسی
جگہ ان کی رخصتی ہوئی۔ اور جس درخت کے نیچے رخصتی ہوئی وہیں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی تدفین
ہوئی ان کی ذنات صحیح قول کے مطابق تمام ازواج مطہرات کے بعد اٹھارہ میں ہوئی جیسا کہ میرے
رسالہ مسکایات صحابہ میں ہے۔ وہاں ان کی قبر مشہور زیارت گاہ ہے۔

حاضرت عائشہ رضی اللہ عنہا
توحفہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ماہوار می شروع ہوئی۔

تو حضرت عائشہ کو ماہوار می شروع ہوئی۔ طبقات سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پہنچے مگر یہ واضح طور پر غلط ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں اتوار کے دن داخل ہوئے۔ نووی نے ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ حیض کا آغاز ۱۲ روزی الحجہ کو بردہ ہفتہ ہوا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ حج و احرام میں علماء

حضرت عائشہ کے حج میں اختلاف

کا نزاع ہے کہ آیا ان کا احرام حج مفرد کا تھا یا قرآن کا؟ اس کی تفصیل اوچیز میں ہے۔ اور اس کا خلاصہ لامع کے حاشیہ میں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: ”لو اذہبنا چاہیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے احرام اور کیفیت حج میں روایات مختلف ہیں۔ اسی بنا پر اس میں ائمہ کا اختلاف ہے جس کی تفصیل اوچیز میں ہے۔ اور اس میں ہے کہ شیخ ابن قیمؒ ”الہدیٰ“ میں فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ کے قصہ میں علماء کا نزاع ہے کہ ان کا احرام تمتع کا تھا یا صرف حج مفرد کا؟ اور اگر تمتع کا تھا تو کیا انہوں نے عمرہ فصیح کر دیا تھا اور حج مفرد کا احرام باندھ لیا تھا یا عمرہ پر حج کا احرام باندھ کر قرآن کر لیا تھا؟ اور جو عمرہ انہوں نے تنعیم سے کیا وہ ان پر واجب تھا یا نہیں؟ اور حضرت عائشہ کے قصہ پر جو مسئلہ مبنی ہے۔ اس میں بھی علماء کا اختلاف ہوا۔ اور وہ یہ ہے کہ جب عورت نے عمرہ کا احرام باندھا ہو اور اسے حیض آجائے اور عرفات میں جانے سے پہلے طواف نہ کر سکتی ہو تو کیا اسے عمرہ کا احرام فصیح کر کے حج مفرد کا احرام باندھنا چاہیے۔ یا عمرہ پر حج کا احرام باندھ کر قرآن کر لے؟ چنانچہ فقہار کوفہ جن میں امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب بھی شامل ہیں رحمہم اللہ پہلے قول کے قائل ہیں۔ اور فقہار حجازہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ رحمہم اللہ۔ دوسرے قول کے قائل ہیں اور یہی مذہب اہل حدیث مثلاً امام احمد اور ان کے متبعین کا ہے۔“

اوچیز میں حضرت عائشہ کے احرام کی روایات پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس میں ہے کہ شیخ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: صحیح بات جس سے عدول نہیں کیا جاسکتا یہ ہے کہ ابتدائاً ان کا عمرہ کا احرام تھا۔ جیسا کہ جمہور اس کے قائل ہیں اگرچہ ان میں اختلاف ہے کہ انہوں نے عمرہ کو فصیح کر دیا تھا یا اس پر حج کا احرام باندھ کر قرآن کر لیا تھا۔ اہم میں کہتا ہوں کہ پہلا قول حنفیہ کا ہے، اور دوسرا ائمہ ثلاثہ کا جیسا کہ ابھی گزرا۔ اور یہ اختلاف ایک دوسرے اختلاف پر مبنی ہے، وہ یہ کہ حنفیہ کے نزدیک قارن، عمرہ اور حج۔

دونوں کے افعال الگ الگ اور مستقل ادا کرتا ہے۔ چونکہ حضرت عائشہؓ کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وقت حج سے پہلے عمرہ کے افعال ادا کر سکیں لامحالہ انہیں عمرہ فسخ کر کے حج کا احرام باندھنا پڑا۔ اور ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ عمرہ کے افعال حج کے افعال میں داخل ہو جائیں گے۔ چونکہ حج سے پہلے وہ عمرہ کے افعال ادا نہیں کر سکتی تھیں اس بنا پر ان کے لئے گنجائش تھی کہ عمرہ کے احرام پر حج کا احرام باندھ لیں۔ تاکہ عمرہ کے افعال حج کے افعال میں داخل ہو جائیں۔

حضرت عائشہؓ نے عمرہ فسخ کر دیا تھا اس حنفیہ کے دلائل حنفیہ نے اپنے اس مدعا پر کہ حضرت عائشہؓ

ہے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: اپنے عمرہ کو چھوڑ دو۔ دوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا: اپنا سر کھول کر کنگھی کر لو۔ ظاہر ہے کہ احرام میں کنگھی کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ بالوں کے جھڑنے کا اندیشہ ہے۔ سوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: یہ تیرا عمرہ ہے اس عمرہ کی جگہ چہاں یہ کہ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا تھا: تم لوگوں نے عمرہ کر لیا میں نے نہیں کیا۔ پیچھے یہ کہ حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں: تم توجہ و عمرہ کر کے واپس جاؤ اور میں صرف حج لے کر جاؤں؟ مسند احمد کے لفظ جیسا کہ فتح میں ہے، یہ ہیں: اور میں صرف حج لے کر جاؤں جس کے ساتھ عمرہ نہ ہو؟ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ فرمایا کہ: عائشہؓ میں بھی تیری مثل ہوں۔ کیونکہ آپ بھی قادر تھے۔ اور بقول ائمہ ثلاثہ کے حضرت عائشہؓ نے بھی آپ کی طرح قرآن کیا تھا تو پھر حضرت عائشہؓ نے کیوں نہ فرمایا کہ تم حج و عمرہ لے کر جاؤ اور میں صرف حج لے کر جاؤں؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ فرمایا کہ جس طرح میرا قرآن ہے اسی طرح تیرا بھی قرآن ہے۔ علاوہ ازیں بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عمرہ فسخ کر دیا تھا۔ ان روایات کی تفصیل اوپر میں ہے۔ جامع الداسی میں۔ ائمہ ثلاثہ کے دلائل کے جوابات پر مختصر مگر بہت عمدہ کلام کیا ہے۔

حضرت عائشہؓ کے عمرہ متعمیم میں چار مسلک پھر شیخ ابن قیمؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے متعمیم سے جو عمرہ کیا تھا اس میں چار مسلک ہیں، اول یہ کہ محض

ان کی دلجوئی کے لئے تھا۔ یہ امام شافعیؒ اور امام احمد کا قول ہے۔ دوم یہ کہ یہ فسخ شدہ عمرہ کی قضائے۔ یہ حنفیہ کا مسلک ہے۔ سوم یہ کہ حیب انہوں نے قرآن کر لیا تو ایک مستقل عمرہ کا ادا کرنا ضروری تھا کیونکہ

رقال) اما موضع حیضہا فهو بسرف بلا ریب۔ و اختلف فی موضع طهرها ترجمہ: (رق) ان کے حیض کی جگہ تو بلاشبہ موضع سرف تھی۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کب پاک ہوئیں۔

قرآن کا عمرہ، عمرۃ الاسلام کی جگہ کافی نہیں ہوتا۔ یہ امام احمد سے ایک روایت ہے۔ چہاں یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے شروع ہی سے حج مفرد کا احرام باندھا تھا۔ اور وہ اسی احرام پر قائم رہیں۔ اس لئے یہ عمرہ، عمرۃ الاسلام تھا۔ یہ قاضی اسماعیل وغیرہ مالکیہ کی رائے ہے، اور یہ سب ضعیف نقل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے احرام کی تعیین بھی شدید مشکل مسئلہ ہے۔ زرقانی نے شرح موطایں اکمال کی پیروی کرتے ہوئے نیز حافظ نے فتح میں اور قاضی عیاض، نووی اور ابن قیم نے اس پر بحث کی ہے۔ امام محمد موطایں فرماتے ہیں اگر عائشہ نے عمرہ کا احرام باندھ رکھا ہو اور فوت حج کا اندیشہ ہو تو اسے چاہئے کہ عمرہ فسخ کر دے، حج کا احرام باندھ کر وقوف عرفہ کرے اور اس عمرہ کی قضا کرے جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا ۱۶۔

رقال) ان کے حیض کے آغاز کی جگہ تو بلاشبہ موضع سرف ہی تھی۔ میں ان کے طہر کی جگہ میں اختلاف کرتا ہوں کہ حضرت عائشہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ماہوار کی شکا موضع سرف میں کی تھی؟ جیسا کہ شیخ ابن قیم نے اس پر حزم کیا ہے۔ یا یوم الترویہ میں؟ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث کا مقتضی ہے اور اسی طرف زرقانی کا میلان ہے۔ یا کسی اور دن؟ جیسا کہ وجہ میں مفصل ذکر کیا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ کہاں اور کب پاک ہوئیں؟ چنانچہ بعض کا قول ہے کہ ہدف کے دن اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ان کو اسی حالت میں ہدف کا دن آگیا تھا۔ اور قاسم نے ذکر کیا ہے کہ یہ یوم النحر تھا۔ جیسا کہ ابہدی میں ہے اسی طرح نووی نے ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ ان کا طہر یوم النحر کو بروز مہفتہ ہوا تھا، حافظ نے مختلف روایتوں میں تطبیق اس طرح دی ہے کہ عرفہ میں انہوں نے طہر دیکھا لیکن منیٰ آنے سے پہلے غسل کا موقع نہ ہوا۔ یا یہ کہ خون عرفہ میں منقطع ہو چکا تھا۔ مگر طہر منیٰ میں اگر دیکھا۔ اور یہ توجہ زیادہ مناسب۔ اور شیخ ابن قیم فرماتے ہیں کہ ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے کہ وہ بطحا کی رات پاک ہوئیں۔ اور اس کی سند صحیح ہے۔ لیکن ابن حزم نے کہا ہے کہ یہ منکر ہے۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ اس میں مائل سے تصحیف ہوئی ہے۔ صحیح

وقال لا صحابه من لم يكن معه هدى فاحب ان يجعلها عمره فليفعل و
من كان معه هدى فلا

ترجمہ: اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا: جس کے ساتھ ہدی کے جانور نہیں
اگر وہ اس کو عمرہ بنا چاہتا ہے تو بنا لے اور جس کے ساتھ ہدی ہے وہ نہیں۔

داؤد حالیہ کے اضافہ کے ساتھ ہے یعنی بطحا کی رات آئی ورنہ ایک کہ حضرت عائشہ پاکؓ ہوجاں تھیں۔ چنانچہ
ابوداؤد ہی کی ایک روایت میں یہ لفظ ہیں: فلما كانت ليلة بطحاء وطهرت عائشة قالت
يا رسول الله صلى الله عليه وسلم

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موضع سرف

موضع سرف میں صحابہ کرام کو فسخ حج کا اختیار دینا | میں اپنے صحابہ سے فرمایا: جس کے ساتھ ہدی کے جانور

نہیں وہ اگر اس کو عمرہ بنا چاہتا ہے تو بنا لے اور جس کے ساتھ ہدی ہے وہ نہیں۔ کذا فی البدی
اور صحیحین کی روایت میں بھی اسی طرح ہے۔ اور سیرت ابن ہشام کے لفظ یہ ہیں: آپ جب موضع
سرف پہنچے تو لوگوں کو حکم فرمایا کہ وہ عمرہ کر کے احرام کھول دیں۔ سوائے ان لوگوں کے جن کے ساتھ
ہدی کے جانور ہیں۔ اور یہ تخییر ترمذی میں بالآخر تھی اس تخییر سے جو میقات میں دی گئی، کیونکہ میقات کی
تخییر یہ تھی کہ احرام کی مینوں صورتوں میں کوئی سی صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔ مگر یہاں فسخ حج کرنے یا نہ
کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ بعد ازاں صفا پر پہنچ کر فسخ حج کا قطعی حکم فرمایا جیسا کہ آتا ہے۔

یہاں شیخ ابن قیمؒ نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ کہ
حج کا احرام فسخ کر کے عمرہ بنالینے کا حکم | حج کو فسخ کر کے عمرہ بنالینا قیامت تک کیلئے جائز ہے اور اس

کے منسوخ نہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے اس کے دلائل دیئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ کے ذکر کرنا
یہ موقع نہیں تھا۔ اس کا موقع وہ تھا جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پر پہنچ کر فسخ حج کا حکم فرمایا
تھا۔ اور حضرت سراقہؓ نے آپ سے اس کے بارے میں سوال کیا تھا۔ مگر مصنف شیخ ابن قیمؒ نے یہ مسئلہ چونکہ

یہاں چھیڑا ہے اس لئے ان کی متابعت میں میں بھی اس کو یہیں ذکر کرتا ہوں۔ لامع کے حاشیہ میں باب
من اهل فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذیل میں اور جز سے نقل کیلئے کہ امام نووی فرماتے ہیں کہ اس
فسخ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا یہ صحابہ کرام کے ساتھ اسی سال کیلئے مخصوص تھا یا ان کے لئے

اور دوسروں کے لئے قیامت تک باقی ہے؟ امام احمد اور اہل ظاہر کے ایک گروہ نے دوسرے قول کو لیا ہے۔ اور امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام ابو حنیفہؒ اور جمہور سلف و خلف نے پہلا قول اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ صحابہؓ کے ساتھ اسی سال کے لئے مخصوص تھا۔ جاہلیت میں خیال کیا جاتا تھا کہ حج کے مہینوں میں عمرہ حرام ہے، جاہلیت کے اس خیال باطل کی تردید کے لئے صحابہ کرام کو فسخ حج کا حکم فرمایا۔ جمہور کی دلیل مسلم شریف میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ متعہ فی الحج صرف اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا۔ یعنی حج کو فسخ کر کے عمرہ بنا لیتا۔ اور نسائی میں ہے کہ عاتق بن صلال اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ: فسخ حج صرف ہمارے لئے خاص ہے یا سب لوگوں کیلئے عام ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں بلکہ ہمارے لئے خاص ہے۔ اور حدیث مرقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک لائید کا مطلب یہ ہے کہ اشرہ حج میں عمرہ جائز ہے۔ ابن رشد فرماتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ہمارے بعد کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ حج کا احرام باندھ کر اسے فسخ کر دے اور اسے عمرہ میں تبدیل کر دے۔ انتہی مختصراً۔ حضرت مرقہ کی اس حدیث پر رمی عقبہ میں کچھ مفصل بحث ہوگی۔ نیز حاشیہ لامع میں باب عمرۃ التنعیم کے ذیل میں بھی حدیث مرقہ کا جواب دیا گیا ہے۔ اور زرقانی نے بھی شرح و اسباب میں اس پر خوب مفصل کلام کیا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ حنفیہ پر خصوصیت سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ حج کے احرام کو فسخ کر کے عمرہ میں تبدیل کرنے سے جو مقصود تھا وہ ان کے مذہب کے مطابق یوں بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ حج پر عمرہ کے احرام کا اضافہ کر کے قرآن کریم لیا جائے۔ دوسرے ائمہ پر یہ اشکال نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کے نزدیک حج کے احرام پر عمرہ کا اضافہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کے ذیل میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ حنفیہ کی طرف سے یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ فسخ الی العمرہ سے مقصود عدم جاہلیت کو باطل کرنا اور اس پر تبدل رد و تکیہ کرنا تھا۔ ورنہ نفس جواز تو اسی سے ثابت تھا کہ بغض صحابہ کرامؓ نے میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھا، اور اس سے بھی واضح تر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سے پہلے مہینوں عمرے زمانہ حج میں ہوئے تھے۔ مگر اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فسخ حج کا حکم فرمایا تاکہ جاہلیت کے رواج کا پوری طرح قلع قمع ہو جائے۔

ر قال، ثم نهض الى ان نزل بذي طوى - فبات بها ليلة الاحد لاربع خلون من
ذی الحجۃ و صلی بها الصبح ثم اغتسل من یومہ -

ترجمہ: (ذ) پھر آپ چلے یہاں تک کہ ذی طوی میں نزل فرمایا پس وہاں رات کو قیام فرمایا۔ یہ چاندنی الحجہ
اتوار کی رات تھی۔ اوّل نماز صبح ادا کی۔ پھر اسی دن غسل فرمایا۔

ذ (ذ) پھر آپ چلے یہاں تک کہ ذی طوی میں نزل فرمایا۔

ذی طوی میں آپ کا غسل کرنا اور مکہ مکرمہ میں داخلہ کی تفصیل

اب "آباز راہرہ کے نام سے معروف ہے۔ کذا فی الہدی، اس
کے ضبط میں چند اقوال ہیں جو فتح میں مفصل مذکور ہیں۔ لایع کے حاشیہ میں ہے کہ اس امر میں بھی
اختلاف ہے کہ ذی طوی محصب، ابطح، بطحاء اور خیفہ، بنی کنانہ یہ سب ایک ہی جگہ کے
نام ہیں یا متعدد مقامات کے؟ نیز اس میں ہے کہ ذی طوی اسفل مکہ میں عمرہ کے معتاد راستہ
کی جانب ایک جگہ ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ مکہ اور تنعیم کے مابین ہے۔ اھ۔ امام بخاری رحمۃ اللہ
علیہ نے الجامع الصحیح میں "النزل بذي طوى" کا باب باندھا ہے، اور حاشیہ بخاری میں ہے کہ "طوی،
طاو کی تینوں حرکتوں کے ساتھ ایک جگہ ہے جو باب مکہ کے پاس ہے منصرف بھی ہے اور غیر منصرف
بھی۔ کذا فی الجمع۔ تاملی تاریخی شرح مؤطا میں فرماتے ہیں: "تنعیم کے راستہ میں ایک داوی ہے یہاں
امیر الحج کو قیام ہوتا ہے" اور المرأة کے حاشیہ میں ہے: "مکہ کی غری جانب ایک جگہ ہے" پس وہاں دونوں
گھاٹیوں کے درمیان رات کو قیام فرمایا۔ کما فی المواہب۔ اور بخاری کی حدیث المساجد کے الفاظ یہ:
"ان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذی طوی میں نزل فرماتے تھے اور وہاں صبح تک قیام کرتے تھے۔ اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز گاہ ایک بڑے پیلے پر ہے، وہاں جو مسجد بنی ہے، اس میں نہیں۔ بلکہ اس
سے نیچے ہے" یہ چار ذرا الحجہ اتوار کی تھی۔ اور یہ جمع علیہ ہے۔ اور وہاں نماز صبح ادا کی۔ پھر اسی دن غسل
فرمایا۔ اور اجز میں بروایت بخاری ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: "یہاں تک کہ جب وہ ابن عمر
ذی طوی آتے تو صبح تک وہاں رات بسر کرتے، پھر صبح کی نماز پڑھ لیتے تو غسل کرتے اور فرماتے تھے
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا تھا" یہ غسل بالیکہ کے نزدیک طواف کیلئے ہے۔ اس لئے عائضہ
نہیں کرے گی۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک دخول مکہ کیلئے ہے۔ جیسا کہ اجز میں ان کی فقہی کتابوں سے

ونہض الی مکة (قلت) ماراً علی وادی الازرق وقال کافی انظر الی موسیٰ
توجہ: اور مکہ کی طرف چلے (دش) وادی ازرق سے گزرتے ہوئے اور فرمایا: گویا میں موسیٰ علیہ السلام
کو دیکھ رہا ہوں۔

بالتفصیل نقل کیا ہے۔ اسی طرح حاشیہ کو کب میں بھی۔ اور غسل دخول مکہ کیلئے مستحب ہے۔ ابن منذر فرماتے
ہیں کہ دخول مکہ کے وقت غسل کرنا تمام علماء کرام کے نزدیک مستحب ہے۔ اور ان کے نزدیک اس کے ترک
سے فدیہ نہیں۔ اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ اس کی بجائے وضو بھی کافی ہے۔ کذا فی الفتح۔

اور مکہ کی طرف چلے (دش) وادی ازرق سے گزرتے
ارشاد نبوی: گویا میں موسیٰ کو دیکھ رہا ہوں | ہوئے۔ جو مکہ سے ایک میل ہے۔ حافظ فرماتے ہیں: یہ

آج سے پیچھے ہے۔ اور اجماع: ہمزہ اور میم کے فتح اور جیم کے ساتھ۔ وہاں ایک کھیتوں والی بستی ہے۔ اور
فرمایا گویا میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں۔ کما فی الموابہب۔ یہ مسلم شریف کے الفاظ ہیں۔ اور
بخاری میں بھی قریناً یہی مضمون ہے (یعنی) ما موسیٰ فکانی انظر الیہ اذا انحدر فی الوادی یلبی)
حافظ فرماتے ہیں کہ مہلب نے کہا ہے کہ اس روایت میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کسی راوی کا وہم ہے۔
کیونکہ کسی روایت میں یہ نہیں آیا کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ ہیں اور یہ کہ وہ حج کریں گے، البتہ
یہ مضمون عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں وارد ہوا ہے اس لئے راوی کو اشتباہ ہو گیا۔ حافظ فرماتے
ہیں: یہ نقد راویوں کی روایت کو محض وہم کی بنا پر غلط ٹھہرانا ہے۔ اسی مذکورہ سند سے یہ روایت کتاب
اللباس میں آ رہی ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کا اضافہ ہے۔ کیا یہاں بھی یہی کہا جائیگا کہ
راوی نے غلطی سے اس نام کا اضافہ کر دیا؟ اور امام مسلم نے یہ حدیث بطریق ابوالعالیہ حضرت ابن عباس
رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے جس میں موسیٰ علیہ کے علاوہ حضرت یونس علیہ السلام کا بھی ذکر ہے۔ کیا یہ کہا
جاسکتا ہے کہ دوسرے راوی نے غلطی سے یونس علیہ السلام کے نام کا اضافہ کر دیا؟ اور اہل تحقیق نے ارشاد
نبوی: گویا میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ اول یہ کہ یہ ارشاد حقیقت پر
محمول ہے۔ انبیاء علیہ السلام اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ لہذا کوئی مانع
نہیں کہ وہ اس حالت میں حج بھی کرتے ہوں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
موسیٰ کو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ مگر اس توجیہ کا ستم یہ ہے کہ کہا جائے کہ آپ

فَلَهُ جُورًا إِلَى اللَّهِ بِالتَّبْلِيَةِ رَقَالَ، فَدَخَلَ نَهَارًا
تَوَجَّهَ: دُرَاخًا لِيَكِدَهُ تَبْلِيَهُ كَتَبَتْهُ بُوْنُ بَلَدٍ أَوَّازٍ سَعَى اللّٰهُ تَعَالَى كَسَا نَسْنَى كَرُورًا هَاسَ هَاسَ هَاسَ -
(رق) پس آپ مکہ میں دن کو داخل ہوئے

کو انبیاء علیہم السلام کی ارواح کا مشاہدہ ہوا۔ غالباً وہ دنیا میں آپ کے سامنے اسی طرح متمثل ہوئی ہوں گی جس طرح شب معراج میں ہوئی تھیں۔ مگر ان کے اجسام قبول میں تھے۔ دوم یہ کہ ان حضرات کے ذہنی حالات آپ کے سامنے متمثل ہوئے یعنی دنیا میں جس طرح انہوں نے عبادت کی تھی حج کیا تھا، تلبیہ پڑھا تھا۔ اس کا کشف آپ کو ہوا۔ اسی وجہ سے آپ نے فرمایا: گویا میں دیکھ رہا ہوں: ”سوم یہ کہ بذریعہ وحی آپ کو ان امور کی اطلاع دی گئی اور وحی کی قطعیت کی بنا پر فرمایا: گویا میں دیکھ رہا ہوں۔ چہاں یہ کہ یہ ویت شاید آپ کو کسی گزشتہ خواب میں ہوئی ہوگی۔ پھر جب آپ نے حج کیا تو وہ خواب کا واقعہ یاد آیا اور اس کا تذکرہ آپ نے فرمایا۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہی توجیہ معتد ہے۔“ حافظ کا کلام مختصر اختتام ہوا۔ یہ توجیہات نووی نے شرح مسلم میں قاضی عیاض سے بھی نقل کی ہیں۔

دُرَاخًا لِيَكِدَهُ تَبْلِيَهُ كَتَبَتْهُ بُوْنُ بَلَدٍ أَوَّازٍ سَعَى اللّٰهُ تَعَالَى كَسَا نَسْنَى كَرُورًا هَاسَ هَاسَ هَاسَ -
ہیں: ”جور“ بضم جیم اور سہزہ مفتوحہ ممدودہ اور راء کے ساتھ یعنی بلند آواز۔ ابو نعیم کہتے ہیں: ”جور“ ایسی آواز کہ کہتے ہیں جس میں فریاد طبعی اور گروانا پایا جائے۔“ اور بخاری کی حدیث مساجد میں ذی طویل میں رات کے قیام کے بعد مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہاڑ کے دو کونوں کی طرف رخ کیا جو آپ کے اور طویل پہاڑ کے درمیان کعبہ کی جانب تھا پس اس مسجد کو جو وہاں بنائی گئی ہے، اس مسجد کے جو ٹیلے کے کنارے پر ہے، بائیں جانب کیا۔“

پس آپ مکہ میں دن کو داخل ہوئے جمہور کے نزدیک
مکہ میں دن کو داخل ہونا بہتر ہے یا رات کو؟

اس میں چار مذاہب جو اجز میں دو جگہ۔ یعنی باب غسل المحرم اور باب الحلاق میں ذکر کئے ہیں۔ اس میں ہے کہ امام مالکؒ اور حنفیہ کے نزدیک مکہ میں دن کو داخل ہونا مستحب ہے۔ شافعیہ سے بھی صحیح تر روایت یہی ہے۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ دن رات برابر ہیں۔ علامہ موفق اسی طرف مائل ہیں۔

من اعلاھا۔ ترجمہ: بالائی جانب سے۔

اور نووی نے بعض تابعین سے رات کی افضلیت نقل کی ہے۔ اور بعض نے امام اور غیر امام کے مابین فرق کیا ہے۔ یعنی جو شخص امام اور مقتدی ہو اس کے لئے دن کو داخل ہونا مستحب ہے۔ تاکہ لوگ اسکے عمل کو دیکھیں۔ امام بخاری نے الجامع الصحیح میں ترجمۃ الباب قائم کیا ہے۔ ”باب دخول مکہ نہاراً اولیلاً“ اور اس کے تحت ابن عمرؓ کی حدیث ذکر کی ہے جس میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دن کو داخل ہوئے اور اس میں رات کو داخل ہونے کی حدیث ذکر نہیں کی۔ میرے تراجم بخاری میں اس ترجمہ کے ثبوت کی متعدد توجیہات مذکور ہیں۔

بالائی جانب سے یعنی ثنیۃ علیا سے۔ عزیز محمد رابع ندوی لکھتے ہیں کہ آنحضرت کا اعلیٰ مکہ سے داخل ہونا ایسے جگہ آجکل ”معاہدہ“ کے نام سے معروف ہے یہاں شاہی محل ہے اور وہ آج کل رابطہ عالم اسلامی کا صدر دفتر ہے۔ اور یہی گھائی جبل حجوں پر جڑھتی ہے۔ البدی میں اسی طرح ہے۔ اور اجز میں ہے کہ ثنیۃ علیا وہ گھائی ہے جو اعلیٰ مکہ میں واقع ہے اور دہاں سے اعلیٰ اور مقابر مکہ کی طرف اترتے ہیں۔ یہ محصب کے پہلو میں ہے۔ اور اسی کو حجوں۔ حائے جملہ کے فتح اور حیم کے ضمہ کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ ”اھ اور معجم میں ہے کہ ”حجوں“ مکہ کی بالائی جانب ایک پہاڑ کا نام ہے جس کے پاس قبرستان ہے، بکری کہتے ہیں یہ جگہ بیت اللہ سے ڈیڑھ میل ہے۔ حافظ فرماتے ہیں حجوں کی چڑھائی دشوار تھی۔ حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد دیگر سلاطین نے اسے آسان بنایا حافظ نے اس سلسلہ میں اپنے زمانے تک ان سلاطین کے نام بھی ذکر کئے ہیں۔ اعلیٰ مکہ سے داخل ہونا جمہور کے نزدیک مطلقاً مندوب ہے۔ اور مالکیہ کے نزدیک صرف ایسے شخص کے لئے مندوب ہے جو راہ مدینہ سے آئے، خواہ وہاں کا باشندہ ہو یا نہ ہو۔ اور جو شخص کسی اور راستے آئے اس کے لئے یہاں سے داخل ہونا مستحب نہیں، خواہ وہ مدینہ طیبہ کا ہی باشندہ کیوں نہ ہو۔ کذا فی الاوجز۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ میں سفیل
آنحضرت عمرہ میں اعلیٰ مکہ سے داخل ہوئے یا سفیل مکہ سے؟

بذل میں ہے کہ اس سلسلہ میں حافظ ابن قیمؒ کا استدلال غالباً ابو داؤد کی اس روایت سے ہے جو بطریق بنام بن عروہ عن عائشہؓ مروی ہے اور جس میں یہ لفظ ہے کہ عمرہ میں آپؐ کدنی سے داخل ہوئے۔ مگر شیخ قدس سرہ نے بذل میں تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ روایت مضطرب ہے۔ اور علامہ عینی نے اس حدیث

قلت، وهل رفع يديه الكريمتين لما
توجه: اور جب بیت اللہ شریف پر آنحضرت صلی اللہ

پر جس میں یہ ہے کہ آپؐ کو راعنی اعلیٰ مکہ سے داخل ہوئے تھے، بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ مکہ میں نذیہ علیاد سے داخل ہونا مستحب۔ اور خروج پاؤں جانب سے بہتر ہے۔ حج وغیرہ کرنے والے اس میں یکساں ہیں، اٹھ تفصیل بذل میں ہے۔

شیخ ابن قیمؒ فرماتے ہیں جن لوگوں نے کہا کہ آپؐ منکحل کو مکہ میں
آپؐ کس دن مکہ میں داخل ہوئے

میں کہتا ہوں کہ ابن سعد کی جو روایت ابھی گذری کہ حضرت عائشہؓ مقام سرف میں سو مواری کے دن حائضہ ہوئیں، اس کا مقتضی بھی یہی ہے لہذا یہ بھی صریح غلط ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ کیونکہ تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ آپؐ مکہ مکرمہ میں ۴ ذی الحجہ کو بروز اتوار داخل ہوئے۔ منجملہ ان کے بخاری کی طویل حدیث ہے جو بروایت کریم بن عباسؓ مروی ہے۔ اس میں تصریح ہے کہ پس آپؐ مکہ میں تشریف لائے جب کہ ذی الحجہ کی چار راتیں گزر چکی تھیں، نیز بخاری میں ابن طاووسؓ عن امیہ کی سند سے ابن عباسؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: آپؐ ۴ ذی الحجہ کی صبح کوچ کا بلبلید پڑھتے ہوئے تشریف لائے۔ یہ روایت امام مسلم نے بھی ذکر کی ہے۔ اور نسائی میں بطریق ابی العالیہ ابن عباسؓ کی روایت کے لفظ یہ ہیں: جب کہ ذی الحجہ کی چار راتیں گزر چکی تھیں، نیز اسی میں حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے: آپؐ مکہ میں ذی الحجہ کی چوتھی رات کی صبح کو تشریف لائے، حضرت جابرؓ کی یہ حدیث ابو داؤد نے بھی دو طریقوں سے روایت کی ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے بروایت مسلم اس کو ذکر کیا ہے۔ اور امام بخاری نے بھی احکام میں اس کو روایت کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسفل مکہ سے نکلنے کے بیان میں اُسے لگا کہ آپؐ نے داخل ہونے اور نکلنے کے راستے کس مقصد کے لئے تبدیل فرمائے۔ نیز اس کا کچھ حصہ اس بحث میں آئے گا کہ آپؐ عرفات کو صُوب کے راستے سے تشریف لے گئے۔ اور مدائن میں کے راستے سے مراجعت فرمائی۔

ارشاد اور جب بیت اللہ شریف پر آنحضرت صلی اللہ

بیت اللہ کو دیکھنے کے وقت ہاتھ اٹھانا

وقع بصرہ علی البیت؛ اختلف فیہ الروایا، قال، ثم سار حتی دخل المسجد
ترجمہ: سلیم کی نظر پڑی تو آپ نے ہاتھ مبارک
مختلف میں رق (پھر آپ چلے یہاں تک کہ مسجد میں داخل ہوئے

علیہ السلام کی نظر پڑی تو آپ نے ہاتھ مبارک اٹھائے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ جن
کی تفصیل بدل اس کی تلخیص نیز البدایہ والنہایہ میں ہے، یہ رفع یدین النکۃ ثلاثہ کے نزدیک مستحب امام
مالک کے نزدیک مکروہ ہے۔ عجیب بات ہے کہ ملا علی قاری نے شرح مشکوٰۃ میں رفع کو اور شرح باب
میں عدم رفع کو ترجیح دی ہے۔ مختلف روایات میں تطبیق شیخ نے بدل میں ملا علی قاری سے اس طرح نقل
کی ہے کہ اثبات کو اول روایت پر اور نفی کو ہر مرتبہ کی روایت پر محمول کیا جائے شیخ قدس سرہ فرماتے
ہیں: "تطبیق بھی ممکن ہے کہ اثبات کی روایات سے مراد یہ ہے کہ دعا کے لئے دونوں ہاتھ پھیلائے اور ان
کو سینے تک اٹھایا، اور ترک رفع سے مراد ہے کہ جس طرح تحریم میں کانوں تک ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں
اس طرح تعظیم بیت اللہ کی خاطر نہیں اٹھائے"

رق، پھر آپ چلے یہاں تک کہ مسجد میں باب السلام سے داخل ہوئے مشکوٰۃ میں بحوالہ صحیحین حضرت
عائشہ سے مروی ہے کہ آپ جب مکہ میں تشریف لائے تو آپ نے سب پہلا کام یہ کیا کہ وضو فرمایا: ملا علی
قاری فرماتے ہیں: "یعنی وضو کی تجدید کی۔ کیونکہ پہلے گند چکا ہے کہ آپ دخول مکہ کے لئے غسل فرماتے
تھے، یا معنی لغوی مراد ہیں: اھ امام بخاری نے اس پر الطواف علی وضو کا باب باندھا ہے۔ گویا امام
بخاری کے نزدیک حدیث کا محمل یہ ہے کہ آپ نے طواف کی خاطر وضو پر وضو کیا تھا۔

طواف کے لئے طہارت ضروری ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں اختلاف
طواف کے لئے طہار کا حکم ہے۔ موثق کہتے ہیں: امام احمد کی مشہور روایت یہ ہے کہ طواف کے
لئے حدیث اور نجاست سے پاک ہونا شرط ہے۔ یہی امام مالک اور شافعی کا قول ہے۔ اور امام احمد
کی ایک روایت میں طہارت شرط نہیں، امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ طہارت شرط نہیں۔ ان کے اصحاب
میں اختلاف بعض کے نزدیک واجب اور بعض کے نزدیک تمت: اھ مختار۔ اور صاحب یاب نے حدیث سے پاک ہونے
کو مطلقاً طواف کے واجبات میں شمار کیا ہے۔

وذلك ضحى واستقبل ودعا. فلما دخل عمد الى البيت ولم ير كع تحية المسجد فلما حاذى الحجار الاسود استلمه -

ترجمہ: اور یہ چاشت کا وقت تھا اور آپ نے بیت اللہ کا استقبال کیا اور دعا فرمائی پس داخل ہوئے ہی بیت اللہ کا قصد کیا اور تحیۃ المسجد پڑھی اور جب حجر اسود کے سامنے آئے تو اس کا استلام کیا۔

باب السلام کی جانب سے مسجد میں داخل ہونا ملاحظہ فرمائیے، اور الہدی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باب بنی شیبہ سے داخل ہوئے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہیں۔ اور مرآۃ میں ہے کہ طبرانی نے ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنی عبد مناف کے دروازے سے داخل ہوئے۔ جسے آج کل باب بنی شیبہ یا باب السلام کہا جاتا ہے۔ اور یہ چاشت کا وقت تھا۔ اور آپ نے بیت اللہ کا استقبال کیا۔ اور دعا فرمائی۔ اور طبرانی نے ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت اللہ کو دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔

اللهم زد بيتك هذا تشریفًا وتعظيمًا اے اللہ اپنے اس گھر کی شرافت و عظمت اور تکریم و مہابت۔

بیت اللہ کو دیکھنے کی بوقت کی مختلف دعائیں روایات میں آئی ہیں جیسا کہ البدایہ والنہایہ وغیرہ میں مذکور ہیں۔

پس داخل ہوتے ہی بیت اللہ کا قصد کیا اور تحیۃ المسجد نہیں

مسجد حرام میں تحیۃ المسجد کا حکم پڑھی۔ کیونکہ کعبہ کا سلام طواف ہے جیسا کہ الہدی اور بذل میں ہے۔

موفق فرماتے ہیں: جو شخص مسجد حرام میں داخل ہوا اس کے لئے مستحب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے ہوئے طواف سے ابتدا کرے جیسا کہ حضرت جابر اور حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے۔ اور یہی حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ وغیرہ سے بھی منقول ہے۔ اور اس لئے کہ طواف مسجد حرام کا سلام ہے۔ پس جس طرح دوسری مساجد میں داخل ہو کر سب پہلے تحیۃ المسجد پڑھنا مستحب ہے اسی طرح یہاں طواف مستحب ہے۔

اور جب حجر اسود کے سامنے آئے تو اس کا استلام کیا

حجر اسود کا استلام اور اس کے آداب اور اسے بوسہ دیا۔ استلام کے معنی ہیں ہاتھ سے چھونا اور

حجر اسود کو بوسہ دینے کی روایات البدایہ والنہایہ میں مذکور ہیں اور ایک روایت میں سجاے کا بھی ذکر ہے، اور جن میں اس پر بڑی مفصل بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ گذشتہ بحث سے معلوم ہوا کہ یہاں چند مسائل میں اختلاف ہوا ہے، اول یہ کہ جمہور علماء مسئلہ استلام میں طواف واجب نفل کے درمیان

فرق نہیں کرتے۔ مالکیہ کی ایک جماعت بھی اسی کی قائل ہے۔ مگر المدونہ میں اسے طواف واجب کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ دوم تقبیل بالصوت یعنی اس طرح بوسہ لینا کہ اس کی آواز اُٹے اس کے جواز و عدم جواز میں اختلاف ہے، بہت سے مالکیہ کے نزدیک یہ مباح ہے اور جمہور علماء کے نزدیک نہیں۔ سوم حجر اسود پر سجدہ کرنا امام مالک کے نزدیک مکروہ اور امام شافعی کے نزدیک مستحب ہے حنفیہ کے اقوال اس میں مختلف ہیں۔ راجح یہ ہے کہ مندوب ہے۔ چہارم: ہاتھ وغیرہ سے حجر اسود کا استلام کرنے کے بعد اس کا جو منانہ ثلثہ کے نزدیک مندوب ہے۔ اور امام مالک کے نزدیک یمندوب نہیں بلکہ بغیر تقبیل کے ہاتھ چھوڑ دے۔ پنجم: اگر استلام ممکن نہ ہو تو امام مالک کے نزدیک بغیر اشارے کے تکبیر کہے، اور امام احمد کے نزدیک صرف اشارہ کر کے مگر جس چیز سے اشارہ کیا ہے اسے چومے نہیں۔ اور امام شافعی اور حنفیہ کے نزدیک اس چیز کو چوم لے۔ اھ

شیخ ابن قیم فرماتے ہیں: استلام کے وقت ہاتھ نہ اٹھائے نہ اسے تکبیر کے ساتھ شروع کرے جیسا کہ نماز کیلئے تکبیر کہی جاتی ہے۔ بلکہ ایسا کرنا بدعت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بدعت نہیں بلکہ تکبیر جمہور علماء کے نزدیک ثابت ہے۔ بلکہ بالاجاز ثابت ہے اور تقبیل کے وقت ہاتھ اٹھانا حنفیہ اور بعض شافعیہ کے نزدیک ثابت ہے۔ چنانچہ ہادیہ میں ہے: پھر حجر اسود سے ابتداء کرے پس اس کا استقبال کرے اور تکبیر و تسبیل کہے۔ کیونکہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو حجر اسود سے ابتداء کی پس اس کا استقبال کیا اور تکبیر و تسبیل کہی۔ اور اپنے ہاتھوں کو اٹھائے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صرف سات موقعوں پر ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں۔ من جملہ ان کے استلام کو ذکر فرمایا اور مفکرۃ العالم مطبوعہ حلب ۱۳۸۹ھ میں ہے کہ: استلام کے وقت ہاتھ اٹھانا ثلثہ کے نزدیک سنت ہے۔ البتہ امام مالک کے نزدیک مستحب نہیں۔ اھ اور المدونہ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، علامہ ندائی شرح مواہب میں لکھتے ہیں: امام شافعی، حنابلہ اور ابن حبیب مالکی کے نزدیک یہ مستحب ہے کہ ابتداء طواف اور استلام حجر کے وقت یہ دعا پڑھے، بسم اللہ واللہ اکبر الخ دیہاں پوری دعا نقل کی ہے، اور تدبیر فرماتے ہیں کہ تقبیل کے ساتھ تکبیر کہنا معتمد ہے۔ مگر دروید اور شارح اقطاع نے رفع یدین کا ذکر نہیں کیا۔ اور نووی اپنے مناسک میں فرماتے ہیں: استلام حجر سے پہلے نیز طواف شروع کرتے وقت بسم اللہ واللہ اکبر کہنا مستحب ہے۔ ابن حجر اس کے حاشیہ

ورمل فی طوافہ هذا۔

ترجمہ: اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طواف میں رمل کیا۔

میں لکھتے ہیں: ”محب طبری نے کہا ہے کہ طواف کو تکبیر سے شروع کرنا واجب ہے۔ بعض لوگوں نے ان کی پیروی کی ہے۔ مگر یہ قول ضعیف ہے، غالباً انہوں نے یہ قول دلیل کی وجہ سے اختیار کیا ہے۔ اور شیخ ابو حامد کا یہ قول بھی کہ ”ابتداء طواف میں نماز کی طرح کندھوں تک اٹھانا منہوں ہے“ ضعیف ہے۔ مگر یہ قول نقل کے اعتبار سے ضعیف ہے دلیل کے اعتبار سے ضعیف نہیں۔ اگرچہ ابن جامع نے اسے بدعت کہا ہے، کیونکہ مذاہب اربعہ اس پر متفق ہیں۔ مگر استقبال حجر کے وقت ہاتھ اٹھانا خفیہ کے نزدیک اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ سلف کی ایک جماعت سے یہ عمل ثابت ہے۔ اور ابو ذرؓ نے اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے اور ان کا طواف کو نماز پر قیاس کرنا، اس کے شروط اور اکثر سنن میں اس کا مؤید ہے“ اھ

اور آپ نے اس طواف کے پہلے تین چکر رمل میں رمل کیا، البدایہ والنہایہ نے اس سلسلہ کی روایات کی تفصیل سے ذکر کی ہیں۔ اور رمل کے مسئلہ پر اربعین نیز میرے حاشیہ پزل میں سات چھین ذکر کی گئی ہیں۔

اول: اس کے ضبط اور معنی میں پس رمل (رمل اور میم کے فتح کے ساتھ اور بقول بعض میم کے سکون کے ساتھ) کے معنی یہ ہیں کہ چھوٹے چھوٹے قدم لے کر کندھے ہلاتے ہوئے تیز تیز چلے، مگر دوڑے نہیں۔ اس کی تفسیر میں علماء کا اختلاف البحر العیق میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

دوم: اس کی مشروعیت میں جمہور کے نزدیک یہ مشروع ہے، البتہ ابن عباسؓ سے اس کے خلاف منقول ہے۔ علامہ ابی فراتے ہیں کہ ابن عباسؓ کا مذہب یہ ہے کہ یہ سنت نہیں۔ مگر دیگر علماء اسے سنت قرار دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ امام ابو داؤد نے ابو الطیفیل سے روایت کیا ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے عرض کیا کہ آپ کی قوم کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کے طواف میں رمل کیا تھا، اور یہ سنت ہے، فرمایا: انہوں نے ایک بات صحیح کہی اور ایک غلطی میں نے کہا صحیح کیا اور غلط کیا؟ فرمایا: یہ تو صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمل کیا تھا، مگر یہ غلط ہے کہ یہ سنت ہے، ایک روایت میں ان سے ابتدا برمل کا یہ سبب منقول ہے کہ قریش مسلمانوں کے باطن

واضطباع بردائہ،

توجہ: اور اپنی چادر کا اضطباع کیا۔

چھٹری کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کرتے اور استلام کرتے اور اسے جوم لیتے۔

میں یہ کہتے تھے کہ یہ تو برنوں کی طرح لاغر ہیں، ابن عباسؓ نے فرمایا اس بنا پر رمل منون ہوا۔
سوم: اس کے حکم میں: جمہور کے نزدیک یہ سنت ہے مگر اس کے ترک سے کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔ البتہ امام مالکؒ سے ایک روایت ہے کہ جب تک مکہ میں رہے اس کا اعادہ کرے۔ بعد میں انہوں نے اس روایت سے رجوع کر لیا تھا۔ ابن الماجشون سے روایت ہے کہ اس کے تارک پر دم واجب ہے۔ اور ابن حزم اس کے وجوب کی طرف مائل ہیں۔

چہام: رمل جمہور کے نزدیک چاروں طرف ہوگا: ائمہ اربعہ کا مسلک بھی یہی ہے البتہ تابعین کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ رکنین کے درمیان رمل نہیں۔ یہی امام شافعیؒ کی ایک ضعیف روایت ہے۔

بخیم: آیا یہ صرف آقائی کے ساتھ مخصوص ہے یا کئی بھی رمل کرے؟ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک کئی اور غیر کئی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ مگر امام احمد فرماتے ہیں کہ اہل مکہ کے ذمہ رمل نہیں۔

ششم: خنابلہ کے نزدیک رمل صرف طواف قدوم میں ہو سکتا ہے۔ امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے، مگر ان کا صحیح قول یہ ہے اور ہمارا قول بھی یہی ہے کہ رمل ہر اس طواف میں ہو سکتا ہے جس کے بعد سعی ہو۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ طواف قدوم میں کرے اگر اس میں نہیں کیا تو طواف زیارتہ میں کرے۔ ہفتم: جس طرح پہلے تین چکروں کا وظیفہ رمل ہے۔ اسی طرح تیس چکروں کا وظیفہ سکون و وقار ہے۔

اسی بنا پر حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ: رمل کا تذکرہ مشروع نہیں، پس اگر پہلے تین چکروں میں رمل نہیں کیا تو باقی چار میں اس کی قضا کرے کیونکہ انکی مینیت سکون ہے۔ اس میں تبدیلی نہ کی جائے۔
اضطباع کا حکم | اور اپنی چادر کا اضطباع کیا، بادل میں مجمع سے نقل کیا ہے کہ اضطباع کے معنی یہ ہیں کہ چادر کا درمیانی حصہ داہنی نعل کے نیچے سے نکال کر اس کے دونوں کنارے بائیں کندھے پر آگے پیچھے لٹکائے جائیں۔ اس کو اضطباع اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے فٹوں

وكلما حاذى الحجر الاسود اشار اليه واستلمه بالمحجن وقبلة
ترجمہ : اور جب رطواف کرتے ہوئے حجر اسود کے برابر آتے تو

پہلو ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور حاشیہ اوچر میں ہے کہ موفق لکھتے ہیں: اضطباع طواف قدوم میں مستحب ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ سنت نہیں، خفیہ بھی اس کی سنیت کے قائل ہیں۔ جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ اور جب رطواف کرتے ہوئے حجر اسود کے برابر آتے تو چھری کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کر کے اس کا استلام کرتے اور اسے جوم لیتے۔ اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف گذر چکا (حق) ان لوگوں کو دوہم ہوا ہے جنہوں نے یہ کہا کہ آنحضرت صلی اللہ رکن یمانی کی تقبیل ثابت نہیں | علیہ وسلم طواف میں رکن یمانی کی تقبیل فرماتے تھے، تقبیل تو حجر اسود ہی کی ہے، چونکہ حجر اسود کو اور اس کے پاس والے رکن کو ملا کر یمانیین کہا جاتا ہے، اس لئے بعض نے تنہا حجر اسود کو بھی یمانی سے تعبیر کیا۔ البتہ یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکن یمانی کا استلام کیا، مگر یہ ثابت نہیں کہ اس کو بوسہ بھی دیا۔

(مش) بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ طواف پیدل کیا جائے یا سواری پر | وسلم نے اونٹنی پر طواف کیا۔ جیسا کہ ہدایہ میں ہے شیخ ابن ہما نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ آپ نے اس حج میں متعدد طواف کئے تھے۔ صاحب البدایہ والنبایہ نے یہی توجیہ امام شافعی سے نقل کی ہے تفصیل آگے آتی ہے۔

رہا یہ کہ طواف پیدل کرنا واجب ہے یا مستحب؟ ابن قیم کہتے ہیں کہ پیدل چلنا مستحب ہے اور لماعی قاری کے مناسک میں ہے کہ واجب ہے۔ اوچر میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ موفق فرماتے ہیں: اس میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ غدر کی حالت میں سواری پر طواف کرنا صحیح ہے۔ باقی رہا بغیر غدر کے سواری پر یا کسی کے کندھے پر سوار ہو کر طواف کرنا؟ سو خرقی کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں، یہ امام احمد کی ایک روایت ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ صحیح ہے۔ اور یہی امام مالک کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ مگر وہ فرماتے ہیں کہ جب تک مکہ میں ہے اس کا اعادہ کر لے اور اگر اعادہ کئے بغیر واپس آگیا تو دوم دے کر اس کی تلافی کرے۔ امام احمد کی میسر یہ روایت یہ ہے کہ صحیح ہے اور اس کے ذمہ کچھ لازم نہیں۔ یہی امام شافعی کا مسلک ہے۔ اس میں اختلاف نہیں کہ پیدل طواف کرنا افضل ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ موفق نے

فلتأ فرغ من طوافه۔

ترجمہ: پس جب طواف سے فارغ ہوئے۔

امام ابو حنیفہؒ کا جو مذہب نقل کیا ہے امام مالک کے مذہب میں بھی یہی رائج ہے کہ جب تک مکہ میں ہوا عادہ کرے اور اگر کوئی لوٹ آیا تو دوم واجب ہوگا۔ جیسا کہ وسوقی نے لکھا ہے: تفصیل اور جزئی ہے۔ شیخ قدس سرہ نے کوکب میں اس پر نہایت عمدہ کلام کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر طواف کیا یہ ہمارے نزدیک غدر کی بنا پر جائز ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غدر تھا کہ ہجوم کی وجہ سے لوگ آپ کے پیدل طواف کرنے میں تنگی محسوس کرتے تھے۔ نیز اسکی ضرورت بھی تھی تاکہ لوگ آپ کے افعال کو دیکھیں اور آپ ان کے سوالات کا جواب دیں، اندر یہ ساری چیزیں سواری ہوئے بغیر ممکن نہیں تھیں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہی سمجھا تھا، چنانچہ آپ کے بعد انہوں نے بلا عذر سواری پر طواف نہیں کیا۔

حضرت شیخ قدس سرہ کے کلام کی تائید مندرجہ ذیل روایات سے ہوتی ہے۔ امام مسلم اور ابو داؤد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اذنتی پر طواف کیا۔ آپ چھڑی کے ساتھ حجر اسود کا استلام کرتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ آپ کو دیکھ سکیں اور آپ اذینچے نہیں اور لوگ آپ سے مسائل دریافت کر سکیں، کیونکہ آپ کے گرد انسانوں کا ہجوم تھا۔ اور ابو داؤد میں حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ: آپ کو یہ گوارا نہیں تھا کہ لوگوں کو مار مار کر آپ سے بٹایا جائے اور ابو داؤد میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ تشریف لائے در آنحالیکہ آپ علیل تھے۔ پس آپ نے اپنی اذنتی پر طواف کیا، اللہ! اس حدیث کو یہ بھی نے ضعیف اور زلیغی نے قوی کہا ہے۔ اس علت کی طرف امام بخاریؒ نے باب الریض یطوف راکباً میں اشارہ کیا ہے جیسا کہ قاضی عیاضؒ نے کہا ہے، اور نوویؒ نے انکی پیروی کرتے ہوئے فرمایا: کہا، احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر طواف کرنا ان تمام اسباب کی وجہ سے ہوا ہوا تھا۔

پس جب آپ طواف سے فارغ ہوئے۔ ہمارے نزدیک یہ طواف عمرہ

طوافِ قدم کا حکم تھا، اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو فتح میں داؤدی سے نقل کیا ہے کہ یہ طواف فراغت حج میں سے تھا، اور دیگر حضرات کے نزدیک یہ طوافِ قدم تھا۔ طوافِ قدم کے حکم

جاء الی خلف المقام توجہ: تو مقام ابراہیم کے پیچھے آئے

میں اختلاف ہے جیسا کہ اجز اور میرے حاشیہ نذل میں اس پر مختصر کلام کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ امام احمد کے نزدیک سنت ہے۔ جیسا کہ المغنی میں ہے، امام مالک کے نزدیک واجب ہے۔ امام شافعی سے موقوف نے وجوب نقل کیا ہے، مگر شافعیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ سنت ہے جیسا کہ شرح ہندب اور مناسک نووی میں ہے، اور ہمارے (حنفیہ کے) نزدیک سنت ہے جیسا کہ تمام معتبر کتابوں میں ہے، البتہ نزائۃ المفتین میں اس کا وجوب نقل کیا ہے، جیسا کہ شرح لباب میں ہے۔ یہی بحث کہ آیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طوافِ قدوم کیا تھا؟ طحاوی کا جواب بظاہر نفی میں ہے، اور جن حضرات نے یہ کہا ہے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔ کہ اس طوافِ مذکور کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے قریب نہیں گئے ان کے قول کا مفہوم بھی یہی نفی ہے، مگر حنفیہ کے مسلک کے مطابق یہ محل اشکال ہے کیونکہ ان کے نزدیک قارن کے لئے آتے ہی دو طواف ضروری ہیں۔ طوافِ عمرہ اور طوافِ قدوم۔ جیسا کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں مذکور ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان چار دنوں میں کئی طواف کئے ہوں گے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اقامتِ منیٰ کے دوران بھی طواف ترک نہیں کیا۔ جیسا کہ آگے آتا ہے، لہذا یہ بعد از قیاس ہے کہ اقامتِ مکہ کے دوران بھی پھوڑ دیا ہو۔ تو مقام ابراہیم کے پیچھے آئے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ صحیح قول کے مطابق مقام ابراہیم آج بھی اسی جگہ ہے۔ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا۔ اور سالم کی وہ روایت غریب ہے جس میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو پیچھے ہٹا کر موجودہ جگہ رکھا تھا، اے حافظ فرماتے ہیں کہ ازرقیؒ نے اخبار مکہ میں صحیح سندوں سے روایت کیا ہے کہ مقام ابراہیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں اسی جگہ تھا جہاں آج ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں سیلاب آیا تھا جو اس کو بہا کر لے گیا یہاں تک کہ اسفلِ مکہ سے ستیاب ہوا، اور اسے لاکر کعبہ شریف کے غلاف سے باندھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ تشریف لائے پس اس کے معاد میں نقیض فرمائی، جب اس کی پہلی جگہ کی تحقیق ہو گئی تو اسے دوبارہ اسی جگہ رکھا اور اس کے گرد تعمیر نوائی۔ پس جب سے اب تک اسی جگہ قائم ہے۔ اے میں کہتا ہوں کہ آج ۱۳۹۰ھ تک وہ اپنی جگہ موجود ہے۔

فقراء“ واتخذوا من مقام ابراهيم مصلیٰ و صلی رکعتین فلما فرغ من صلوٰتہ استلم الحجر الاسود ،

ترجمہ: پس یہ آیت پڑھی اور بناؤ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ اور دو رکعتیں ادا کیں پس جب اپنی نماز سے فارغ ہوئے تو حجر اسود کا استلام کیا۔

پس یہ آیت پڑھی: اور بناؤ مقام ابراہیم، کو نماز کی جگہ اور دو رکعتیں یا اس کیفیت ادا کیں کہ مقام ابراہیم آپ کے اور بیت المقدس شریف کے درمیان تھا۔ اور ان دو رکعتوں میں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص پڑھی، جیسا کہ مسلم اور ابوداؤد وغیرہ میں حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں ہے۔

دو گانہ طواف کا حکم | خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک واجب اور امام احمد کے نزدیک

سنت ہے۔ شافعیہ کے دو قول تو یہی ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ طواف واجب ہو تو یہ بھی واجب ہے ورنہ سنت۔ مالکیہ کے تین قول تو یہی ہیں۔ اور ان کا چوتھا قول یہ ہے طواف واجب کے بعد ہو تو واجب ہے ورنہ تردد ہے۔ امام شافعی کے نزدیک فرض نماز دو گانہ طواف کے قائم مقام ہو سکتی ہے، امام ابو حنیفہ اور مالک کے نزدیک نہیں ہو سکتی۔ اور امام احمد سے دونوں روایتیں ہیں۔

طواف سے فارغ ہو کر حجر اسود کا استلام کرنا اور زمزم پینا | پس جب اپنی نماز سے فارغ ہوئے تو حجر اسود کا استلام کیا۔ یہ استلام ائمہ

اربعو سب کے نزدیک مستحب ہے۔ موثق فرماتے ہیں کہ ہمیں اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں جیسا کہ اوجز میں ہے، اور اوجز میں ہدایہ سے نقل کیا ہے کہ جس طواف کے بعد سعی ہو اس میں استلام مستحب ہے، کیونکہ جس طرح طواف استلام سے شروع ہوتا ہے اسی طرح سعی بھی: اھ۔ ملا علی قاریؒ؟ استلام کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں: بلکہ یہ بھی صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجر اسود کی طرف لوٹنے کے بعد زمزم پئے اور پانی پیا اور اپنے سر مبارک پر بھی ڈالا۔ پھر لوٹ کر حجر اسود کا استلام کیا: اھ میں کہتا ہوں کہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمزم پینے کی روایت مناسک حج کی کتابوں میں تو ابھی تک مجھے نہیں ملی۔ البتہ الدرر الدری نے سنن سعی میں دو گانہ طواف کے بعد تقبیل حجر کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے: اور مندوب ہے کہ زمزم پر جائے اور اس سے پانی پئے، پھر سعی کے لئے نکلے۔

ثم يخرج الى الصفا. فلما دنا منه قرا: "ان الصفا والمروة من شعائر الله" ابدأ بما بدأ الله به. فرتى عليه

ترجمہ: پھر صفا کی طرف نکلے۔ پس جب اس کے قریب پہنچے تو یہ آیت پڑھی: "ان الصفا والمروة من شعائر الله" اور فرمایا میں اسی سے ابتدا کروں گا جس کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکر کیا ہے، پس صفا پر چڑھے

یہ دستور زیر قلم نقیصہ کہ مسند احمد میں حضرت جابرؓ کی حدیث دیکھی جس میں طواف کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمزم شریف پینے کا ذکر ہے، جس سے ملا علی قاریؒ کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ طواف افاضہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمزم شریف پینا معروف ہے، اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ اور وہیں یہ بات بھی آئے گی کہ زمزم شریف کوثر سے افضل ہے اور زمزم شریف ساتھ لانے کا بیان آخر رسالہ میں آئیگا۔

پھر صفا کی طرف باب صفا سے نکلے، چنانچہ طبرانی کی باب صفا سے صفا کی طرف نکلنا معجم صغیر میں حدیث جابرؓ کے لفظ یہ ہیں "پھر نکلے باب صفا سے" اور نسائی میں ابن عمرؓ سے مروی ہے: "پھر نکلے صفا کی طرف اس دروازے سے جس سے دصفا کی طرف نکلا جاتا ہے" نو دوحیٰ اپنے مناسک میں فرماتے ہیں کہ اس دروازے سے نکلنا سنت ہے۔ مگر صاحب ہدایہ نے اس سے انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ: "اور جس دروازے سے چاہے نکلے" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باب صفا سے اس لئے نکلے تھے کہ صفا کو جانے کا قریب تر دروازہ یہی تھا، نہ اسلئے کہ یہ سنت ہے" اور صاحب کتاب نے بدائع وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ یہ مستحب ہے، اسی طرح الموفق نے بھی المغنی میں اس کا استحباب ذکر کیا ہے۔

پس جب اس کے قریب پہنچے تو یہ آیت پڑھی: "ان الصفا والمروة من شعائر الله" اور فرمایا: میں اسی سے ابتدا کروں گا۔

صفا سے سعی کی ابتدا کرنا جس کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکر کیا ہے۔ صفا سے سعی کی ابتدا کرنا جمہور کے نزدیک واجب ہے، ائمہ اربعہ بھی اس پر متفق ہیں، بلکہ اس پر اجماع نقل کیا گیا ہے۔ علما فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے مودہ سے ابتدا کی تو اس پھرے کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ صفا سے مودہ تک پہلا پھیرا ختم ہوگا، اس میں بعض تابعین اور بعض غائبوں کا اختلاف ہے، جیسا کہ اوپر میں مفصل مذکور ہے۔ پس صفا پر چڑھے۔ صفا پر استقر

ودعا، ثم نزل الى المردوة يمشى فلما انصبت قدماه في بطن الوادي سعى -
اور دعائیں کیں۔ پھر مردہ کی طرف اتر کر مقدار رفتار سے چلے۔ اور جب قدم مبارک وادی کے
اندر پہنچے تو تیز رفتار سے چلے۔

چڑھنا کہ بیت اللہ شریف نظر آئے ائمہ اربعہ کے نزدیک سنت ہے۔ البتہ بعض شوافع کا اس میں اختلاف
ہے۔ جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ اور ہدایہ میں ہے کہ دیس اتنا چڑھے کہ بیت اللہ نظر آنے لگے کیونکہ
چڑھنے سے مقصود صرف بیت اللہ کا استقبال ہے۔ ”احمد اور مختلف دعائیں کیں۔ جو احادیث میں
وارد ہیں، بہت سی کی روایت میں ہے کہ صفائیں جو شگاف ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس پر کھڑے
ہوئے اور فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، جن پر سورۃ بقرہ
نازل ہوئی اسی جگہ کھڑے تھے۔ پھر اتر کر مردہ کی طرف مقدار رفتار سے چلے اور جب قدم مبارک وادی
کے اندر پہنچے تو تیز رفتار سے چلے، جیسا کہ حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں ہے۔ وادی کی ڈھلان
سے مراد اس زمانہ میں میلین اخضرین کا درمیانی حصہ ہے۔ کیونکہ یہ ڈھلان ایک زمانے سے باقی نہیں رہی۔
اس حصہ کے اندر قدسے تیز رفتار سے دوڑنا سنت ہے۔

میلین اخضرین کے درمیان دوڑنا | اور اس سے پہلے صفا کی جانب اور اس کے بعد مردہ کی
طرف مقدار رفتار سے چلنا جمہور کے نزدیک سنت ہے۔ جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے ذکر کیا گیا
ہے، اور اس میں اقوال مختلف ہیں، ان کی تفصیل بھی اوجز میں ہے۔ اوجز میں باجی سے نقل کیا ہے
کہ اگر کسی نے بطن وادی میں سعی نہیں کی تو اس کے بارے میں امام مالکؒ کے قول مختلف ہیں۔ ان سے
ایک روایت یہ ہے کہ اس کے ذمہ دم واجب ہوگا۔ پھر اس قول سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے
ذمہ کچھ نہیں، ابن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ ”جو شخص سعی کے دوران دوڑا نہیں اس کے بارے میں امام مالکؒ
کے قول مختلف ہیں، کبھی فرمایا کہ اعادہ کرے، کبھی فرمایا کہ اعادہ کی ضرورت نہیں، کبھی فرمایا کہ اس کے ذمہ دم
ہے، کبھی فرمایا کہ اس کے ذمہ کچھ نہیں، فقہ مالکی کی کتابوں میں تیز چلنے کو مسنون لکھا ہے۔ اور نوویؒ فرماتے
ہیں کہ ”اس مقام میں تیز چلنا ساتوں چکروں میں مستحب ہے، اور اس کے ماقبل و مابعد میں مقدار رفتار سے
چلنا مستحب ہے“ تاہم اگر تمام سعی آہستہ چل کر کی یا تمام دوڑ کر کی تب بھی کفایت کریگی، مگر اس سے
فضیلت فوت ہوگئی یہ امام شافعیؒ اور ان کے موافقین کا مذہب ہے، ”اھ موقوف فرماتے ہیں: بطن وادی

کے اندر دوڑ کر چلنا سنت مستحب ہے اور اس کے تارک پر کچھ نہیں کیونکہ اگر بیت اللہ کے طواف میں رمل نہ کرے تو کچھ لازم نہیں آتا، پس صفارہ کے درمیان اگر رمل نہ کرے تو بدرجہ اولیٰ کوئی چیز واجب نہیں ہونی چاہیے، میں کہتا ہوں کہ یہی حکم خفیہ کے نزدیک ہے۔ جیسا کہ ان کی فقہی کتابوں میں موجود ہے۔ انتہی لمخصاص من الادب جز۔

اس حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طواف اور سعی دونوں پیدل تھے۔ اور مسلم

آنحضرت کی سعی پیدل تھی یا سواری پر؟

شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ آپ نے طواف اور سعی سواری پر کی تھی۔ ادیشخ ابن عربی نے محاضرة الابرار میں اسی پر جزم کیا ہے، ابن حزمؒ نے ان دونوں کے درمیان یوں تطبیق دی ہے کہ جب اونٹ سوار کو لے کر وادی میں اترتا تو گویا سوار خود اتر گیا اس لئے یہ کہنا صحیح ہوا کہ آپ کے قدم بطن وادی میں اترے، اور حافظ ابن قیمؒ نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ آپ نے پہلے پیدل سعی شروع کی ہوگی، بعد میں سوار ہو گئے ہوں گے۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے اسی پر جزم کیا ہے۔ اور اس کی تائید مسلم شریف کی اس روایت سے ہوتی ہے جو ابوالطفیل سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ مجھے یہ بتائیے کہ صفارہ کی سعی سواری پر سنت ہے یا کہ نہیں، کیونکہ آپ کی قوم کا خیال ہے کہ سنت ہے، آپ نے فرمایا کہ انہوں نے کچھ صحیح کہا اور کچھ غلط۔ میں نے کہا کچھ صحیح اور کچھ غلط کا کیا مطلب فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد لوگ زیادہ جمع ہو گئے تھے۔ جب لوگ زیادہ ہوئے تو آپ سوار ہو گئے الخ میں کہتا ہوں کہ ابوالطفیل کی روایت کے الفاظ جو ابو داؤد میں مروی ہیں وہ اس تاویل کے منافی ہیں۔ اور وہ لفظ یہ ہیں؟ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ اپنی سواری پر بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے اور چھڑی کے ساتھ حجر اسود کا استلام کر کے اسے چوم لیتے تھے، محمد بن رافع کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ ”پھر آپ صفارہ کی طرف نکلے، پس اپنی سواری پر صفارہ کے سات پھیرے کئے، اور تاعلیٰ قاری نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ سوار ہونے کی حدیث کو عمرۃ القضاء پر محمول کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ مسلم و ابو داؤد کی حدیث جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کے الفاظ اس تاویل کی تصدیق نہیں کرتے اور وہ یہ ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں سواری پر بیت اللہ کا طواف کیا اور صفارہ کی سعی کی، میں کہتا ہوں

ولما وصل الى المروة استقبل البيت وكبر، فلما اكمل سعيه عند المروة ترجمه: اور جب مروہ پر پہنچے تو بیت اللہ کا استقبال کیا اور تکبیر کہی پس جب مروہ پر سعی پوری ہوئی۔

کہ حنفیہ کے مطابق جواب کی حاجت نہیں کیونکہ ان کا یہ قول کہ آپؐ نے دو طواف اور دو مرتبہ سحاک۔ ان تاویلات سے بے نیاز کر دیتا ہے اور روایات میں فارن کیلئے دو مرتبہ سح کی تصریح موجود ہے جس کی تفصیل اوچتر میں ہے۔ اور اس رسالہ کے شروع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے بارے میں چھ قول گزرے ہیں، وہاں اس کو اجالا ذکر کیا جا چکا ہے۔

رق، اور یہاں ابن حزم کو کھلا وہم ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن حزم کا وہم | سعی کے تین چکروں میں رمل کیا تھا اور چار چکروں میں مقدار و شمار سے چلے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ وہ اس قول پر جس کا کوئی ایک بھی قائل نہیں، علما کا اتفاق نقل کرتے ہیں۔

رق، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف قدم آنحضرت کا طواف پیدل کیا تھا یا سواری پر | پیدل کیا تھا یا سواری پر؟ اس میں اختلاف ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ سواری طواف آفاض میں تھی، طواف قدم میں نہیں تھا۔ مختصراً شیخ قدس سرہ نے بدل میں حدیث ابن عباسؓ کی شرح میں تحریر فرمایا ہے کہ اس حدیث میں جس طواف کے سواری پر کرنے کا ذکر ہے یہ کونسا طواف تھا؟ طواف عمرہ یا طواف قدم، یا طواف زیارۃ؟ اس سلسلہ میں کسی کی تصریح میری نظر سے نہیں گذری، بظاہر یہ طواف جو سواری پر کیا گیا طواف زیارۃ تھا۔ اور نوویؒ نے بھی اپنے مناسک میں اسی کو اختیار کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابو داؤد نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف آفاض میں رمل نہیں کیا۔

اور جب مروہ پر پہنچے تو بیت اللہ کا استقبال کیا اور تکبیر کہی۔ | سعۃ کے متعلق تین بحثیں اور وہی عمل کیا جو صفا پر کیا تھا۔ پس جب مروہ پر آکر سعی پوری

ہوئی، یہاں تین بحثیں ہیں۔ اول یہ کہ صفا سے سعی شروع کرنا اور مروہ پر ختم کرنا جمہور کا مذہب ہے، وہ صفا سے مروہ تک کو ایک پھیرا اور مروہ سے صفا تک واپسی کو دوسرا پھیرا شمار کرتے ہیں، اس میں بعض شافعیہ کا اختلاف ہے اور حنفیہ میں سے امام طحاویؒ کا میلان بھی اسی طرف ہے کہ صفا سے مروہ تک جانے اور مروہ سے صفا تک واپس آنے سے ایک پھیرا شمار ہوگا۔ موفقی فرماتے ہیں:

”صفا سے مروۃ تک جانا ایک پھیرا ہے اور مروہ سے صفا تک آنا دوسرا پھیرا ہے۔ ابن جریر اور بعض شافعیہ سے منقول ہے کہ جانے آنے سے ایک پھیرا مکمل ہوگا۔ مگر یہ غلط ہے اچھ“ پوری تفصیل اوپر میں ہے۔

سعی کے بعد دو گانہ کا حکم | دوسری بحث یہ کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعی کے بعد دو رکعتیں پڑھی تھیں؟ مطلب بن ابی وائعہ کی روایت میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سعی سے فارغ ہوئے تو مطاف کے کنارے پر دو رکعتیں پڑھیں۔ یہ حدیث امام احمد اور ابن حبان نے روایت کی ہے اور شیخ ابن ہمام نے اس سے استدلال کیا ہے کہ سعی کے بعد دو گانہ مستحب ہے، صاحب بُاب صاحب بحر اور ابن عابدین نے بھی انہی کی پیروی کی ہے، لیکن ابن حجر مکی نے شرح مناسک نووی میں اس پر تعقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حنفیہ سے حدیث کے لفظ میں غلطی تصحیف ہوئی، یہاں ”سعیہ“ کا لفظ نہیں بلکہ سبعہ ہے۔ جس سے مراد طواف کے سات پھیرے ہیں، اھ میں کہتا ہوں کہ ابن حجر مکی کے قول کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ابن ماجہ نے اس حدیث پر یہ عنوان قائم کیا ہے ”طواف کے بعد دو رکعتوں کا بیان“ اور حدیث میں ”سبعہ“ کا لفظ با کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور اس سے زیادہ واضح دلیل یہ ہے کہ امام نسائی نے یہی حدیث اس طرح روایت کی ہے۔

”طاف بالبيت سبعاً ثم صلی رکعتین“ ریت اللہ کے گرد سات پھیرے کئے پھر دو رکعتیں پڑھی مگر یہ تصحیف صرف حنفیہ کی کتابوں میں نہیں بلکہ یہ حدیث صاحب عون المعبود اور صاحب اسد الغابہ نے بھی مسند ابوالعلیٰ سے اسی لفظ سعیہ یا ئے تحتانیہ کے ساتھ نقل کی ہے۔ تفصیل میرے حاشیہ بدل اور ناخیص بدل میں ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ درج کیا گیا ہے۔

سعی کا حکم | تیسری بحث یہ ہے کہ سعی کا حکم کیا ہے؟ اوپر میں دلائل کے ساتھ اس پر مفصل بحث ہوئی ہے۔ اور اس کا اجمال حاشیہ لامع میں یہ ہے کہ اس میں اہل علم کے تین قول ہیں۔ اول یہ رکن ہے اس کے بغیر حج صحیح نہیں ہوگا۔ امام شافعی اسی کے قائل ہیں۔ امام مالک کا مشہور قول اور امام احمد کی دو روایتوں میں سے صحیح روایت بھی یہی ہے۔ دوم: یہ واجب ہے اور دم کے ساتھ اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ کا اور عتبہ میں امام مالک کا قول ہے۔ سوم یہ سنت مستحبہ ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔ اور امام احمد کی ایک روایت ہے۔ اھ

امر کل من لا ھدی معہ ان یجمل حتما۔ وھناک قال لو استقبلت من امری ما استبدت لما سقت الھدی۔

توجہ: تو قطعی حکم فرمایا کہ جن لوگوں کے ساتھ ہدی کے جانور نہیں وہ احرام کھول دیں۔ اور اسی موقعہ پر فرمایا کہ جو بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی وہ اگر پہلے معلوم ہو جاتی تو ہدی ساتھ نہ لاتا۔

فسخ احرام کا قطعی حکم | تو قطعی حکم فرمایا کہ جن لوگوں کے پاس ہدی کے جانور نہیں وہ احرام کھول دیں۔ خواہ وہ مفرد ہوں یا قارن۔ قرآن والوں نے باوجودیکہ حج و عمرہ دونوں

کا احرام باندھ رکھا تھا۔ مگر ان کو بھی فسخ احرام کا حکم فرمایا۔ اس کی وجہ قریب ہی گزر چکی ہے۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ ہدی کے جانور نہیں تھے اس لئے انہوں نے بھی احرام کھول دیئے، جیسا کہ بخاری، مسلم اور نسائی کی روایت میں ہے اور غفریب آگے آ رہا ہے۔ اور جن کے ساتھ ہدی کے جانور تھے وہ بدتھو احرام میں رہے۔ ان کے نام بھی آگے آ رہے ہیں۔ موضع ”سرف“ میں احرام حج کو عمرہ میں تبدیل کرنے کا جو حکم فرمایا یہ اُس سے اوپر کے مرتبہ کا حکم تھا۔ اور اسی موقعہ پر فرمایا کہ جو بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی وہ اگر پہلے معلوم ہو جاتی تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا۔ چنانچہ شیخین نے حضرت جابرؓ

سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم رذی الحجہ کی صبح کو مکہ تشریف لائے، پس جب ہم مکہ پہنچے تو ہمیں حکم دیا کہ ہم احرام کھول دیں۔ اور فرمایا کہ بیویوں کے پاس جاؤ۔ عطا فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر یہ حکم لازم نہیں کیا تھا۔ بلکہ عورتوں کو ان کے لئے حلال قرار دیا تھا۔ پس آپ کو یہ خبر پہنچی کہ ہم صحابہ یہ کہتے ہیں کہ اب جب کہ ہمارے اور عرفہ کے درمیان صرف پانچ راتیں باقی ہیں تو آپ نے یہ حکم فرمایا کہ ہم احرام کھول کر عورتوں کے پاس جائیں؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم عرفات میں ایسی حالت میں جائیں گے کہ ہماری شرمگاہوں سے منی ٹپک رہی ہوگی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا، تم سب سے زیادہ سچا، اور تم سب سے زیادہ نیکو کامیوں۔ اگر ہدی کے جانور نہ ہوتے تو میں بھی تمہاری طرح احرام کھول دیتا، پس اگر یہ بات مجھے پہلے معلوم ہو جاتی جو بعد میں معلوم ہوئی تو میں ہدی کے جانور ساتھ نہ لاتا۔ پس ہم نے احرام کھول دیئے، اور سمع و طاعت بجالائے۔ نو دہائی فرماتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کا یہ ارشاد کہ ان پر یہ حکم لازم نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب

یہ ہے کہ عورتوں سے مقاربت کو ضروری قرار نہیں دیا تھا۔ بلکہ اس کی اجازت دی تھی، اس کو واجب نہیں کیا تھا، باقی احرام کھول دینا ان لوگوں کے لئے واجب اور قطعی تھا، جسکے پاس ہدی نہیں تھی۔

اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ارشاد نبویؐ: لو استقبلت من امری الشیء کا مقصد اس ارشاد سے کیا تھا۔ شیخ بذیل میں فرماتے ہیں

کہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ رائے جو میرے لئے اب ظاہر ہوئی ہے، اگر پہلے سے ظاہر ہوئی ہوتی تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا، کہا گیا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے لئے آپ کی اقتدار کا ترک کرنا گراں تھا، اس لئے صحابہ کرام کی وجوہات کے لئے فرمایا تاکہ انہیں اطمینان ہو جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن چیز کی ان کو دعوت دے رہے ہیں، وہی ان کے لئے افضل ہے۔ ”الخ“ یہی بات ان سے پہلے نو دہائی نے لکھی ہے۔ اور شیخ المشائخ کو کتب میں فرماتے ہیں کہ یہ بات اس لئے ارشاد فرمائی تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گمان نہ کیا جائے کہ جس طرح صحابہ نے احرام کھول دیا ہے، آپ خود بھی کھول دیں گے، اور تاکہ حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ کے احرام کھولنے پر کبر نہ کریں۔ اور تاکہ حضرت علیؓ کو معلوم ہو جائے کہ جس کے ساتھ ہدی کے جانور ہوں اس کو احرام کھولنے کا حکم نہیں۔ اور جن کے ساتھ ہدی نہیں وہ احرام کھول دیں گے۔ علاوہ ازیں اس قسم کے اور بھی فوائد ہیں۔ ”اصد یہ ساری بحث جمہور کی رائے کے مطابق ہے۔ اور یہ حدیث اس مسئلہ میں حنا بلہ کی دلیل ہے کہ تمتع افضل ہے۔ چنانچہ موفق لکھتے ہیں: ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ وہ افراد اور قرآن کو چھوڑ کر تمتع کریں۔ ظاہر ہے کہ آپ نے انہیں افضل ہی کی طرف منتقل ہونے کا حکم دیا، یہ ناممکن ہے کہ آپ انہیں اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کی طرف منتقل ہونے کا حکم دیں۔ جب کہ آپ خیر کی طرف دعوت دینے والے اور اعلیٰ و افضل کی طرف راہنمائی کرنے والے تھے۔ پھر اس ضمن میں کو آپ نے یوں ٹوک دیا کہ خود اپنی ذات کے بارے میں اس کے قوت ہو جانے پر افسوس کا اظہار فرمایا کہ ہدی کی وجہ سے آپ احرام کھولنے اور قرآن سے تمتع کی طرف منتقل ہونے پر قادر نہیں۔ موفق کے کلام پر یہ اشکال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن، آپ کی اپنی ذاتی رائے کی وجہ سے نہیں تھا۔ کہ آپ کو اس پر افسوس کرنے کی ضرورت ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے تھا۔ جیسا کہ وادعی عتیق کی بحث میں گند چکا ہے کہ آپ کے پاس ایک آنے والا فرشتہ آیا اور اس نے کہا: ”کیسے عمرہ حج میں“ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو ماضی و مستقبل کی خبر ہے۔

دهناك دعا للخلق ثلاثا فقد روى انه صلى الله عليه وسلم احل هو ايضا وهو غلط قطعاً -
توجهت اور اسی جگہ حلق کرانے والوں کیلئے تین بار دعا فرمائی۔ اور روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی امر کہ کھولیا تھا یہ غلط

اور اسی جگہ حلق کرانے والوں کیلئے تین بار اور قصر
حلق کرانے والوں کیلئے تین بار دعا فرمائی

میں اس سلسلہ میں روایات کا اختلاف بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ یہ دعا عمرہ حدیبیہ میں فرمائی تھی یا
حجۃ الوداع میں؟ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ حدیبیہ میں دعا فرمائی نہ تھی۔ نووی فرماتے ہیں کہ صحیح اور
اوشہور یہ ہے کہ یہ دعا حجۃ الوداع میں فرمائی تھی۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ بعد نہیں کہ دونوں جگہ یہ دعا کی
ہو۔ عینی فرماتے ہیں کہ یہی صحیح اور صواب ہے۔ حافظ نے فتح میں اسی کو اختیار کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے
ہیں کہ یہی متبعین ہے کیونکہ دونوں جگہ دعا کرنے کی روایات بکثرت ہیں۔ البتہ سبب دونوں جگہ مختلف ہیں۔
جیسا کہ اوپر میں تفصیل سے وہ روایات ذکر کی گئی ہیں۔ اور یہی ظاہر ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف ہے
کہ حجۃ الوداع میں آپ نے یہ دعا کس موقع پر فرمائی، مردہ پر یا مٹی میں؟ صاحب الہدی نے اس پر جزم
کیا ہے کہ مردہ پر دعا فرمائی تھی، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اسی جگہ حلق کرانے والوں کے لئے دعا کی۔ اور زرقانی
وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مٹی میں دعا فرمائی کیونکہ ان حضرات نے یہ دعائیں حلق کے بعد ذکر کی ہے۔
میرے نزدیک اس دعا کا مردہ پر ہونا واجب ہے، کیونکہ وہاں احرام کھولنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے حکم کا کمال اتباع تھا۔

حضرت معاویہ کی روایت کہ انہوں نے مردہ
پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر کیا تھا

میں مردہ پر انہوں نے تیر کے بھالے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر کیا تھا۔

قسطلانی، الموابہ میں کہتے ہیں کہ علماء نے حضرت معاویہ کی اس روایت کی صحت کو تسلیم نہیں کیا۔
پوری بحث بدل اور اوپر میں ہے، اور مشکوٰۃ کے حاشیہ میں لمعات سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث میں اشکال
ہے کہ اس کو حج پر محمول کرنا صحیح نہیں کیونکہ فارن کا حلق یا قصر مردہ پر نہیں بلکہ مٹی میں ہوتا ہے۔ نیز یہ طے شدہ
بات ہے کہ حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر نہیں بلکہ حلق ہوا تھا۔ ہذا یہ حدیث عمرہ پر محمول

وہناك سألہ سراقۃ العامہم هذا ام لا بد۔

توجہ: اور حضرت سراقہؓ نے اسی موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ صرف اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے؟

ہو سکتی ہے۔ مگر یہ قصہ عمرہ حادیثہ کا بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کرایا تھا۔ اور اسے عمرہ القضاء پر محمول کرنا بھی ممکن نہیں کیونکہ باتفاق اہل سیر حضرت معاویہؓ فتح مکہ کے سال اسلام لائے، لہذا اس کو عمرہ جعزلہ پر جو ذی القعدہ ۳۳ھ میں ہوا، محمول کیا جاسکتا تھا، مگر یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ صحیح کے بعض الفاظ میں آتا ہے کہ یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے اور انسانی کی روایت میں بسند صحیح یہ لفظ ہیں: وَذَلِكَ فِي أَيَّامِ الْعَشْرِ رَاوِي عَشْرَةِ ذِي الْحِجَّةِ کی بات ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ حجۃ الوداع ہی میں ہو سکتا ہے، اور یہ بھی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اس دن نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا احرام کھانا، ان لوگوں کا جن کے پاس ہدی کے جانور تھے۔ کہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے حضرت معاویہؓ کی اس بات سے انکار کیا تھا، اور اسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا سہو قرار دیا تھا۔ جس طرح انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس بات سے انکار کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمرہ رجب میں ہوا۔

تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس میں بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس میں سہو ہوا کہ یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے، اور یہ بات ایک ایسے شخص کے باسے میں کچھ بھی مستبعد نہیں جس پر مشاغل کا بھوم ہوا اور جس کے کانوں، آنکھوں اور حافظے پر بیزار نہ سالی اثر انداز ہو چکی ہو، ان کا سن مبارک اسی سے متجاوز تھا، اندر میں صورت اسے عمرہ جعزلہ پر محمول کیا جائے اور ذی الحجہ اور عشرہ ذی الحجہ کے ذکر کو سہو قرار دیا جائے، اھ نوومی نے بھی اسے عمرہ جعزلہ پر محمول کیا ہے، اور محب طبریؒ نے اسکی تصویب کی ہے، اور ابن قیمؒ نے اس کو بطور احتمال ذکر کیا ہے۔ اور ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں اسی کو قطعی قرار دیا ہے۔

اور جب آپ نے فسخ احرام کا حکم فرمایا تو اس وقت حضرت سراقہؓ بن مالک بن جعثمؓ جہوں نے مقام اسرف میں آپ سے عرض کیا تھا کہ ہمیں ایسا صاف اور واضح حکم دیجئے جیسا ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو گویا آج پیدا ہوئے ہوں۔ انہوں نے اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حکم یعنی حج کے مہینوں میں عروکہ نا اسی سال کیلئے ہے یا ہمیشہ کیلئے؟ یا تیرہ سالہ کی تفریح ہے اور اہل ہجرت نزدیک اس سے مراد حج کو فسخ کر کے عمرہ بنانا ہے۔

حج کو فتح کر کے عمرہ بنالینے کی بحث اور حضرت سراقہ کی اس حدیث کا جواب منزل سرف کے بیان میں گذر چکا ہے۔ آنحضرتؐ نے سراقہ کے مندرجہ بالا سوال کے جواب میں فرمایا: ”ہمیشہ کیلئے“ اہل ہی میں اسی طرح ہے۔ اس کے برعکس بخاری کی روایت میں ہے کہ سراقہ نے یہ سوال رمی جمرہ عقبہ کے وقت کیا تھا۔ اس کے لفظ ”باب عمرہ تنعیم“ میں بروایت جابرؓ یہ ہیں: ”سراقہ بن مالک بن جحشم جمرہ عقبہ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے، جب کہ آپؐ اس کی رمی کر رہے تھے، پس عرض کیا یا رسول اللہ! کیا یہ آپؐ لوگوں ہی سے مخصوص ہے؟ فرمایا: ”نہیں! بلکہ ہمیشہ کے لئے۔“ حافظ فرماتے ہیں کہ کتاب التمتنی میں یہ لفظ ہیں: ”در آنحالیکہ آپؐ جمرہ عقبہ کی رمی کر رہے تھے۔“ اس حدیث میں اس جگہ کی تصریح ہے جہاں حضرت سراقہ نے یہ سوال کیا تھا اور امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی جو حدیث جعفر بن محمد بن ابیہ کے طریق سے ذکر کی ہے اس کے سیاق کا مقتضی یہ ہے کہ یہ سوال اس وقت کیا گیا جب کہ آپؐ نے صحابہ کرام کو حج کا احرام کھول کر عمرہ بنانے کا حکم فرمایا: اسی سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے جو اس کے قائل ہیں کہ سراقہ کا سوال فتح حج الی العمرة سے متعلق تھا۔ ممکن ہے کہ سوال دونوں چیزوں کے متعلق ہوا ہو کیونکہ سوال متعدد جگہ ہوا تھا۔

ارشاد نبویؐ: ”عمرہ حج میں داخل ہو گیا کا مطلب“ مسلم شریف میں جعفر بن محمد کی روایت میں ہے کہ حضرت سراقہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا یہ صرف اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کیلئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دو مرتبہ فرمایا: ”کہ عمرہ حج میں داخل ہو گیا صرف اسی سال کے لئے نہیں! بلکہ ہمیشہ کے لئے۔“ نوویؒ فرماتے ہیں کہ جبہور کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ جاہلی دستور کے برعکس حج کے ہینوں میں عمرہ کرنا جائز ہے اور بعض نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن جائز ہے یعنی عمرہ کے افعال حج کے افعال میں داخل ہو گئے اور بعض نے اس کا یہ مفہوم لیا ہے کہ عمرہ کا واجب ساقط ہو گیا اور یہ قول ضعیف ہے کیونکہ یہ نسخ بلا دلیل کو مقتضی ہے اور بعض نے ان کا مطلب لیا ہے کہ:

کہ حج کے احرام کو فتح کر کے اسے عمرہ بنالینا جائز ہے، مگر یہ بھی ضعیف ہے۔ نوویؒ کے قول پر تقصیر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ سوال کا انداز و سیاق اس تیسری تاویل کے حق میں ہے۔ بلکہ ظاہر یہ ہے کہ سوال تو فتح حج ہی کے بارے میں تھا مگر جواب اس سے عام ہے جو باشتنا تیسری تاویل کے مذکورہ بالا تمام تاویلات کو شامل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ”۱۰۰“ ۱۰۱۔ کلام الحافظ۔

ان صحابہؓ کے نام جنہوں نے احرام نہیں کھولا حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت طلحہ

قلت، وقد مر على من الیمن ببُعد نہ۔

ترجمہ: اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں سے تشریف لائے آپ کی ہدی کے اونٹ لے کر۔

اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم نے احرام نہیں کھولا۔ کیونکہ ان کے ساتھ ہدی کے جانور تھے کذا فی الہدی نام طحاوی نے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل ثروت کا اضافہ کیا ہے۔ اور اہل ثروت کے احرام نہ کھولنے کا ذکر امام مسلم نے بھی کیا ہے شیخ ابن عربی نے "المحاضرہ" میں لکھا ہے کہ: بالارحضر ان احرام نہیں کھولا دق ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم نے بھی جن کا قرآن تھا احرام کھیل دیا تھا البتہ حضرت عائشہ نے غدر کی بنا پر حرام نہیں کھولا۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت عائشہ کے بارے میں شیخ ابن قیم کا یہ قول، المثلثہ کی رائے پر متنبہ ہے، حنفیہ کے نزدیک حضرت عائشہ نے عمرہ کا احرام کھو کر حج مفرد کا احرام باندھ لیا تھا۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

دش) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں سے تشریف لائے۔ آنحضرت

میں سے حضرت علیؑ کی آمد | صلی اللہ وسلم نے ان کو تحصیل صدقات کیلئے یمن بھیجا تھا۔ جیسا کہ بخاری

شریف کی کتاب المغازی "باب بعث علی ابن ابی طالب و خالدا بن الولید الی الیمن قبل حجة الوداع" میں اس کی تفصیل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مال سعایت لے کر آئے اور مکہ مکرمہ میں آپ سے آکر ملے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے کیسا احرام باندھا؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے یہ نیت کی تھی کہ جو احرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہی میرا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ "ہدی تیار رکھو اور سب تو حرام کی حالت میں رہو۔" الی آخر الحیث۔ اسی طرح حضرت ابی موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بھی اپنا احرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام پر معلق رکھا تھا۔ مگر ان کے پاس چونکہ ہدی کا جانور نہیں تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم فرمایا کہ حج کا احرام فسخ کر کے عمرہ بنالیں اور احرام کھولیں۔

حاشیہ لایع میں باب من اهل زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی کے تحت

احرام مبہم و معلق | ان دونوں حضرات کے احرام نیز احرام مبہم اور معلق پر خوب بحث کی گئی ہے۔

احرام مبہم اور معلق کے مسئلہ میں جو مذہب ہیں ان کے بیان میں شرح حدیث کے کلام میں الجھاؤ ہے جس کی تفصیل حاشیہ لایع میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ احرام مبہم تو یہ ہے کہ حج یا عمرہ کی تعیین کے بغیر احرام باندھے۔ اور معلق یہ ہے کہ یوں نیت کرے کہ جیسا احرام فلاں نے باندھا ہے ویسا ہی میرا ہوگا۔ ائمہ اربعہ کے اجماع اقوال میں احرام کی یہ دونوں صورتیں صحیح ہیں۔ اگرچہ بعض سے مختلف روایات بھی مروی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی کے اونٹ لے کر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کے جانور جو آپ کے ساتھ تھے اور جو میں

رقال، فاقام بظاہر مکة اربعة ايام يقصر الصلوة

توجہ: (بقی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر مکہ میں چار دن ٹھہرے۔ درآنحالیکہ آپ قصر کی نماز پڑھتے تھے۔

سے آئے تھے ان سب کی مجموعی تعداد ایک سو تھی۔ جیسا کہ انہیں میں ہے اور صحیح مسلم اور ابوداؤد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں بھی اس کی تصریح ہے۔ زرقانی نے قاضی عیاض سے نقل کیا ہے کہ جو اونٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ سے لائے تھے اور جن کی تعداد تیسٹھ تھی، بظاہر ان ہی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک بخرد و ذبح کیا۔ جیسا کہ امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور بخاری و ابونعیم سے آئے تھے وہ آپ نے حضرت علیؓ کو عطا فرادیئے تھے۔

حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ سے ناراض ہونا | احرام کے دیکھا تو ناراض ہوئے۔ زرقانی فرماتے ہیں کہ ترمذی، نسائی اور ابوداؤد میں حضرت برادر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہؓ کے پاس گئے تو دیکھا کہ انہوں نے نضوح (ایک خاص قسم کی خوشبو) لگا رکھی ہے جس کی خوشبو تک رہی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ناراض ہوئے تو حضرت فاطمہؓ نے فرمایا: آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو حکم فرمایا ہے اس لئے وہ احرام کھول چکے ہیں۔ حضرت علیؓ کی آمد اس وقت ہوئی جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الطح میں فروکش تھے، اس سے اس روایت کی تردید ہو جاتی ہے جو طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (تحفہ) میں آکر ملے تھے۔ کذافی البدایہ والنہایہ۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر تک یعنی الطح میں جو مکہ سے مشرقی | آنحضرتؐ کا مکہ سے باہر قیام کرنا | جانب ہے چار دن ٹھہرے۔ درآنحالیکہ آپ اسی جگہ قصر کی نماز پڑھتے

تھے۔ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وہ اذان اسی جگہ ہوئی تھی جس پر امام بخاری نے یہ عنوان قائم کیا ہے: باب المؤذن يتبع فاه بهننا و بهننا۔ اور اس کے تحت حضرت ابو حنیفہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت بلالؓ کو دیکھا کہ وہ اذان دے رہے تھے۔ پس اذان میں منہ ادا صرا دھر کر رہے تھے۔ اور البدایہ والنہایہ میں بروایت احمد ابو حنیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت بلالؓ کو دیکھا کہ اذان کہہ رہے تھے اور گھوم رہے تھے۔ اور منہ ادا صرا دھر کر رہے تھے۔ اور ان کی انگلیاں کانوں میں تھیں، اور رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم سرخ خیمے میں فروکش تھے جو میرا خیال ہے کہ چڑھے کا تھا پس حضرت بلالؓ آپ کے آگے آگے
 برچھی نما عصا دے کر نکلے اور اس کو زمین میں گاڑ دیا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔
 عبد الرزاق کہتے ہیں کہ میں نے ان سے (یعنی اپنے شیخ سے) کہہ میں سنا فرماتے تھے کہ یہ قصہ بطحا کا ہے۔
 — صاحب بلایہ نے اس مضمون کی متعدد روایات ذکر کی ہیں۔ ایک روایت میں حضرت ابو جحیفہ سے مروی
 ہے کہ فہر کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بطحا کی طرف نکلے پس وضو کیا۔ الخ اور اسی روایت میں ہے
 کہ پھر لوگ کھڑے ہوئے پس انہوں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے چہروں پر ملنا شروع کیا۔ اھ یہ حدیث امام
 بخاری نے بھی ذکر کی ہے۔

غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام
 حضرت سعدؓ کی عیادت اور ان کے سارے مال | بطحا کے دوران ہی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ
 کی وصیت کے بارے میں دریافت کر لیا قصہ | کی عیادت کرنے اور ان کے اپنے سارے مال کا
 وصیت کے بارے میں دریافت کرنے کا واقعہ پیش آیا، جو روایات میں معروف ہے اور یہ تو جب
 ہے جب کہ یہ واقعہ حجۃ الوداع کا ہو جیسا کہ راجح یہی ہے، البتہ بعض روایات میں ہے کہ یہ قصہ فتح مکہ
 کا ہے، مگر اول ہی راجح ہے کیونکہ وہ صحیحین کی روایت ہے اور فتح مکہ والی روایت ترمذی کی ہے۔
 اگرچہ حافظ نے ایک اور حدیث بھی اس کی مؤید نقل کی ہے، اور ان دونوں کے مابین تطبیق بھی دی
 ہے۔ جیسا کہ لامع کے حاشیہ میں کتاب الوصایا میں اس کی تفصیل ذکر کی گئی ہے۔

غالباً اسی مقام میں حدیث طَبْطَبِيَّة کا وہ واقعہ بھی پیش آیا جو امام ابو داؤد
 حدیث طَبْطَبِيَّة کا قصہ | نے باب تزویج من لم یولد میں نقل کیا ہے کیونکہ اس میں تصریح ہے کہ
 کروم کی آمد آپ کے حج میں ہوئی تھی، اور سند احمد کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں
 تھے۔ یہ حدیث امام ابو داؤد نے باب مایۃ مرہ من وفار النذر میں مختصراً ذکر کی ہے، جس میں روانہ نہیں
 اونٹ ذبح کرنے کا قصہ مذکور ہے۔ امام احمد نے یہ دونوں قصے ایک ہی حدیث میں ذکر کئے ہیں۔

کیا ان چار دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم | پھر میرے نزدیک ظاہر یہ ہے ان ایام میں،
 طواف کعبہ کے لئے گئے تھے؟ | جب کہ آپ بطح میں فروکش تھے۔ طواف کعبہ کے لئے
 آتے رہے، بخلاف ان حضرات کے جو اس کے قائل

میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان ایام میں بیت اللہ کے قریب نہیں گئے، جیسا کہ پہلے گذرا،

اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابن عربی نے المحاضر
باب کعبہ کے پاس آپ کا خطبہ | میں حضرت ابن عباس سے نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس حج میں باب کعبہ کا حلقہ پکڑا، پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: اے مسلمانوں کی جماعت! من جملہ علامات قیامت کے یہ چیزیں ہیں۔ نماز کو غارت کرنا، نفسانی خواہشات کی پیروی کرنا، عیانت پیشہ حاکموں اور بدکار وزیروں کا ہونا، اس طویل حدیث میں علامات قیامت اور ان گناہوں کا ذکر ہے جن میں یہ امت مبتلا رہو گی۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلے پہل بیت اللہ میں تشریف لائے تو بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد فوراً صفا کی طرف نکل گئے۔ اسی طرح یوم

النحر کو منیٰ سے سواری پر تشریف لائے، اونٹ پر طواف کیا اور اس کے بعد خنیفہ کے نزدیک سعی کی، اور راجح قول کے مطابق ظہر سے قبل ہی منیٰ کو واپس تشریف لے گئے۔ جیسا کہ ابن عمر کی روایت ہے اور طواف وداع آپ نے رات کے وقت نماز صبح سے پہلے کیا تھا جیسا کہ اپنی جگہ آتا ہے۔ اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بطحائے طواف کے لئے تشریف لائے ہونگے۔

اور یہ طویل حدیث جو ابن عربی نے ایک ورق میں نقل کی ہے، ارشاد فرمائی ہو گی۔ جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ایام میں بھی طواف کیا، نیز اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کی راتوں میں طواف کیلئے مکہ تشریف لائے تھے جیسا کہ غفر ب آتا ہے اور میرے نزدیک یہ بعید ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ سے تین میل کے فاصلے سے تو طواف کے لئے تشریف لائیں اور خود مکہ میں قیام کے دوران طواف نہ کرتے ہوں، امام بخاری کے ترجمہ الباب باب من لم یقرب الکعبۃ یراع کے حاشیہ میں مفصل گفتگو کی گئی ہے، نیز اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ عرزی الحج کا خطبہ خنیفہ و مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک سنت ہے۔

اور بظاہر وہ مسجد حرام ہی میں ہونا چاہئے۔ چنانچہ او جز میں ہے کہ ابن المواز فرماتے ہیں کہ حج کتے میں خطبے میں پہلا عرزی الحج کو نماز ظہر کے بعد مسجد حرام میں: اھ اب اگر یہ خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابطح میں دیا ہوتا تو جو لوگ مکہ میں مقیم تھے وہ اس سے محروم رہ جاتے۔ نیز طبقات ابن سعد کی اس روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپ کے لئے ابطح میں خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی

فلما كان يوم الخميس ضلحي توجه الى منى. احرم بالحج من كان احل منهم
توجها: پس جب جمعرات کو چاشت کا وقت آیا تو منی کا قصد کیا اور جو حضرات احرام کھول چکے تھے
انہوں نے بھی احرام باندھ لیا۔

فرد گاہ کی طرف لوٹ گئے اور جب یوم الترویہ سے پہلا دن آیا۔ یعنی ۷ ذی الحجہ تو آپ نے نماز ظہر کے
بعد مکہ معظمہ میں خطبہ دیا: اھ

علماء اس کے قائل ہیں کہ یہاں ۷ ذی الحجہ کا خطبہ مسنون ہے۔ البتہ
خطبات حج میں اختلاف | اس میں امام زفر کا اختلاف ہے وہ اسے سنت نہیں کہتے بلکہ ان کے
نزدیک تینوں خطبے پے در پے ہوں گے اور پہلا خطبہ ۸ ذی الحجہ کو ہوگا، حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک
بھی تین ہی خطبے ہیں مگر پے در پے نہیں بلکہ پہلا خطبہ ۷ ذی الحجہ کو نماز ظہر کے بعد ہوگا، جیسا کہ اوپر گزرا۔
اور دوسرا ۹ ذی الحجہ کو عرفات میں نماز ظہر سے قبل ہوگا۔ اور تیسرا ۱۰ ذی الحجہ کو منی میں نماز ظہر کے
بعد ہوگا۔ اور شافعی کے نزدیک چار خطبے ہیں، پہلے دو تو وہی ہیں جن کے حنفیہ اور مالکیہ قائل ہیں۔
اور تیسرا یوم النحر ۱۱ ذی الحجہ کو اور چوتھا ۱۲ ذی الحجہ کو۔ خلیل کی کتابوں میں مجھے ۷ ذی الحجہ کے خطبے
کی تصریح نہیں ملی۔ البتہ شارحین نے ذکر کیا ہے کہ وہ چار خطبوں میں شافعیہ سے متفق ہیں۔

پس جب جمعرات کو چاشت کا وقت ہوا۔ الہدی میں اس طرح ہے اور ابن خرم
منی کو روانگی | نے بھی اسی کو ذکر کیا ہے، جیسا کہ شرح مناسک للنووی میں ہے اور اسی طرح
"المحاضرہ" میں ہے، اور یہی معروف ہے۔ اس کے خلاف ایک قول آگے آتا ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ
وسلم ظہر کے بعد منی کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو اپنے رفقاء سمیت منی کا قصد کیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ کے
ساتھ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک لکڑی پر کپڑا لگا ہوا تھا۔ جس سے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سایہ
کر رہے تھے۔ جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں ہے۔ محرم کے سایہ میں بیٹھنے میں آمہ کا جو اختلاف ہے وہ
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پالان پر سچ کرنے کے بیان میں گزر چکا ہے۔

ابطح سے احرام باندھنا | اور جو حضرات احرام کھول چکے تھے انہوں نے بھی ابطح ہی سے احرام
ابطح سے احرام باندھ لیا۔ امام بخاری نے ترجمہ الباب قائم کیا ہے: "باب الالہلال من
البطحاء وغیرھا للہکی: اور منی پہنچ کر وہاں قیام فرمایا، اور نماز ظہر ادا کی، جیسا کہ الہدی میں ہے،

و بات بھا حتی طلعت الشمس
ترجمہ: اور رات کو دل قیام رہا نہا تک آفتاب طلوع ہوا۔

نیز زرقانی نے بھی یہی ذکر کیا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے گذرا ہی معروف ہے۔ اور اجز میں ابو عبد اللہ قطبی کی شرح موطا سے نقل کیا ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۸ ذوالحجہ کی شام کو منیٰ کی طرف نکلے۔ نوویؒ اپنے مناسک میں فرماتے ہیں: اور ان کا رجحان کا منیٰ کی طرف، مکہ سے نکلنا نماز صبح کے بعد ایسے وقت ہو گا کہ ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھ سکیں۔ شافعیہ کا صحیح اور شہور مذہب یہی ہے جو ان کی تصریحات سے ثابت ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ظہر مکہ میں پڑھ کر نکلیں اصر۔

اور رات کو دل قیام رہا۔ اسی رات سورہ والمرسلات نازل ہوئی چنانچہ
سورہ والمرسلات کا نزول

امام بخاریؒ نے ”باب یقتل المحرم من الدواب“ کے ذیل میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ: ”دریں اثناء کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ منیٰ کی ایک غار میں تھے کہ آپؐ پروا المرسلات نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت فرما رہے تھے، اور میں آپ کی زبان مبارک سے اس کو حاصل کر رہا تھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ رطب اللسان تھے۔“ الم حافظ فرماتے ہیں کہ: اسماعیلی کی روایت میں ہے کہ یہ عرفہ کی شب تھی: ”انتہی۔ بخاری وغیرہ کی روایات میں ہے کہ وہاں ایک سانپ نکلا تھا، صحابہ کرام نے اس کو قتل کرنا چاہا مگر وہ اپنی بل میں داخل ہو گیا۔ یہاں تک کہ جمعہ کے دن کا آفتاب طلوع ہوا۔ اس میں اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حج مبارک جمعہ کو ہوا۔

رہی یہ بحث کہ آیا جمعہ کے حج کو کچھ مزید خصوصیت بھی حاصل ہے؟
جمعہ کے حج کی فضیلت

اجز میں اس پر مفصل کلام کیا ہے، اور اس میں عبد اللہ بن کرمؒ کی حدیث نقل کی ہے کہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افضل دعا یوم عرفہ کی دعا ہے۔“ الحدیث۔ زرقانی فرماتے ہیں کہ ”تحرید الصحاح“ میں اس حدیث کے شرع میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: ”سبب افضل دن عرفہ کا دن ہے۔ جو جمعہ کے دن آئے، اور ایسے دن کا حج دوسرے دنوں کے شرعاً حجوں سے افضل ہے۔“ حافظ اس حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں کہ: ”اگر اس حدیث کی کچھ اصل ہو تو احتمال ہے کہ ستر کے لفظ سے خاص عدد ہی مراد ہو یا محض کثرت میں مبالغہ مقصود ہو، بہر صورت اس کی مزید خصوصیت ثابت ہوتی ہے۔“ ابن قیمؒ کی الہدیٰ میں ہے کہ: ”یہ جو عوام کی زبان پر مشہور ہے کہ جمعہ کا وقوف عرفات بہتر حج کے برابر

فسار منها الی عرفہ بطریق ضب

ترجمہ: پس دہاں سے عرفات کی طرف روانہ ہوئے۔ ضب کے راستہ سے،

ہے یہ قطعاً باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ کسی صحابی یا تابعی سے۔

زر قانی نے جو حدیث تحریر سے نقل کی ہے وہ جمع الفوائد میں بھی مذکور ہے۔ اور علامہ علی قاریؒ شرح لباب میں فرماتے ہیں کہ جمعہ کا وقوف دیگر ایام کے وقوف سے ستر درجے افضل ہے، نیز وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ”الخط الاوفیٰ الحج الاکبر“ ہے۔ اور زرین کی مذکورہ بالا حدیث کے بارے میں علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں: ”اس کے ذکر کرنے میں زرین متغیر ہے، اس نے اس کے راوی صحابی کا بھی ذکر نہیں کیا نہ اس کے مخرج کا۔“ اس کے بعد انہوں نے وہی بات ذکر کی ہے جو حافظؒ کے کلام میں گزر چکی ہے کہ اگر اس کی کچھ اصل ہو تو احتمال ہے الخ پوری

تفصیل ادجز میں ہے۔

پس دہاں سے عرفات کی طرف روانہ ہوئے کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد
منی سے عرفات کو روانگی ہے: ثُمَّ افیضوا من حیث افاض الناس (پھر تم سب کو ضرور ہے کہ

اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر دہاں سے واپس آتے ہیں ترجمہ حضرت تھانویؒ)

امام بخاریؒ کتاب التفسیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے
حُجْسُ کل عرفا ین جانا میں کہ قریش اور ان کے ہم شرب لوگ صرف مزدلفہ جا کر واپس آجاتے تھے اور

حُجْسُ کہلاتے تھے، اور ان کے علاوہ باقی عرب عرفات میں وقوف کرتے تھے، پس جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ

نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ عرفات جائیں اور دہاں وقوف کر کے واپس آئیں۔ یہی مطلب ہے

حق تعالیٰ کے ارشاد: ثُمَّ افیضوا من حیث افاض الناس کا: البدایہ والنہایہ میں منی میں آنحضرتؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ نمازوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: پھر آپ تھوڑی دیر ٹھہرے، یہاں تک کہ آفتاب

طلوع ہوا۔ اور آپ کے حکم سے تیرہویں بالوں کا خیمہ نصب کیا گیا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوئے

اور قریش کو یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مشعر حرام کے پاس مزدلفہ میں ہی ٹھہریں گے، جیسا کہ بیعت

میں قریش کا دستور تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ سے گزر کر عرفات پہنچ گئے، زر قانی نے شرح

مواہب میں بھی اسی طرح ذکر کیا ہے، اور یہ حضرت جابر کی طویل حدیث کے الفاظ ہیں۔

ضبت کے راستے سے یہ اس راستہ کی دائیں جانب ہے جو آج کل لوگوں میں معروف
ضبت راستہ ہے۔ اور المرأة کے حاشیے میں ہے کہ ضبت اس پہاڑ کا نام ہے جس کی حر میں مسجد

خزول فی قبہ -

توجہ: پس ایک قبہ میں فروکش ہوئے۔

خیف ہے۔ اور طریقِ ضُبِّ عرفہ کی دائیں جانب مائزین کے اول سے شروع ہوتا ہے اور یہ طریق مائزین سے مختصر راستہ ہے۔ اور زرقانی فرماتے ہیں: ضُبِّ رَفْعِ ضَادٍ وَتَشْدِیْدِ اَیْکِ سَبْتِی ہے جو آجکل لوگوں کے دائیں جانب آتی ہے۔ تاملی قارئین کی شرح کباب میں ہے: مستحب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی اقتدا کرتے ہوئے ضُبِّ کے راستے عرفات کو جائے اور مائزین کے راستے سے واپس آئے۔ مگر اکثر لوگوں نے ہمسے زمانے میں اس کو ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ اس راستے میں کاشے بہت ہیں اور خوف کا غلبہ ہے۔ اور مائزین عرفہ اور مزدلفہ کے مابین ایک سنگ گھاٹی کا نام ہے۔ اہل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہؓ لمبیہ کہتے تھے اور بعض تبکیہ کہتے تھے۔ اور کسی پر تکبیر نہیں کی جاتی تھی جیسا کہ صحیحین میں ہے۔

پس وہاں آپ ایک قبہ میں فروکش ہوئے۔ جو عرفہ میں نصب **نَمْرُہ عرفات میں داخل ہے یا کہ نہیں؟** کیا گیا تھا۔ اور آیا نَمْرُہ عرفات میں داخل ہے یا اس سے خارج ہے؟ اس میں اختلاف ہے جس کی تفصیل میرے حاشیہ تبدل میں ہے۔ چنانچہ تبدل میں ہے کہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ عرفات کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے جو عرفات میں داخل نہیں۔ اہل اور میرے حاشیہ میں ہے کہ نووی اور زرقانی نے شرح مواہب میں یہی ذکر کیا ہے اور اکمال میں ابی کے کلام میں بھی یہی ظاہر ہے اور نووی کی تہذیب اللغات میں ہے کہ یہ عرفات کے قریب ایک معروف جگہ ہے۔ اور شرح ہندب میں فرماتے ہیں: یہ عرفات کا حصہ نہیں۔ بلکہ عرفات کے قریب میں واقع ہے۔ یہی قول صحیح ہے جس کی امام شافعیؒ نے تصریح کی ہے۔ حافظ فرماتے ہیں: یہ عرفات کے قریب ایک جگہ ہے جو بیرونِ حرم عرفات اور حرم کے کناروں کے مابین واقع ہے۔ یعنی میں بھی اسی طرح ہے۔ اور یہی معنی سے ظاہر ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: نَمْرُہ میں قیام کرے اور چاہے تو عرفات میں۔ لیکن باجی اور مدیر کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عرفہ میں شامل ہے اور خفیعہ کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ یہ عرفات میں شامل ہے۔ بلکہ فخر الدین زلیعی نے شرح کنز میں اور جمال الدین زلیعی نے تخریج ہدایہ میں اور ابن ہشام نے فتح القدیر میں اس کی تصریح کی ہے۔ نیز المختار میں بھی یہی ہے، اور علینی میں اس کے خلاف اور گزرجاکا بے اور مجمع البحار میں ہے کہ

حتی اذا زالت الشمس سارحتی اتی بطن الوادی فخطب خطبة عظيمة -
ترجمہ یہاں تک کہ جب زوال آفتاب ہوا تو روانہ ہوئے یہاں تک کہ بطن وادی میں پہنچے۔
پس ایک عظیم الشان خطبہ دیا۔

یہ عرفات میں ایک پہاڑ ہے جس پر حرم کے بت رکھے جاتے تھے۔ اور قاموس میں ہے: یہ عرفات میں ایک جگہ ہے یا وہ پہاڑ ہے جس پر حرم کے بت رہتے تھے۔ اُن زمین سے نکلوا تو یہ تمہاری دائیں جانب آئیگا۔ اور یہی حضرات ابن عمر کی حدیث سے ظاہر ہے جواب دواؤ ذباب الخروج الی عرفہ میں ان الفاظ سے مروی ہے: یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرفہ پہنچے، پس نمرہ میں فروکش ہوئے۔ اور یہی قزو گاہ ہے امام کی جو اس جگہ عرفہ میں فروکش ہوئے۔

اور اوجز میں ہے: باب وقوف بعرفہ میں ہے کہ ناظرین کتب بطن عرفہ عرفات میں داخل ہے یا نہیں؟ حدیث کے لئے تین چیزوں کی تحقیق کی حاجت ہے کہ آیا وہ عرفہ میں داخل ہیں یا نہیں۔ ایک بطن عرفہ، دوسری نمرہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ نصب کیا گیا، تیسری عرفات کی مسجد، بعد ازاں بہت ہی تفصیل کے ساتھ ان پر بحث کی ہے۔ اگر تفصیل و تحقیق کا شوق ہو تو اوجز کی مراجعت کرو۔ یہاں تک کہ جب زوال آفتاب ہوا تو اپنی ناقہ مبارک قصوا کو تیار کرنے کا حکم فرمایا۔ دہ تیار کی گئی تو اس پر سوار ہو کر روانہ ہوئے یہاں تک کہ بطن وادی میں پہنچے، جو سرزمین عرفہ کا حصہ ہے، الہدیٰ زرقانی اور مرقاة میں اسی طرح ہے، اور ہندل میں حضرت جابرؓ کی حدیث طویل کے الفاظ: حتی اتی بطن الوادی کے تحت لکھا ہے کہ یہ عرفات میں ایک جگہ ہے جو عرفہ کہلاتی ہے، اور یہ عرفات کا حصہ نہیں بخلاف امام مالک کے کہ ان کے نزدیک یہ عرفات میں شامل ہے۔ اھ

اوجز میں بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے کہ عرفہ عرفات میں داخل ہے یا اس سے خارج؟ اور اس میں ہے کہ ائمہ اربعہ متفق ہیں کہ وقوف عرفہ وقوف عرفہ کی جگہ کافی نہیں، البتہ امام مالک کا ایک مروج قول ہے کہ یہ بھی کافی ہے مگر اس پر دم لازم ہوگا، پس آپ نے سواری پر سے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے ایک عظیم الشان خطبہ دیا۔ یہ ایک خطبہ تھا یا دو تھے؟ اس میں اختلاف ہے جو آگے آتا ہے۔

اوجز میں اس سلسلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ آیا وقوف وقوف عرفات پیدل ہو یا سواری پر؟ عرفہ سواری پر افضل ہے یا پیدل؟ یا دونوں برابر ہیں؟ جنہور کا مذہب یہ ہے کہ سواری پر افضل ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر وقوف کیا تھا۔ نیز اس

مقام میں دعا اور گریہ و زاری میں مبالغہ مطلوب ہے اور سواری سے اس پر خوب مدد مل سکتی ہے۔ اور شافعیہ و حنابلہ کا ایک قول یہ ہے کہ پیدل افضل ہے، اور امام شافعیؒ سے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ دونوں سادی ہیں تفصیل اور جز میں دیکھیے۔

دش، اس خطبے کا بیشتر حصہ سیرت ابن ہشام، ابن عربی کی "الحاضو" انحضرتؐ کا خطبہ عرفات | ابدایہ والنہایہ اور زرقانی شرح مواہب میں مذکور ہے اس خطبے میں آپؐ نے ابن ربیعہ کے خون کے ساقط کرنے کا اعلان فرمایا، جیسا کہ مسلم اور ابو داؤد میں ہے۔ ربیعہ کے اس رنگے کا نام ایسا تھا، مسلم اور ابو داؤد کی بعض روایات میں ربیعہ کے خون کا لفظ ہے۔ جسے ایک جماعت نے غلط قرار دیا ہے، مگر غلط کہنے کی ضرورت نہیں۔ ربیعہ ولی دم تھا۔ اس لئے اس کی طرف نسبت کرنا مستبعد نہیں۔ اس خطبہ میں جاہلی سود کے موقوف ہونے کا اعلان کیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے جاس بن مطلب کا سود ساقط کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ سب کا سب ساقط ہے۔ اس خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا: "خوب یاد رکھو کہ جاہلیت کی ایک ایک چیز میرے قدموں کے نیچے پامال ہے" اسی خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا: "اے لوگو! میرا خیال ہے کہ ہم اور تم اس مجلس میں پھر کبھی جمع نہیں ہوں گے" حضرت ابو امامہؓ کی حدیث کے الفاظ اس سے زیادہ واضح ہیں۔ مگر اس میں عرفہ کی تصریح نہیں، جیسا کہ کنز العمال میں ہے۔

رق، ام الفضل بنت حارث رضی اللہ عنہا میدان عرفات میں سواری پر آپؐ کا دودھ نوش فرمانا | نے دودھ کا ایک پیالہ آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، جو آپؐ نے سب لوگوں کے سامنے اوٹ پر نوش فرمایا، تھقیض بدل میں یہاں بغیر اوٹ کے بجائے ناقہ کے لفظ کی تصویب کی ہے، جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اول قصہ میں آپؐ کا ناقہ تصور پر سوار ہونا مذکور ہے۔ لیکن اور جز میں موطا اور بخاری سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں "بعیر" کا لفظ ہے، ان کی تاویل یہ ہے کہ لفظ بعیر نر اور مادہ دونوں پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ امام راغب اور صاحب قاموس وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ اور نسائی کی روایت میں حمل کا لفظ بھی موقوف ہے اور جز میں یہ بھی ہے کہ "متعدد وجود سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے منافی نہیں کہ چوپائوں کی پشتوں کو منبر بنانے سے احتراز کرو" ابو داؤد ایک وجہ یہ کہ یہی اس صورت پر محمول ہے جب کہ چوپائے کو مشقت لاحق ہو۔ یا یہ کہ عرفہ میں سواری کا مندوب ہونا اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے کہ میرے نزدیک آؤجہ

جواب یہ ہے کہ یہ متنبی کے ذیل کے شعر کے قبیل سے ہے۔

لیت انا اذا ارتحلت الخیل وانا اذا نزلت الخیام

جب تو گھوڑوں پر سوار ہو تو کاش ران کی جگہ میں ہوتا۔ اور جب تو خیموں میں فرش ہو تو کاش ران کی جگہ میں ہوتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سبکے سامنے ناقہ پر دو دو نوش فرمانا حاجی کیلئے عرفہ کے روزے کا حکم | اس امر کے اظہار کے لئے تھا کہ آپ کا روزہ نہیں، متعدد روایات میں۔

جو البذایہ والنہایہ میں ذکر کی گئی ہیں۔ یوم عرفہ میں روزے کی ممانعت آئی ہے۔ اور اس سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف

ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ امام شافعی اور امام مالک فرماتے ہیں کہ روزہ حاجی کے لئے سنت نہیں۔ امام

اسحاق فرماتے ہیں کہ اس کے لئے بھی سنت ہے۔ اور امام احمد فرماتے ہیں کہ اس کے لئے سنت ہے بشرطیکہ

ضعف نہ ہو۔ یہی حکم حنفیہ کے نزدیک ہے۔ اگر دعاؤں سے ضعف کا اندیشہ ہو تو ترک مستحب ہے اور

ایک قول یہ ہے کہ مکہ و تنزیہی ہے انتہی لخصاً۔ ذق جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو بلالؓ کو حکم فرمایا

پس انہوں نے نماز کی اقامت کہی۔ یہ ابن جزم کا قول ہے جو دوسم پر مبنی ہے اور صحیح یہ ہے کہ خطبہ کا تمام

عرفہ تھا جو موقف نہیں۔ اور دو دو پیئے کا قصہ عرفہ کا ہے جو موقف ہے۔

عرفات کا خطبہ ایک ہے یا دو؟ ذق اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی خطبہ دیا

تھا۔ دو خطبے نہیں تھے کہ ان کے درمیان میں بیٹھے، مومن رشتہ داری میں ہے کہ امام دو خطبے پڑھے کیونکہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کیا تھا۔ جمہور کے نزدیک جن میں حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ بھی شامل ہیں۔

یہ دو خطبے ہیں، جیسا کہ اوجز میں ان کی فقہی کتابوں سے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ البتہ ابن قیم کی گزشتہ

بالا عبارت کے علاوہ حنا بلہ کی کتابوں میں مجھے اس کی تصریح نہیں ملی۔ اور موفق کا یہ قول بھی اس کا مؤید

ہے کہ امام ایک خطبہ پڑھے پھر اذان کا حکم کرے، جیسا کہ اوجز میں ہے۔ تعجب ہے کہ علامہ سند فانی مالکی

نے مالکیہ کا یہ قول کیسے نقل کر دیا کہ ان کے نزدیک ایک خطبہ ہے۔ حالانکہ ان کی فقہی کتاب میں اس کے خلاف

ہیں؛ جیسا کہ اوجز میں ہے، خطبہ عرفات کے علاوہ حج کے جو دو خطبے اور ہیں ان میں ہمارے نزدیک

بھی ایک ہی خطبہ ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ پوری بحث تلخیص تبدیل میں ہے۔ اسی میں یہ بھی ہے کہ

اس میں اختلاف ہے کہ یوم عرفہ کا خطبہ نماز کے بعد تھا؛ جیسا کہ امام مالکؓ سے منقول ہے۔ یا نماز سے پہلے

تھا؛ جیسا کہ جمہور کے نزدیک ہے، اور امام مالک سے جو نماز کے بعد ہونا منقول ہے ان کی فقہی کتابوں

رَقَالَ فَلَمَّا اتَمَّهَا أَمْرٌ بِلَا فَاذَنْ فَصَلِّ الظُّهْرَ رَكْعَتَيْنِ وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ -

ترجمہ: (رق) پس جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو بلال کو حکم دیا: پس انہوں نے اذان کہی۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھیں اور عصر کی دو رکعتیں۔

کے خلاف ہے چنانچہ ان میں نماز سے قبل ہونے کی تصریح ہے اس سلسلہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو اختلاف ہے کہ خطبہ نماز سے پہلے ہوتا تھا یا بعد میں، بذیل میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ علماء کا عمل حدیث جابر پر ہے جس میں قبل نماز کی تصریح ہے، اور حدیث ابن عمر معلق ہے جیسا کہ بذیل میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

رق: پس جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو بلال کو حکم دیا پس انہوں نے اذان کہی۔ حافظ ابن قیمؒ نے ان لوگوں کی رائے کو ہم قرار دیا ہے جو اس کے قائل ہیں کہ اذان خطبہ سے پہلے یا خطبہ کے دوران ہوئی۔ ابن قیمؒ کے نزدیک مختاریہ ہے کہ اذان تمام خطبہ کے بعد ہوئی۔ اوجز میں ہے کہ موفق فرماتے ہیں: امام خطبہ دے، پھر اذان کا حکم کرے، پھر اتر کر نماز پڑھے۔ "اھ اور نو دہائی اپنے مناسک میں لکھتے ہیں: جب سورج ڈھل جائے تو امام ظہر سے پہلے دو خطبہ پڑھے، پس جب خطبہ ثانیہ کے لئے اٹھے تو مؤذن اذان شروع کرے۔ اور امام دوسرا خطبہ اتنا مختصر پڑھے کہ اُدھر مؤذن اذان سے فارغ ہو جائے، ادھر امام خطبہ سے اس میں مالکیہ کا اختلاف ہے، جس کی تفصیل اوجز ہے۔ چنانچہ بعض کا قول ہے کہ اذان خطبہ کے بعد ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ دونوں خطبوں کے درمیان ہو، اور بعض کے قول کے مطابق اس وقت کہی جائے جب کہ امام خطبہ میں مشغول ہو، اور خفیہ کے نزدیک جب امام خطبہ کے لئے بیٹھے اس وقت اذان کہی جائے، اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام کے نکلنے سے پہلے اذان کہی جائے۔ اور ان سے ایک روایت یہ ہے کہ خطبہ کے بعد ہو۔ کنانی الہدایہ، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھیں یہاں ابن حزمؒ کو دوہم ہوا ہے، وہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ پڑھا۔ ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ امام ظہر کی نماز پڑھے خواہ جمعہ کا دن ہو جیسا کہ اوجز میں مفصل ذکر کیا گیا ہے۔

اور اساتذہ ہی، عصر کی دو رکعتیں پڑھیں۔ (مفصل ذکر)

عرفات میں اذان اقامت کی تعلیل میں اختلاف نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ہوئیں۔ موفق فرماتے ہیں: خرقی کے اس قول سے کہ اگر اذان دے تو مضائقہ نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی

نماز کے لئے اذان کہنے یا نہ کہنے کا اختیار ہے۔ امام احمد کا یہی قول ہے۔ مگر اذان کہنا بہتر ہے، امام شافعی اور اصحاب رائے کا یہی قول ہے امام مالک فرماتے ہیں کہ ہر نماز کیلئے اذان کہی جائے، اھ اور مسئلہ اقامت میں ناقلین مذاہب کا اختلاف ہے۔ اس مسئلہ میں عینی میں ناقل سے تحریف ہوئی ہے، اور مذاہب کی تفصیل حاشیہ ہدایہ میں نہایت سے نقل کی گئی ہے۔ اور اس میں علماء کے چھ مذہب ذکر کئے گئے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ حنفیہ کا مسلک ایک اذان اور دو اقامتوں کا ہے۔ امام احمد کا راجح قول بھی یہی ہے، جیسا کہ المعنی میں ہے، اور یہی امام شافعی کا مسلک ہے، نووی نے شرح مسلم میں اسکی تصریح کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: پہلی نماز کے لئے اذان کہے اور ہر ایک کے لئے اقامت کہے۔ اور ان دونوں کے درمیان تفریق نہ کرے۔ یہ تمام مسائل ہمارے ہاں متفق علیہ ہیں، اور درویر ہمالکی نے دو اذانوں اور دو اقامتوں کی تصریح کی، چنانچہ فرماتے ہیں: پھر خطبہ سے فارغ ہو تو ظہر کے لئے اذان و اقامت کہے، درناحالیکہ امام منبر پر ہو، جب اقامت سے فارغ ہو تو امام منبر سے اترے اور ظہر و عصر کو جمع کرے یا اس طور کہ عصر کے لئے الگ اذان و اقامت ہو، خلاصہ یہ کہ جمع عرفا میں ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ایک اذان اور دو اقامتیں ہوں گی۔ اور ایک کے نزدیک دو اذانیں اور دو اقامتیں۔ اس نماز میں اہل مکہ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی تھی، جو لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد فرمایا تھا کہ: اپنی نماز پوری کر لو، یہ وہم ہے کیونکہ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ میں فرمائی تھی: یہ بات الہدیٰ میں شیخ ابن قیم نے کہی ہے اور ان سے پہلے یہی بات ان کے شیخ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں کہی ہے، اور صاحب البدایہ والنہایہ نے اسی پر جزم کیا ہے شیخ ابن قیم کہتے ہیں: اسی بنا پر علماء کا صحیح قول یہ ہے کہ اہل مکہ عرفات میں قصر اور جمع کریں گے۔ اور یہ اس امر کی واضح تردید ہے کہ سفر کسی معین مسافت یا معین ایام کے ساتھ محدود نہیں، اور نماز کے قصر میں مناسک حج اذکار اور تہنّیں میں کہتا ہوں کہ شیخ ابن قیم کے کلام میں یہ بحث ہے کہ ابو داؤد و طیالسی کی روایت کے مطابق حضرت عمران بن حصین کی حدیث کے بعض طرق میں یہ الفاظ ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین اور طائف میں حاضر ہوا تو آپ دو رکعتیں پڑھ رہے تھے۔ پھر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج و عمرہ کیا۔ آپ نے دو رکعتیں ہی پڑھیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اہل مکہ! تم اپنی نماز پوری کر لو ہم مسافر ہیں، پھر میں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج و عمرہ کیا۔ انہوں نے دو رکعتیں

پڑھیں پھر (سلام پھیرنے کے بعد) کہا: اپنی نماز پوری کر لو ہم مسافر ہیں۔ ۱۰۱: اس حدیث میں اگرچہ منیٰ یا عرفہ کی تصریح نہیں رہا، تاہم اتنی تصریح تو موجود ہے کہ حج کے موقع پر بھی یہ ارشاد فرمایا تھا۔

منیٰ اور عرفات میں قصر اور جمع کے سبب میں اختلاف | پھر اس میں اختلاف ہے کہ عرفات میں قصر اور جمع کا سبب افعال حج ہیں یا سفر؟ ابن قیم کا میلان

اس طرف ہے کہ یہ دونوں سفر کی وجہ سے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک نہ کسی متعین مسافت کی تحدید ہے نہ دونوں کی۔ اور میرے نزدیک یہی امام مالک کے قول کا حاصل ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ اور اوجز میں اس پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور ہمارے احناف کے نزدیک دونوں نمازوں کو جمع کرنے کا سبب افعال حج ہیں اور قصر کا سبب سفر ہے۔ اوجز میں ہے کہ: اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ اہل مکہ منیٰ میں پوری نماز پڑھیں گے یا قصر کریں گے، امام مالک فرماتے ہیں کہ مکہ میں پوری پڑھیں اور منیٰ میں قصر کریں۔ اسی طرح اہل منیٰ منیٰ میں پوری پڑھیں اور مکہ و عرفات میں قصر کریں۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ مقامات اس مسئلہ کے ساتھ مخصوص ہیں کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ میں قصر پڑھی تو اپنی اقتداء میں ملا امتیاز سب لوگوں نے نماز قصر پڑھی۔ یہ مسئلہ کہ اہل مکہ منیٰ میں قصر کریں گے حضرت ابن عمر وغیرہ اور امام افراعی اور اسحاقؒ سے بھی منقول ہے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ قصر ہی ان مقامات میں سنت ہے۔ منیٰ اور عرفات میں صرف وہ لوگ پوری نماز پڑھیں گے جو وہاں مقیم ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور اکثر اہل علم اس کے قائل ہیں کہ اہل مکہ منیٰ اور عرفات میں قصر نہیں کریں گے کیونکہ مسافت سفر منقود ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اکثر شروح میں یہ بات زبان زد ہے کہ امام مالک کے نزدیک قصر افعال حج کی وجہ سے ہے سفر کی بنا پر نہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں جیسا کہ اوجز میں مالکیہ کی فقہی کتابوں سے تفصیل نقل کی گئی ہے۔ اور حاشیہ لامع میں ہے: ”اور میرے نزدیک اوجز یہ ہے کہ قصر امام مالک کے نزدیک بھی سفر ہی کی وجہ سے ہے جیسا کہ خود امام مالک نے مؤطا میں تصریح کی ہے، وہ فرماتے: ”نماز یوم عرفہ میں ظہر ہی کی ہے مگر سفر کی وجہ سے کم ہو گئی۔“ یہ امام مالک کی جانب سے صاف تصریح ہے۔ البتہ مکہ سے منیٰ، منیٰ سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ، مزدلفہ سے منیٰ اور وہاں سے مکہ آنے جانے کو امام مالک سفر واحد سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ احرام کی وجہ سے لازم ہے۔ ورنہ اگر قصر افعال حج کی وجہ سے ہوتا تو مکہ اور اور منیٰ کے حجاج اپنے وطن میں بھی قصر کرتے۔“ اھ

یہ تمام بحث تو قصر کی تھی، بلکہ دونوں نمازوں کو جمع کرنا؛ سو وہ ہمارے احناف کے نزدیک بھی افعال حج کی وجہ سے ہے، البتہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کے لئے چند شرائط ہیں۔ جن کی تفصیل حاشیہ لامع میں ذکر کی گئی ہے، اور بخاری میں ہے کہ: ابن عمرؓ سے جب امام کے ساتھ نماز فوت ہو جاتی تب بھی جمع کرتے، شیخ لامع فرماتے ہیں: یہ ان کا اجتہاد تھا۔ اور ہمارے نزدیک جمع چند شرائط کے بغیر حوالپنے محل میں مذکور ہیں جائز نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جمع بین الصلوٰتین اس قیاس کے خلاف ہے جو نص سے ثابت ہے، اور وہ ہے: حق تعالیٰ کا ارشاد: "ان الصلوٰۃ كانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً"۔ بے شک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے، لہذا دونوں نمازوں کا جمع کرنا مؤثر نہیں تک ہی محدود ہے گا اور اس کا تعدیہ صحیح نہ ہوگا کہ منفرد وغیرہ کے حق میں بھی جائز ہو۔ جو مورد نص کے حکم میں نہیں: ۱۷

اور اس کے حاشیہ میں ہے: "پس اگر اس کو امام کے ساتھ نماز نہ ملے تو اپنی جگہ نماز پڑھے۔ حاصل یہ کہ منفرد بھی اسی طرح دونوں نمازوں کو جمع کرے جس طرح امام کے ساتھ جمع کرے گا۔ یہ امام شافعیؒ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور صاحبین کا قول ہے۔ اور امام ثوریؒ، امام نخعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ امام کے بغیر جمع کرنا صحیح نہیں؛ اور ہدایہ میں ہے کہ: جس شخص نے اپنی قیامگاہ میں تنہا نماز پڑھی، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ عصر کو اس کے وقت میں پڑھے۔ اور صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ منفرد بھی دونوں نمازوں کو جمع کرے۔ کیونکہ دونوں نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا اس مقصد کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے تاکہ وقوف کے لئے زیادہ وقت میسر آئے، اور منفرد بھی اس کا محتاج ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ وقت کی پابندی کا فرض ہونا نصوص سے ثابت ہے۔ لہذا اس کا ترک کرنا صرف اس صورت میں جائز ہوگا جس میں شریعت رکاستثنائی محکم، وارد ہو۔ اور وہ صرف امام کی معیت میں جماعت کے ساتھ جمع کرنے کی صورت میں وارد ہے"۔ ۱۸۔ اور صاحب لباب نے جمع عرفات کی چھ شرطیں ذکر کی ہیں۔ ان میں سے بعض تو ہمارے ائمہ کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ اور بعض میں اختلاف ہے۔ میں نے حاشیہ لامع میں ان کو ذکر کر دیا ہے۔

فلما فرغ ركب حتى اتى الموقف واستقبل القبلة، وهنالك اقبل اهل نجد
ترجمہ: پس جب فارغ ہوئے تو سوار ہو کر موقف میں پہنچے۔ اور قبلہ کی طرف رخ کیا۔ اسی موقع پر اہل نجد آئے۔

پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو قصود پر سوار ہو کر
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وقف عرفات | موقف میں پہنچے جبل حمت کے نیچے چٹانوں کے پاس
وقف فرمایا۔ زرقانی نے عذرات پر قصود کے جانے قیام کو تفصیل سے لکھا ہے۔ نیز ابن عابدین اور حبش
شفار الغرام نے بھی خوب مفصل لکھا ہے۔ اور قبلہ کی طرف رخ کیا اور دعا و تضرع میں مشغول ہوئے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر جو دعائیں فرمائیں انہیں صاحب الہدایہ والنبایہ نے اور
زرقانی نے شرح مواہب میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔

اسی موقع پر اہل نجد کے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے حج کے
حج وقف عرفہ کا نام ہے | بارے میں دریافت کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”حج (وقف) عرفہ کا نام ہے الخ“ کہ کافی الہدیٰ۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث معروف ہے جس کو ابو داؤد و نسائی اور ترمذی
وغیرہ نے روایت کیا ہے اس کی روایات کے الفاظ کا اختلاف بدل میں مفصل ذکر کیا ہے۔

اور اجز میں ہے کہ اس پر امت کا اجماع ہے کہ وقف عرفہ
وقف عرفہ بالا جماع رکن ہے | رکن ہے اس کے بغیر حج پورا نہیں ہوتا۔ بہت سے شارحین
حدیث اور ناقلین مذہب نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کے درمیان ذرا بھی
اختلاف نہیں بجز اس کے جو امام رازی نے حسن بصریؒ سے نقل کیا ہے کہ وقف عرفہ واجب ہے
اور اگر یہ فوت ہو جائے تو تمام حرم کا وقف اس کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔ اور دیگر تمام
فقہاء نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور ان کا اس پر اتفاق ہے کہ حج وقف عرفہ کے
بغیر ادا نہیں ہوگا۔

البتہ علماء کا اس سلسلہ میں چند مسائل میں اختلاف ہے۔ اول یہ
وقف عرفہ کا وقت | مسئلہ کہ عرفہ کا حدود اربعہ کیا ہے؟ اجز میں اس کو مفصل ذکر کیا ہے حرم
یہ مسئلہ کہ وقف عرفہ کا وقت کب تک ہے۔ اجز میں اس کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد آخر میں
لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ فرض وقت کے اختلاف کا حاصل تین اتوال ہیں۔ اول، یوم

عرفہ کی صبح صادق سے یوم النحر کی صبح صادق تک یہ امام احمد کا قول ہے۔
دوم شنب یوم النحر۔ غروب سے طلوع صبح تک۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔
سوم: یوم عرفہ کے روال سے یوم النحر کی صبح صادق تک۔ یہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا قول ہے اور بعض نے اس پر اجماع بھی نقل کیا ہے۔

اور وقت وجوب میں دو قول ہیں۔ اول رات اور دن کو جمع کرنا۔ خواہ ان دونوں کے کسی بھی وقت میں حاصل ہو۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ جیسا کہ درویر نے تصریح کی ہے۔
اور صاحب الرض المربع نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور نووی نے اپنے مناسک میں اسی کو ذکر کیا ہے۔

دوم حنفیہ اور عامہ حنابلہ کا قول ہے کہ جب دن کو وقوف کیا ہو تو اس کو مابعد غروب تک لمبا کرنا واجب ہے۔ ملا علی قاری اور المغنی وغیرہ نے اسی کو ذکر کیا ہے اور اگر دن کو وقوف کا اتفاق نہیں ہوا تو رات میں لمبا کرنا واجب نہیں۔

وقوف عرفات کی حکمت | کرنے کی رکعتیں ذکر کی گئی ہیں مگر سب سے بہتر حکمت اس ناکارہ کے نزدیک یہ ہے کہ عرفات ہی وہ جگہ ہے جہاں ”عہد الست“ ہوا تھا۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں بروایت احمد حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ نے موضع نعمان یعنی عرفہ میں اولاد آدم سے عہد لیا۔ الحادیث۔ گویا وقوف عرفات کے ذریعہ وہ عہد یاد دلایا جاتا ہے۔ جو اسی جگہ اولاد آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے لیا گیا تھا۔ یہاں اس بات پر توجہ کرنا بھی مناسب ہے کہ

عرفات کے علاوہ کسی اور جگہ عرفہ منانا | ہمارے نزدیک تعریف مکروہ ہے و تعریف سے مراد یہ ہے کہ جس طرح عرفہ کے دن حجاج وقوف عرفہ کرتے ہیں۔ ان کی نقل اتارنے کے لئے دوسرے لوگ بھی اپنی بستی سے نکل کر کسی کھلے میدان میں جمع ہوں، جیسا کہ فقہ حنفی میں تصریح ہے، اور مالکیہ کے نزدیک اس میں کوئی مضائقہ نہیں، جیسا کہ الدسوقی میں ہے۔ اور شرح منہب میں ہے کہ غیر عرفات میں عرفہ منانے میں سلف کا اختلاف ہے، ائمہ کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبلؓ سے اس کے بارے میں

وہناك استجيب دعاء المغفرۃ فيما عدا المظالم، وہناك سقط رجل عن راحلته فما
توجہ: اور اس جگہ باہمی حق ملیغیوں کے ماسوا میں دعائے مغفرت قبول ہوئی۔ اور اسی جگہ ایک
آدمی اپنی سواری سے گر کر جان بحق ہو گیا۔

دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اور حسن، ثابت اور ان
کے علاوہ کئی حضرات یہ عمل کیا کرتے تھے کہ وہ عرفہ کے دن مسجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور ایک جماعت
نے جن میں نافع بنی، حماد اور مالک بن انس وغیرہ شامل ہیں، اس کو مکہ و قمرار دیا ہے اور ابو بکر طرطوشی
مالکی نے بدعات منکرہ پر ایک کتاب لکھی ہے اور ان بدعات میں اس تعریف کو بھی ذکر کیا ہے۔

اور اس جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت
باہمی حق ملیغیوں کے ماسوا میں دعائے مغفرت کا قبول ہونا کے لئے دعائے مغفرت فرمائی چنانچہ انسانوں کی،
باہمی حق ملیغیوں کے ماسوا میں دعا آپ کی، دعائے مغفرت قبول ہوئی، جیسا کہ انھیں البدایہ والنہایہ۔ اور
نزد قانی کی شرح مواہب میں ہے اور مزدلفہ میں حقوق کے بارے میں بھی دعا قبول ہوئی، جیسا کہ آگے مفصل
آتا ہے۔

اور اسی جگہ مسلمانوں میں سے ایک آدمی جس کا نام غیر معروف
عرفات میں ایک حاجی کا انتقال ہے، بحالت احرام اپنی سواری سے گر کر جان بحق ہو گیا آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ اس کو احرام کی دونوں چادروں میں دفن کیا جائے۔ یہ حدیث تمام
کتابوں میں معروف ہے۔ اس قصہ سے کئی احکام ثابت ہوتے ہیں، جن میں سے بارہ حکم حافظہ نے
تفصیل سے ذکر کئے ہیں۔ ان میں سے دو مسئلے معروف ہیں اول یہ کہ محرم کے لئے چہرے کا ڈھانکنا
مختلف فیہ ہے۔ امام شافعی اور ایک روایت میں امام احمد اس کو جائز کہتے ہیں۔ اور امام مالک،
امام ابو حنیفہ اور ایک روایت میں امام احمد اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ یہاں ایک تیسرا مذاہب
ہے کہ اگر زندہ ہو تو ڈھانکنا جائز ہے اور مر جائے تو ناجائز۔ یہ ابن حزم کا قول ہے۔
میں کہتا ہوں کہ خفیہ کا مسلک یہ ہے کہ زندہ کے لئے جائز نہیں اور مرنے کے بعد جائز ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ موت کے بعد احرام باقی رہتا
موت کے بعد احرام باقی رہتا ہے یا نہیں؟ ہے یا نہیں؟ چنانچہ امام شافعی اور امام احمد نزدیک
موت کے بعد احرام باقی رہتا ہے۔ اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک موت احرام ختم ہو جاتا ہے۔

شیخ قدس سرہ نے کوکبِ دُری میں اس مسئلہ پر بہت عمدہ اور لطیف کلام کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں علماء نے اختلاف کیا ہے، بعض حضرات بشمول امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا احرام باقی رہتا ہے اور بعض حضرات جن میں حضرت امام بھی شامل ہیں۔ فرماتے ہیں کہ موت سے احرام پورا رہ کر ختم ہو جاتا ہے، امام شافعیؒ اور ان کے موافقین کا استدلال اس حدیث سے ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا منہ ڈھانکنے کی ممانعت فرمائی اور اس کی علت یہ بیان فرمائی کہ وہ قیامت کے دن تلبیہ تہلیل کہتا ہوا اٹھے گا۔ اور امام صاحبؒ اور ان کے موافقین فرماتے ہیں کہ دنیوی احکام کے اعتبار سے اس کا احرام منقطع ہو چکا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ ماسوائے چیزوں کے، صدقہ جاریہ، یا ایسا عمل جس سے نفع اٹھایا جائے، یا نیکیتِ اولاد جو اس کے لئے دعا کرے۔ یہ ارشاد نبویؐ اپنے عموم کے اعتبار سے محرم کو بھی شامل ہے۔ رہا یہ واقعہ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ احرام ختم نہیں ہوتا، بلکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ ان صاحبِ کھشت ہو۔ اس بات کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو اسی حدیث میں وارد ہے جس سے یہ حضرات استدلال کرتے ہیں۔ یعنی آپؐ نے ارشاد فرمایا: اس کو پانی اور میری کے پتوں سے غسل دو۔ چونکہ میری کے پتے میل کچیل کو صاف کرتے ہیں، سر کی جوڑوں کو مارتے اور بالوں کو نرم کرتے ہیں اس لئے ان کا استعمال محرم کے لئے ممنوع ہے، جب کہ ان صاحب کو اس سے غسل دیے کا حکم فرمایا ہے۔ رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی کہ: وہ قیامت کے دن تلبیہ پڑھتے ہوئے اٹھے گا۔ اس سے ان حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ اس جملہ میں اس کا سر نہ ڈھکنے کی علت بیان فرمائی ہے یعنی اس کے احرام کا باقی ہونا۔ مگر یہ ظاہر نہیں، نہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے، بلکہ اس میں نا تعقیب کے لئے ہے جو صرف ایک فضیلت کو بیان کرنے کے لئے لائی گئی ہے۔ اور اس جملہ سے ان صاحب کی نیز ہر اس شخص کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے جو کسی نیک عمل کی حالت میں مر جائے کہ وہ اسی حالت میں اٹھایا جائے گا گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو نیکیاں جمع کرنے اور گناہوں سے پرہیز کرنے کی ترغیب دی۔ کیونکہ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس وقت لقمہ اجل اور نشانہ حوادث بن جائے۔ اور یہ تو سب کو مستمم ہے کہ لوگ جن احوال و اعمال میں مرے ہوں گے قیامت کے دن انہیں حالات میں اٹھیں گے۔ اس صورت میں اس شخص کا قیامت کے دن تلبیہ کہتے ہوئے اٹھنا منہ کے نہ ڈھانکنے پر موقوف نہیں، بلکہ ہر دو صورت

وهناك نزلت عليه اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم
الاسلام دينًا »

ترجمہ: اور اسی جگہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی: الیوم اکملت الخ یعنی آج کے دن تمہارے
لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا۔ اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین
بننے کے لئے پسند کر لیا۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

میں وہ بلبلیہ کہتے ہوئے اٹھے گا۔ دیکھئے ایک شخص کا انتقال سجدہ کی حالت میں ہو جاتا ہے تو وہ قیام
میں بجا لیتا سجدہ اٹھے گا۔ کیا ہمارے لئے جائز ہو گا کہ ہم اسے قبر میں نہ لٹائیں کیونکہ اسے سجدہ کی
حالت میں اتھنا ہے؟ اس لئے کیا اسے اسی حالت میں رکھ دیا جائے گا؟ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ بس
اسی طرح محل متنازعہ میں سمجھنا چاہیئے، حاصل یہ کہ احکام دنیویہ کو آخرت کے احکام پر قیاس نہیں
کیا جاسکتا۔ اس لئے یہ شخصی واقعہ اس قاعدہ کلیہ کو دفع نہیں کر سکتا، جب کہ اس میں دیگر احتمالات
بھی ہیں۔ جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انتہی۔

(ق) اور اسی جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت
آیت: الیوم اکملت لكم دينكم کا نازل ہونا | نازل ہوئی: الیوم اکملت الخ یعنی آج کے دن

تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا۔ اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا۔ اور میں نے اسلام
کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ) اس آیت کے نازل ہونے پر ناقد بیٹھ گئی۔
کذا فی الخبیس، اور سچوہ الحافل میں ہے کہ اس آیت کا نزول جمعہ کے دن عصر کے بعد ہوا۔ اس وقت نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناقہ عسبار پر عزفات میں وقوف فرما تھے۔ نزول آیت کے وقت قریب تھا کہ
شدتِ ثقل کی وجہ سے اس کی ٹانگیں ٹوٹ جائیں۔ اس لئے ناقہ نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ صحیح بخاری میں
طارق بن شہاب سے روایت ہے کہ یہ وہی حضرت عمرؓ سے کہا کہ تم ایک آیت پڑھتے ہو اگر وہ ہمارے
ہاں نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کے نازل ہونے کے دن کو عید بنا لیتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے
خوب معلوم ہے کہ وہ کس جگہ نازل ہوئی؟ کب نازل ہوئی؟ اور اس کے نزول کے وقت آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم کہاں تشریف فرما تھے؟ یہ آیت جمعہ کے دن نازل ہوئی اور اللہ امیں اس وقت عرفہ
میں تھا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ جمعہ کا دن تھا۔ اور اس میں پانچ عبیدیں جمع تھیں، جمعہ، عرفہ،

فلما غربت الشمس افاض من عرفة

ترجمہ: پس جب آفتاب غروب ہوا تو عرفات سے چلے۔

عیدِ یہود، عیدِ نصاریٰ، عیدِ مجوس۔ تمام اہل ملل کی عیدیں نہ اس سے پہلے کبھی جمع ہوئیں نہ اس کے بعد۔
ہارون بن عترة اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب
اس آیت کے نازل ہوئے حضرت عمرؓ کا رونا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب دریافت کیا۔ تب عرض کیا: "رونا تو اس کا ہے کہ اب
تک تو ہمارے دین میں ترقی و اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن اب وہ کامل ہو چکا اور قدرتی بات ہے کہ جب
کوئی چیز حد کمال کو پہنچ جاتی ہے تو دہر کمالے راز والے کے مطابق، اس میں کمی اور تنزل شروع
ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا سچ کہتے ہوئے اس آیت کے بعد حلال و حرام اور فرائض و احکام کی کوئی
آیت نازل نہیں ہوئی۔ اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیاسی دن اس عالم فانی میں رہے
یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے گویا پیغام وصال تھا۔ اصر

پس جب آفتاب غروب ہوا، اور اچھی طرح غروب ہو گیا، تو عرفات سے چلے۔

موافق فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص غروب سے پہلے چل پڑے
تو جماعت فقہاء کے قول میں اس کا حج صحیح ہے۔ البتہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کا حج نہیں ہوا،
ابی عبد اللہؒ فرماتے ہیں کہ فقہاء اصحاب میں سے کسی کا ہمیں علم نہیں جو امام مالکؒ کے قول کا قائل ہو۔
موفق آگے لکھتے ہیں: جو شخص غروب سے پہلے چل پڑے اکثر اہل
غروب سے پہلے عرفات سے چلنا

اور ان کے متبعین کا یہی مذہب ہے۔ "نیز وہ فرماتے ہیں: لوگوں کو امام سے پہلے چلنا مناسب نہیں۔
امام احمد کا قول ہے کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ کوئی شخص امام سے پہلے جائے، ان سے دنیا
کیا گیا کہ ایک شخص غروب کے بعد امام سے پہلے چل دیتا ہے تو فرمایا کہ میں نے کسی عالم کو نہیں پایا کہ
وہ اس معاملہ میں نرمی کرتا ہو، سب ہی سختی کرتے ہیں۔ "ہمداء حنفیہ کا مسلک، جیسا کہ انکی کتابوں
میں ہے کہ اگر کوئی شخص غروب آفتاب سے پہلے حدود عرفہ سے نکل جائے تو اس کے ذمہ دم لازم
ہے، کیونکہ بعد غروب تک عرفہ میں ٹھہرنا واجب ہے۔ جیسا کہ عنقریب گذرا۔ اور شرح کتاب

من طریق المازمین۔
ترجمہ: مائذین کے راستے سے۔

میں مزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلنے کے بیان میں ہے: ”حاصل یہ کہ مزدلفہ سے امام کے ساتھ چلنا سنت ہے۔ بخلاف عرفہ کے، کہ وہاں سے امام کے ساتھ چلنا واجب ہے۔“

مزدلفہ پہنچنے سے پہلے مغرب کی نماز پڑھنے کا حکم | باقی رہا نماز مغرب کا مسئلہ؟ تو موقوف فرماتے ہیں: ”جو شخص عرفہ سے چلے اس کے لئے سنت یہ ہے کہ مزدلفہ پہنچنے سے پہلے مغرب نہ پڑھے اور مزدلفہ پہنچ کر مغرب عشاء کو جمع کرے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔“ کذا فی الاوجز۔ اور ”باب النزول بین عرفہ والمزدلفہ“ کے ذیل میں حافظ نقل کرتے ہیں کہ: ”حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ”نماز نہیں مگر مزدلفہ میں“ اور کوفیین اور ابن قاسم سے منقول ہے کہ اگر کسی نے مزدلفہ سے پہلے پڑھ لی تو عادیہ واجب ہے۔ اور امام احمد سے مروی ہے کہ اگر پڑھ لی تو صحیح ہوگی۔ امام ابو یوسفؒ اور جہور کا یہی قول ہے۔“ اور اوجز میں ہے کہ مزدلفہ پہنچنے سے پہلے مغرب پڑھ لی اور مغرب و عشاء کو جمع نہیں کیا تو اس نے سنت کے خلاف کیا مگر نماز صحیح ہوگی۔ یہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام اسحاقؒ اور ابو یوسف کا قول ہے، اور امام ابو حنیفہؒ اور امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ: نماز صحیح نہیں ہوگی۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے۔ اور حنفیہ کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”نماز تمہارے آگے ہے۔“ جو عنقریب آتا ہے۔

مازین کا راستہ | عرفات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی، مازین کے راستے سے (دہوئی)، شرح لباب کے حوالے سے پہلے گزرا چکا ہے۔ کہ عرفہ کی طرف ”صَبَّ“ کے راستے سے جانا اور وہاں سے مازین کے راستے سے واپس آنا مستحب ہے۔ زرقانی کہتے ہیں کہ: ”مازین، بیم کا فتح، ہمزہ کا سکون، نا کا کسرہ۔ اس کے بعد میم مفتوح۔ پھر نون ثمنیہ عرفہ اور مزدلفہ کے امین ایک معروف جگہ ہے۔“ نو دہی شرح جندب میں فرماتے ہیں: ”مزدلفہ کی طرف جانے میں ”مازین“ کا راستہ سنت ہے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ نے تصریح کی ہے، صَبَّ کا راستہ سنت نہیں۔“ اختصاراً

وارد فاسامۃ بن زید و نزل فی اثناء الطریق فبال۔

ترجمہ: اور اسامہ بن زید کو اپنے پیچھے سوار کیا۔ اور اثنا راہ میں سواری سے اتر کر پیشاب کیا۔

(رق) اسی طرح عیدین میں راستہ بدلتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی (ش) امام بخاری نے اس پر یہ عنوان قائم کیا ہے: باب من خالف الطریق اذا جمع یوم العید حاشیہ لایح میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ اور اس میں بحوالہ حافظ اس کی حکمت میں بیس سے زیادہ اقوال نقل کئے ہیں۔ نقل کئے ہیں۔

اور اسامہ بن زید کو اپنے پیچھے سوار کیا۔ اور نہایت سکون سے روانہ ہوئے۔ ناذہ کی جہاڑ کھینچ رکھی تھی۔ تاکہ وہ تیز نہ چلے۔ یہاں تک کہ اس کا سر کچا دے کے اگلے حصہ سے لگ جاتا تھا۔ آپ کی سواری متوسط رفتار سے چل رہی تھی۔ کسی جگہ راستہ کشادہ ہوتا تو اس کی رفتار قدرے تیز کر دیتے۔ اور کہیں ٹیلا آتا تو اس کی جہاڑ ڈھیلی چھوڑ دیتے۔ تاکہ اس کے لئے چڑھائی آسان ہو۔

لوگ دائیں بائیں اونٹوں کو دوڑا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف التفات فرماتے اور ہلکا اشارہ کرتے **آنحضرت کا ارشاد علیکم السکینۃ** ہوئے ارشاد فرماتے: ”لوگو! سکون اور وقار کو لازم پکڑو“ یہ ترمذی کی روایت ہے اور ابو داؤد کی روایت میں لا یتفت البہم کے لفظ ہیں یعنی آپ لوگوں کی طرف التفات نہیں فرماتے تھے۔ شیخ نے بدل میں ابو داؤد کی روایت کو وہم قرار دیا ہے۔ کیونکہ اکثر روایات ”نہیں“ کے لفظ سے خالی ہیں اور اگر یہ لفظ صحیح ہو تو اس کی توجہ یہ ہوگی کہ بعض اوقات التفات فرماتے تھے۔ اور بعض اوقات التفات نہیں کرتے تھے۔ ابو الطیب شارح ترمذی، محب طبری سے نقل کرتے ہیں کہ ترمذی کی روایت زیادہ صحیح ہے۔ جس میں لا کا لفظ نہیں۔ میرے والد نور اللہ مرقدہ نے حضرت امام ربانی کی تقریر ابو داؤد میں لکھا ہے کہ: ”صرف چہ کسرۃ انور کے ساتھ التفات فرماتے تھے۔ پورے جم کے ساتھ نہیں“

اور اثنا راہ میں سواری سے اتر کر پیشاب کیا۔ اور

اثنا راہ میں پیشاب کے لئے اترنا اور دو حدیثوں میں تعارض کا حل، اور جہیز میں ہے کہ اس پر یہ اشکال ہے کہ ابو داؤد اور منذ احمد میں حضرت شریف سے مروی ہے کہ سعفات سے واپسی میں بیس

و توضحاء

ترجمہ: اور وضو کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ پس آپ کے قدم مبارک زمین پر نہیں لگے۔ یہاں تک کہ آپ مزدلفہ پہنچ گئے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ علامہ طبری فرماتے ہیں کہ اس سے مقصود اس امر کا بیان کرنا ہے کہ عرفات سے مزدلفہ تک کا سفر سواری پر ہوا۔ لہذا اتر کر وضو کرنے کی روایت اس کے خلاف نہیں۔ تاہم حاصل یہ کہ عرفات سے مزدلفہ تک کی مسافت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوار ہونے کو خوب مبالغہ سے بیان کرنا مقصود ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ساری مسافت سواری پر طے کی۔ اور پیدل نہیں چلے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ سواری سے اترے ہی نہیں۔ لہذا یہ حدیث، حدیث اسامہ کے معارض نہیں۔ صاحب عون المعبود نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روایف تھے اس لئے ان کی حدیث کو ترجیح ہے۔ مگر یہ جواب بعید ہے کیونکہ حضرت ثمر بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں تصریح ہے کہ وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ لہذا یہاں ایک دوسرے پر ترجیح ممکن نہیں۔ کذا افادہ الشیخ فی البذل۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اثنا وراہ میں سواری سے اترنا مزدلفہ سے پیچھے شعب الایسرہ کے پائوں تھا۔ جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے، زرقانی فرماتے ہیں یہ شعب اذاخر ہے، اذاخر سمرہ اور ذال مفتوح پھر الف اور فار مکسورہ، پھر راز [جو ازمین کے درمیان ملتے کی بائیں جانب ایک جگہ ہے]۔ تاہم یہ امر ادنیٰ خلفائے بنو امیہ کی فرد گاہ تھی، کیونکہ وہ یہاں اترتے اور مغرب کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ حافظ فرماتے ہیں کہ الفا کہی نے حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ کو پیشاب گاہ بنایا تھا۔ اور تم نے اس کو نماز گاہ بنا لیا ہے“ گویا ان لوگوں پر اعتراض کرنا مقصود ہے جو جمع بین الصلوٰۃین کو ترک کرتے تھے۔ اور ابو داؤد کی روایت میں حضرت اسامہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ”ہم اس گھاٹی میں آئے جس میں نزول شب کے لئے لوگ اونٹ بٹھاتے ہیں“ (الحمد للہ)

اور ہلکا پھلکا وضو کیا۔ اور بخاری کے الفاظ یہ ہیں: اور وضو میں اسباغ نہیں فرمایا۔

ابوداؤد کے لفظ یہ ہیں: پس ایسا وضو کیا جس میں زیادہ مبالغہ نہیں تھا، اور جز میں اس پر بڑی تفصیل سے

کلام کیا ہے کہ اس سے مراد وضو شرعی ہے بعض اعضاء کے اعتبار سے وضو لغوی، یا استنجاء زیادہ مناسب یہ ہے کہ وضو شرعی مراد لیا جائے کیونکہ لغوی وضو کو وضو خفیف نہیں بلکہ وضو ناقص کہا جاتا ہے۔ اور استنجاء بھی مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ حضرت اسامہ کا یہ ارشاد و کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پانی ڈالا، اس مراد کے منافی ہے، اور ابن عبد اللہ کا یہ اعتراض لازم نہیں آتا کہ ایک نماز کے لئے دو مرتبہ وضو مشروع نہیں۔ کیونکہ دوبارہ وضو نئے حدث کی وجہ سے کیا ہو گا۔ نیز یہ بھی متفق علیہ نہیں کہ نیا وضو صرف اس شخص کے لئے مشروع ہے جو پہلے وضو سے فرض یا نفل نماز ادا کر چکا ہو۔ پہلا وضو اپنے محض اس لئے کیا تھا کہ طہارت کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔ بالخصوص اس حالت میں تو بقاء طہارت بہت ہی اہم تھی۔ کیونکہ ذکر الہی کی ضرورت بہت زیادہ تھی۔ اور پہلا وضو اس لئے کیا کیونکہ پانی اس موقع پر کم تھا، الی آخر یا بسط فی الاوجز۔

فائدہ: حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ جس پانی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آبِ زمزم سے وضو اس موقع پر وضو کیا تھا، وہ مارِ زمزم تھا۔ جیسا کہ عبد اللہ بن احمد نے زوائد میں احمد میں حضرت علیؓ سے بسند حسن نقل کیا ہے، اس سے ان لوگوں کی تردید ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ مارِ زمزم کا استعمال پینے کے علاوہ ممنوع ہے۔ ابن حجر شرح مناسک میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا تو ہے مگر جب تک یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پانی موجود تھا مگر اس کے باوجود آپ نے زمزم سے وضو کیا تب تک یہ استدلال قائم نہیں۔ ورنہ یہ احتمال بھی ہے کہ آپ کا آبِ زمزم سے وضو کرنا اس لئے تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی پانی آپ کے پاس نہ تھا۔ اس لئے اسی سے وضو کرنا پڑا، میں کہتا ہوں کہ علاوہ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استعمال پر دوسروں کے استعمال کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ بالخصوص جب کہ آپ کے فضلات کی طہارت کا قول راجح قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ اختیار میں جو ”زمزم سے استنجاء مکروہ ہے غیسل مکروہ نہیں“ نیز ورنہ اختیار میں ہے کہ مارِ مطلق اور مارِ زمزم سے رفعِ حدث کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ امام احمد سے روایت ہے کہ مکروہ ہے، ابن عابدین فرماتے ہیں: پہلے قول سے استفادہ ہوتا ہے کہ نفی کراہت رفعِ حدث سے مخصوص ہے۔ ازالہ نجاست کا حکم نہیں، پوری تفصیل اوجز میں ہے۔ اور شرح کتاب میں ہے: مارِ زمزم بکثرت پینا مستحب ہے اور زمزم میں نظر کرنا عبادت ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مارِ زمزم سے وضو اور غیسل بلا کراہت جائز ہے البتہ امام احمد کا اس میں اعتقاد

فقال اسامة الصلوٰۃ یا رسول اللہ قال المصلی امامک۔ ثم سار فاتی المزدلفة
توجہ: حضرت اسامہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ نماز فرمایا نماز کی جگہ تمہارے آگے ہے: پھر روانہ ہوئے۔

مزدلفہ پہنچنے

ہے اور مسح، غسل اور تجدید وضو کے لئے نزم کا استعمال بقصد تبرک ہونا چاہیے۔ اور صرف پاک چیز پر
اسے استعمال کیا جائے۔ اس لئے ناپاک کپڑا دھونا، غسل جنابت کرنا۔ اور بے وضو کا وضو کرنا یا کسی ناپاک
جگہ میں اس کو استعمال کرنا اچھا نہیں۔ اور اس سے استنجا کرنا مکروہ ہے۔ بلکہ بعض علماء نے اس کو حرام کہا ہے۔
اور کہا جاتا ہے کہ بعض لوگوں نے اس سے استنجا کیا۔ تو بواسطہ کلامی پیدا ہو گیا: انتہی مختصراً
نودہی شرح ہند میں فرماتے ہیں: پس جہور کا مذہب ہمارے مذہب کی طرح یہ ہے کہ اس سے غسل
اور وضو مکروہ نہیں۔ امام احمد سے ایک روایت ہے کہ مکروہ ہے۔ معنی نے دونوں روایتوں کو نقل کر کے
جواز کو ترجیح دی ہے۔ اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ اس کا شرف اس کے استعمال کی کراہت کا موجب نہیں۔
جیسا کہ اس پانی کا استعمال مکروہ نہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ ڈالے ہوں یا اس سے
غسل فرمایا ہو:

حضرت اسامہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! نماز فرمایا: نماز کی جگہ تمہارے آگے ہے: اور جہیں
ہے کہ حاجی فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "نماز کی جگہ تمہارے آگے ہے" اس کا تقاضا
یہ ہے کہ نماز کا یہ وقت نہیں۔ یا نماز کی جگہ نہیں۔ یا اتفاق سے دونوں چیزیں دلوں جمع ہو گئی ہوں۔
امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ نماز نہ پڑھو یہاں تک کہ مزدلفہ پہنچ جائے۔ اور امام مالکؒ نے اس مسئلہ پر
اسی ارشاد نبویؐ سے استدلال کیا ہے۔ ابن حبیبؒ کہتے ہیں کہ جس نے مزدلفہ سے قبل بلا غدر نماز پڑھ
لی اس کا اعادہ کرے۔ اور یہی قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے: ۱۲

پھر آپؐ سواری پر روانہ ہوئے، مزدلفہ پہنچے، زرقانی
مزدلفہ پہنچنا، اور مزدلفہ کی وجہ تسمیہ | شرح مواہب میں لکھتے ہیں کہ: یہ عرفات و منی کے درمیان ایک
جگہ ہے جو سب کی سب حدود حرم کے اندر ہے۔ اس کا نام جمع، بھی ہے۔ بفتح جیم و سکون میم۔ یا تو: سوجہ
سے کہ حضرت آدمؑ حضرت نوحؑ علیہما السلام کے ساتھ اس جگہ جمع ہوئے اور ان کے قریب گئے۔ یا بقول
بعض اس لئے کہ یہاں دو نمازیں جمع کی جاتی ہیں۔ یا بقول بعض اس لئے کہ لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں اور

فتوٰۃ فصلی المغرب ترجمہ: پس وضو کیا اور مغرب کی نماز پڑھی

یہاں ٹھہر کر اللہ تعالیٰ کا قرب و ازدلاف حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے اس کا نام مزدلفہ ہوا، حافظ اس پر اضافہ فرماتے ہیں کہ یا اس لئے کہ لوگ منیٰ کے قریب ہو جاتے ہیں۔ یا اس لئے اس میں رات کے ہر زلفہ (حصہ) میں نزول ہوتا ہے۔ یا اس لئے کہ یہ حق تعالیٰ کے یہاں قرب و منزلت (کا ذریعہ) ہے۔ پس نماز کا وضو کیا۔ بخاری و مسلم کے الفاظ یہ ہیں: پس جب مزدلفہ پہنچے تو سواری سے اترے پس وضو کیا، اور خوب کامل وضو کیا، اور اجز میں ہے کہ احتمال ہے کہ محض وضو کی تجدید کی ہو۔ یا حدث لاحق ہوئے کی بنا پر وضو کیا ہو، اور پھر مؤذن کو حکم دیا چنانچہ اذان ہوئی اور آپ نے کچادے اتارنے اور اونٹ بٹھانے سے پہلے نماز مغرب ادا کی۔

راج قول کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لیٹانے امتوقت
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے
 شام کا کھانا نہیں تناول فرمایا جیسا کہ اجز میں تفصیل سے ذکر کیا
 بعد کھانا تناول فرمایا یا نہیں؟ گیا ہے۔ اور اسی میں ہے کہ باجی فرماتے ہیں: ابن مسعود رضی اللہ
 عنہ کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد کھانا تناول فرمایا۔ خفیہ میں سے
 صاحب ہدایہ وغیرہ نے اس کی موافقت کی ہے، لیکن شارح ہدایہ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً مروی نہیں بلکہ خود حضرت ابن مسعود کے عمل سے ثابت ہے۔ حافظ دہلوی نے فرمایا
 ہیں: یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کا کھانا کھایا۔ مجھے ملاحظہ مرفوع نہیں ملی، البتہ بخاری شریف
 میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل مذکور ہے، جس میں یہ مذکور ہے کہ جب صبح صادق ہوئی تو انہوں نے
 فجر کی نماز پڑھی۔ اور اسی روایت میں ان کا یہ قول بھی ہے کہ یہ دونوں نمازیں اپنے وقت سے بٹا دی
 گئی ہیں اور آخر میں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔ پس احتمال
 ہے کہ اس فقرے سے ان کی مراد صرف دو نمازوں کا جمع کرنا اور ان کے فہم کے مطابق دونوں نمازوں کا
 اپنے وقت سے بٹایا جانا مراد ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان کی مراد ان تمام افعال سے ہو جو ان سے
 صادر ہوئے۔

فصلی العشاء

ترجمہ: پھر عشاء پڑھی

میں کہتا ہوں کہ غالباً باجی اور صاحب ہدایہ اور ان کے موافقین نے حدیث کو دوسرے احتمال پر محمول کیا ہے۔ اور جمہور بالخصوص حنفیہ نے پہلے احتمال پر اسے بنا پر ان کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ عشاء کے لئے الگ اقامت نہ کہی جائے۔ بلکہ پہلی اقامت ہی کافی ہے۔ اور شیخ نے بدل میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث کی یہ توجیہ کی ہے کہ بعض صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور آپؐ کے حکم سے مغرب و عشاء کے درمیان کھانا کھایا اس کو جانا آپؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا یہ ہر دو (پس جب کجاوے اتارے گئے تو اقامت کا حکم دیا)

مزولفہ میں اذان اور اقامت میں اختلاف | پس اقامت ہوئی پھر عشاء پڑھی اور ہمارے حنفیہ کے

نزدیک جیسا کہ شرح کباب میں ہے: اس جمع میں تعجیل مستحب ہے اس لئے فرض نماز یعنی جنس فرض جو دونوں نمازوں کے جمع کرنے پر صادق ہے کجاوے یعنی سامان اتارنے سے پہلے پڑھے۔ بشرطیکہ امن کی حالت ہو اور سواری کا مالک بھی راضی ہو۔ اور اونٹوں کو بٹھانے کیونکہ اس سے نسبت کھڑے رہنے کے ان کے لئے آسان ہوگی۔ یا ان کی حفاظت کی قصد سے (ان کو بٹھا دے) اور ان کو عقاب بھی لگا دے۔ پس جب عشاء کا وقت ہو تو مؤذن اذان و اقامت کہے اور امام مغرب کی نماز، عشاء کے وقت میں جماعت سے پڑھے۔ پھر عشاء جماعت سے پڑھے اور عشاء کے لئے اذان و اقامت کا عادیہ نہ کرے! آھ۔ ابن قیمؒ الہمدی میں فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں نمازیں دو اذانوں اور دو اقامتوں سے پڑھیں۔ جیسا کہ عرف میں بھی یہی کیا۔

علماء کے اس مسئلہ میں چھ قول ہیں، ہوا و جز میں مذکور ہیں۔ اول اذان کے بغیر دو اقامتیں۔ یہ امام اسحق کا قول ہے اور امام احمد سے ایک روایت اور خطابی کی نقل کے مطابق امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے۔ دوم، صرف ایک اقامت پہلی نماز کے لئے۔ یہ نوٹری کا قول ہے۔ اور امام احمد کی ایک روایت ہے۔ سوم ایک اذان دو اقامتیں یہ امام احمد کا صحیح قول اور امام طحاوی و امام زفر کا قول ہے۔ نوٹری فرماتے ہیں کہ یہی ہمارے ہاں صحیح ہے۔ چہارم

ایک اذان ایک اقامت صرف پہلی نماز کے لئے۔ یہ حنفیہ کا مذہب ہے، جیسا کہ شرح
 کُباب سے اوپر گذر چکا ہے۔ مگر اس کے لئے یہ شرط ہے کہ دونوں میں کھانے وغیرہ کا فصل
 نہ ہو، پنجم: دو اذانیں اور دو اقامتیں یہ مالکیہ کا مذہب ہے۔ ششم: بغیر اذان و اقامت۔
 محبوب طبری نے یہ قول بعض سلف سے نقل کیا ہے: ”انتہی مختصراً“۔ ان اقوال کے ماخذ
 اوجز میں مذکور ہیں۔

دونوں نمازوں کے درمیان نوافل نہیں پڑھے نہ ان کے بعد (دش) آنحضرت صلی اللہ
 علیہ وسلم نے ان دونوں نمازوں کے درمیان نوافل نہیں پڑھے نہ ان کے بعد وتروں کے علاوہ
 کچھ پڑھا۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔ اس پر امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے: ”باب
 من جمع بینہما ولم یطوِّع“ اور اس کے ذیل میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے
 کہ: ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں نمازوں کو جمع کیا اور ان کے درمیان نوافل نہیں پڑھے“
 نہ ان کے بعد“ اوجز میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ اس میں مالکیہ کی کتابوں سے نقل کیا ہے
 کہ نہ ان دونوں کے درمیان نوافل پڑھے نہ ان کے بعد اور ابن حجر کی شرح منہاج سے نقل کیا ہے
 کہ: ”مسنون یہ ہے کہ نماز مغرب کے بعد ہر شخص اپنی سواری بٹھائے اور ان کے عقاب بانٹھے
 پھر عشاء کی نماز پڑھیں۔ پھر سامان کھولیں۔ پھر سنتیں اور وتر پڑھیں“ اور ہمارے حنفیہ
 کے نزدیک دونوں کے درمیان نوافل مکروہ ہیں۔ جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے شرح کُباب میں
 تصریح کی ہے اور دونوں نمازوں کے بعد جمع عرفات میں نوافل مکروہ ہیں۔ مزدلفہ میں مکروہ نہیں۔
 ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ”دونوں کے درمیان نفل نہ پڑھے، بلکہ مغرب و عشاء کی سنتیں اور
 وتر دونوں کے بعد پڑھے“ اور مرقاۃ میں فرماتے ہیں: ”قولہ ولم یسبح بینہما شیئاً یعنی دونوں
 نمازوں کے درمیان سنتیں اور نفل نہیں پڑھے۔ اور معتد بہ ہے کہ مغرب و عشاء کی سنتیں اور
 وتر دونوں کے بعد پڑھے۔ کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ عشاء کی سنتیں اور وتر کے بعد آپ صلی اللہ
 علیہ وسلم آرام کے لئے لیٹ گئے“ اصر مزدلفہ میں مغرب و عشاء کا جمع کرنا حنفیہ، مالکیہ، اور حنابلہ کے
 نزدیک افعالِ ج کے سبب ہے جیسا کہ اوجز میں تفصیلاً اور بدل میں اجمالاً ذکر کیا ہے۔ اور

ثم فامر حتى اصبح

ترجمہ: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

شافعیہ کے قول میں یہ جمع سفر کی بنا پر ہے۔ نووی شریعہ میں کہتے ہیں کہ صحیح ہمارے اصحاب کے نزدیک یہ ہے کہ یہ جمع سفر کے سبب ہے، لہذا یہ صرف اسی مسافر کے لئے جائز جس کا سفر مدت قصر تک پہنچتا ہو۔

(فقہ) پھر آپ سو گئے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ اور اس مزدلفہ کی رات تہجد پڑھی یا نہیں؟ رات شب بیداری نہیں کی۔ اہ قسطلانی نے مواہب میں اس پر بسط سے لکھا ہے۔ اور ترک تہجد کے وجہ میں ان اعمال کا ذکر کیا ہے جو پہلے ذکر ہوئے یعنی زوال سے غروب تک عرفہ کاوقوف، دعا اور تضرع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مبالغہ و اجتہاد اور غروب کے بعد عرفہ سے مزدلفہ تک کا سفر نیز وہ بہت سے اعمال جو آپ کو یوم النحر میں کرنے تھے، یعنی بہت سی قربانیوں کا نذر دہی، اور طواف زیادہ وغیرہ۔ جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے“ انتہائی مختصراً۔ اور شیخ بدل میں فرماتے ہیں: ”اگر کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کو کیسے ترک فرمایا۔ جب کہ ایک جماعت کے قول کے مطابق وہ آپ پر فرض تھی۔ جواب یہ ہے کہ ترک تہجد اس جماعت کے قول پر مبنی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ تہجد آپ پر فرض نہیں تھی۔ اور شاہ ولی اللہ نے حجتہ اللہ البالغہ میں اور مولانا بھرا العلوم نے رسائل الارکان میں اس کی تصریح کی ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں: ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ کی رات تہجد نہیں پڑھی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت سے مستحب امور کو عام محمول میں ترک فرمایا کرتے تھے تاکہ لوگ انہیں سنت نہ بنالیں“ اور بھرا العلوم فرماتے ہیں: ”راوی کے اس قول میں کہ: آپ لیٹ گئے اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اس رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد نہیں پڑھی“ قسطلانی نے مواہب میں اس کی تصریح کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ احیاء العلوم میں جو لکھا ہے کہ: اس رات کے نوافل ترک نہ کرے، بلکہ اس رات ان کا ادا کرنا تو بہت ہی اہم ہے یہ غیر مناسب ہے۔“

شیخ فرماتے ہیں کہ احیاء میں جو لکھا ہے وہ بظاہر اس قول پر مبنی ہے کہ تہجد آپ پر فرض تھی۔ پس بظاہر آپ نے واجب کو ترک نہیں فرمایا ہو گا۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تہجد فرض ہو یا سنت

(قال) واذن لصعفة اهله ان يتقدموا الى منى قبل طلوع الفجر عند غيبة القمر وامرهم ان لا يرموا حتى تطلع الشمس

ترجمہ: (رق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعفاہل بیت کو اجازت دی کہ وہ طلوع فجر سے پہلے جب کہ چاند غروب ہو، منیٰ چلے جائیں اور انہیں حکم فرمایا کہ آفتاب طلوع ہونے سے پہلے رمی نہ کریں۔

بہر حال راوی کا یہ کہنا کہ آپ لیٹ گئے اس کے علم پر محمول ہوگا کہ اس نے آپ کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا، یا یہ کہا جائے کہ آپ مغرب و عشا کی سنتیں اور وتر پڑھنے کے بعد لیٹے ہوں گے کیونکہ وتر حنفیہ کے نزدیک واجب ہیں۔ ان دونوں حضرات کے قول پر لازم آئے گا کہ آپ نے نماز تہجد کی طرح نماز وتر کو بھی ترک فرمایا۔ ورنہ وتر کا اطلاق جس طرح وتر پر ہوتا ہے اس طرح نماز تہجد پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، پس بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد اور وتر دونوں پڑھے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم انتہی ما فی البدل۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو بحوالہ المرقاة پہلے گزر چکی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سنیں اور وتر پڑھنے کے بعد لیٹے تھے۔ اور وتر کا لفظ تہجد کے لئے روایات میں شائع ذائع ہے، چنانچہ روایات میں ہے کہ آپ تین، پانچ، سات، نو اور گیارہ رکعات کیساتھ وتر تہجد پڑھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت روایات اس مضمون کی وارد ہیں۔ اور یہ بحث کہ تہجد آپ پر فرض تھی یا نہیں؟ حاشیہ لامع میں کتاب التہجد کے آغاز میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ یہ حضرت ام سلمہ کی باری کا دن تھا، میں کہتا ہوں کہ امام ابو داؤد نے باب التعلیل من جمع میں حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہ کو لیلا النحر میں بھیجا۔ اور یہ وہ دن تھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکے یہاں تھے۔ اس پر مفصل کلام عقرب آتا ہے۔

(رق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعفاہل بیت

ضعفاہ کو منیٰ جلدی جانسکی اجازت

دی کہ وہ طلوع فجر سے پہلے جب کہ چاند غروب ہو، منیٰ چلے جائیں۔ اور انہیں حکم فرمایا کہ آفتاب طلوع ہونے سے پہلے رمی نہ کریں۔

رہش کہ یہاں چند بحثیں ہیں۔

اور ضعفاہل بیت میں سے سرح ذیل حضرات کے نام اول ضعفاہ سے کون لوگ مراد ہیں؟ روایات میں مصرح ہیں، حفرة سودہ جیسا کہ صحیحین وغیرہ

میں ہے، یہ کمزور اور بھاری جسم کی تھیں۔ حضرت عائشہؓ اپنی کبر سن کے زمانے میں فرمایا کرتی تھیں کہ کاش میں نے بھی اجازت حاصل کر لی ہوتی۔ حضرت ام سلمہؓ جیسا کہ ابو داؤد و ابن سنی کی روایت میں ہے، ام حبیبہ رضی اللہ عنہا۔ جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ چنانچہ شیخین وغیرہ کی روایت میں ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کے کمزور لوگوں کے ساتھ مجھے بھی بھیجا تھا“ حضرت عباس رضی اللہ عنہ۔ امام طحاویؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے فرمایا تھا: ”آپ ہمارے کمزور بچوں اور عورتوں کو لے جائیے، تاکہ یہ نماز فجر منیٰ جا کر پڑھیں“ جیسا کہ زر قانی شرح مواہب میں ہے۔ اور فتح الباری میں ہے کہ صحیح ابو عوانہ کی حدیث میں ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں بچوں اور کمزوروں کو منیٰ بھیج دیا کرتے تھے۔ مذکورہ بالا حضرات کی روایت شیخ ابن قیمؒ اور صاحب البدایہ النبایہ نے بھی ذکر کی ہے، علامہ عینی نے ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ ضعفار سے مراد عذیمیں اور بچے ہیں عینی کہتے ہیں کہ عاجز بوڑھے بھی اس میں داخل ہیں۔

دوم، جانے کا وقت | صحیحین، مؤطا اور دیگر کتب حدیث میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی روایت اس باب میں مصرح ہے، کہ وہ نماز میں مشغول تھیں اور دریافت کرتیں کہ کیا چاند غروب ہو گیا؟ اور جب چاند کے غروب کی خبر دی گئی تو فرمایا: ”پس چلو“ اور عائشہؓ لایع میں ہے کہ حفصہؓ ابن جبر و عینی کہتے ہیں کہ اس رات چاند کا غروب ثلث اخیر کے اوائل میں ہوتا ہے اور ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ سنت سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تعجیل نصف شب کے بعد نہیں بلکہ چاند غروب ہونے کے بعد ہے۔ اور جن لوگوں نے نصف شب تک تحدید کی ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں اور اوجز میں حضرت طلحہؓ کے اس اثر ذیل میں کہ ”وہ اپنے گھر کی عورتوں کو پہلے بھیج دیا کرتے تھے“ ابن ماجہ سے نقل کیا ہے کہ راوی نے اس تقدیم کا وقت بیان نہیں کیا، اس لئے احتمال ہے کہ ان کا منیٰ آنا فجر سے اسی قدر پہلے ہو کہ وہ فجر کی نماز منیٰ میں پڑھ سکیں۔ جیسا کہ حضرت اسماءؓ کی حدیث میں ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان کا آنا فجر کے بعد اور وقوف سے قبل ہو۔ مگر ان کے لئے زیادہ سہولت اس میں ہے کہ فجر سے پہلے چلیں کہ اس صورت میں ان کو تنہائی زیادہ میسر ہوگی اور اسی میں ایک دوسری جگہ ہے کہ موقوف کہتے ہیں:

”خورتوں اور بچوں اور کمزوروں کو پہلے بھیج دینے میں مضائقہ نہیں۔ عبدالرحمان بن عوفؓ اور حضرت عائشہؓ اور دیگر حضرات اپنے کمزور اہل و عیال کو پہلے بھیج دیا کرتے تھے۔ اور امام شافعیؒ اور اصحاب سائے اسی کے قائل ہیں۔ اور ہمیں معلوم نہیں کہ اس میں کسی کا اختلاف ہو“ اور جن میں اس پر بسط سے لکھا ہے اور اس کا خلاصہ لامع کے حاشیہ میں بایں الفاظ ذکر کیا ہے:-

”یاد رہے کہ یہاں دو مسئلے ہیں۔ ایک دسویں رات
مزدلفہ میں شب گذاری اور وقوف میں اختلاف | مزدلفہ میں گزارنے کا۔ اور دوسرا مزدلفہ میں نماز فجر

کے بعد وقوف کا۔ یہ دونوں بسا اوقات تاہلین مذاہب پر ایک دوسرے سے مشتبہ ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ان کے اقوال مختلفہ اور جز میں نقل کر چکا ہوں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ظاہر یہ رکینیت وقوف کے قائل ہیں۔ ابن حزم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جن مردوں کو مزدلفہ میں امام کے ساتھ صبح کی نماز نہ مل سکے ان کا حج باطل ہے۔ مستند باقی رہے ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین تو ان کے مذاہب میں سے صحیح یہ ہے کہ نصف اذل کے مابعد تک مزدلفہ میں رہنا مستند قول کے مطابق امام شافعیؒ اور امام احمد کے

نزدیک واجب ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ نصف شب پہلے مزدلفہ پہنچ گیا ہو ورنہ نصف اخیر میں ایک گھرمی کی حاضری بھی کافی ہے۔ اور امام مالکؒ کے نزدیک کجاوے اتارنے کی بقدر شعبہ واجب ہے خواہ رات کے کسی حصہ میں ہو، اور خفیہ کے نزدیک مزدلفہ میں رات رہنا سنت مؤکدہ ہے۔ رہا فجر کے بعد وقوف کرنا تو یہ خفیہ کے نزدیک واجب ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سنت، ابن ماجہ شون مالکی اور ابن عربی کے نزدیک رکن ہے۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کمزوروں اور عورتوں کو پہلے بھیج دینا بالاجماع جائز ہے، جیسا کہ اوپر میں تفصیل سے لکھا ہے۔ نوویؒ کہتے ہیں: ”اگر مزدلفہ میں شب باشی کو ترک کر دیا تو اس کی تلافی دم سے کرے۔ اور جس نے عذر کی بنا پر ترک کیا اس کے ذمہ کچھ نہیں“ اور در دیر کہتے ہیں: ”کمزور عورتوں اور بچوں کو پہلے بھیج دینے کی بطور استعجاب نصحت ہے“ دسویں اس پر لکھتے ہیں: ”یعنی جب کجاوے اتارنے کی بقدر وہ مزدلفہ میں قیام کر چکے ہوں۔ اور کسی نے بالکل ہی قیام نہیں کیا تو اس پر دم لازم ہے۔ اور اس میں کمزور وغیرہ کا کوئی فرق نہیں“ اور شرح ثباب میں ہے کہ:

”مزدلفہ میں رات رہنا فجر تک سنت مؤکدہ ہے۔ اور فجر کے بعد وقوف واجب ہے۔ اور اگر وقوف ترک کر دیا تو دم لازم ہوگا۔ البتہ اگر ترک وقوف کسی عذر کی بنا پر ہو تو اس کے ذمہ کچھ نہیں، مثلاً کوئی زیادہ سن رسیدہ ہو،

یا بچ ہو، یا عورت ہو جس کو ہجوم سے اندیشہ ہو۔

بحث سوم: مصنف کے اس قول میں کہ ان کو حکم فرمایا کہ سورج نکلنے سے پہلے رمی نہ کریں۔ حضرت اسماء کے قول: ”بیٹا! کیا چاند غروب ہو گیا؟“

یوم النحر کی رمی کا وقت

کے تحت لایا ہے: حضرت اسماءؓ چاند کے غروب ہونے کا اس لئے پوچھتی تھیں کہ ان راتوں میں چاند کا غروب سحری کے قریب ہوتا ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ طلوع فجر کا قصد رکھتی تھیں۔ اور اس کے قبل کا ارادہ نہیں تھا۔ یہی ہمالہ مذہب ہے: اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ یوم النحر کی رمی کا وقت کب شروع ہوتا ہے اور کب ختم ہوتا ہے، اوجز میں یہاں بھی خوب بسط سے مذاہب کو بیان کیا گیا ہے۔ موفقی کہتے ہیں: اس جبرو کی رمی کے دو وقت ہیں۔ وقت فضیلت اور وقت جواز۔ وقت فضیلت تو طلوع آفتاب کے بعد ہے۔ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن چاشت کے وقت رمی کی تھی۔ اور ابو عبد اللہ المطہر کے نو عمر لوگوں کو فرمایا تھا کہ رمی نہ کرنا یہاں تک کہ سورج نکل آئے۔ اس کو ابو داؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ لیکن وقت جواز کی ابتداء امام احمد کے نزدیک نصف شب سے ہو جاتی ہے اور یہی قول امام شافعی کا ہے۔ اور امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ صبح صادق کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے جائز ہے، یہ امام مالک اور اصحاب رائے کا مذہب ہے۔ امام ثوربغی اور امام نخعی فرماتے ہیں کہ سورج نکلنے کے بعد ہی رمی کرے۔ پوری تفصیل اوجز میں دیکھ لی جائے۔ اور شیخ ابن قیم کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں تین مذاہب ہیں۔ اول: نصف شب کے بعد مطلقاً جائز ہے خواہ قادم ہو یا نہ ہو۔ یہ امام شافعی اور امام احمد کا مذہب ہے۔ دوم: صرف طلوع فجر کے بعد جائز ہے، یہ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔ سوم: اہل قدرت کے لئے طلوع آفتاب کے بعد ہی جائز ہے۔ یہ اہل علم کی ایک جماعت کا مذہب ہے۔

رقی اور حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث منکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ کو بھیج دیا تھا۔ پس انہوں نے صبح صادق سے پہلے ہی رمی کر لی، دشمن شیخ ابن قیم نے خوب بسط سے اس منکر مذاہب کو ثابت کیا ہے۔ اسی طرح امام طحاوی، امام بیہقی اور صاحب الجوہر النقی نے بھی اس کو منکر کہا ہے، یہ حدیث ابو داؤد نے روایت کی ہے۔ اور اس پر سکوت کیا ہے۔ صاحب البدایہ والنہایہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی روایت میں ابو داؤد متفرد ہیں۔ اور اس کی سند جید اور قوی ہے اور اس کے راوی

رقال، فلما طلع الفجر صلی الصبح

ترجمہ: رق! پس جو پہلی صبح صادق ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر ادا کی

سب ثقہ ہیں :

کیا منزلت رکھتی رات حضرت ام سلمہؓ کی باری تھی؟ اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی باری دسویں رات (لیلة النحر) تھی۔ مگر اس پر عبد اللہ بن زمرہؓ کی حدیث سے اشکال ہوتا ہے جس کو امام ابو داؤد نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ ”میری رات، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے یہاں قیام کرنا تھا، یوم النحر کی شام کو تھی۔ چنانچہ آپ میرے یہاں تشریف لائے۔“ الخ میرے نزدیک ان میں تطبیق یہ ہو سکتی ہے کہ ایام حج کی راتیں گزشتہ دن کے تابع ہوتی ہیں جیسا کہ معروف ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کی حدیث میں یہ آتا ہے کہ یوم النحر حضرت ام سلمہؓ کا تھا۔ رات کا ذکر نہیں۔ اور عبد اللہ بن زمرہؓ کی حدیث میں تصریح ہے کہ گیارہویں رات حضرت ام سلمہؓ کی تھی، اس لئے ان دونوں کے درمیان منافات نہیں۔

رق! پس جو پہلی صبح صادق ہوئی تو آپؐ نے اول وقت میں نماز فجر ادا کی۔ اور ان لوگوں کو دہم ہوا جو اس کے قائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کو نماز صبح قبل از وقت پڑھی تھی۔ اس دہم کا منشا حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کو فجر کی نماز اُس کے وقت سے پہلے پڑھی۔ حالانکہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی مراد یہ ہے کہ جس وقت عام طور پر پڑھنے کی عادت تھی۔ اس سے پہلے پڑھی۔ یہ تاویل ناگزیر ہے۔ اور خود عبد اللہ بن مسعودؓ کی اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ان سے مروی ہے کہ یہ دو نمازیں اپنے وقت سے بٹ جاتی ہیں۔ ایک نماز مغرب کہ وہ لوگوں کے منزلت آنے کے بعد پڑھی جاتی ہے اور دوسری نماز فجر جو سفید صبح کے وقت پڑھی جاتی ہے۔“ اور حدیث جابرؓ میں ہے جس میں قصہ حجتہ الوداع کا بیان ہے، کجب صبح صادق نمودار ہوئی تو آپؐ نے۔ اذان و اقامت۔ کے ساتھ نماز فجر پڑھی۔ کذا فی البیہ۔ اور آپؐ نے فرمایا یہ حج اکبر کا دن ہے، اور یہ ہر مشرک سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

لے دنی الاصل یبنا اذان و اقامتین۔“ والصحیح من صحیح مسلم ۳۹۸ (متدرج)

زُفْلَت، وَاَعَادَ الدُّعَاءَ لَامْتِه

رُش، اور اپنی امت کے لئے دوبارہ دعا فرمائی۔

کی برأت کے اعلان کا دن ہے۔ پھر آپ سوار ہو کر مشعر حرام کے پاس موقف میں پہنچے، اور خوب شغنی ہونے تک دعا و تضرع، تکبیر و تہلیل اور ذکر میں مشغول رہے۔ انتہی۔

(سن) اور اپنی امت کے لئے دوبارہ دعا فرمائی۔ کہتے ہیں کہ باہمی حقوق کے بار میں کبھی دعا قبول ہوئی | آپ کی دعا باہمی حقوق کے بارے میں بھی قبول ہوئی، اور زرقانی میں عباس بن مرداس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کی شام کو اپنی امت کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ حق تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا گیا ہے کہ میں نے مظلوم دباہی حق تلفیوں، کے ماسوا ان کی بخشش فرمادی، البتہ ظالم سے مظلوم کا بدلہ ضرور لوں گا۔ آپ نے عرض کیا کہ اے میرے رب! آپ چاہیں تو مظلوم کو جنت سے بدلہ دے کر ظالم کو معاف کر سکتے ہیں، مگر عرفہ کی شام کو آپ کی یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ مزدلفہ کی صبح کو دوبارہ دعا فرمائی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنسے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے عرض کیا: ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، یہ وقت ایسا ہے کہ آپ اس میں نہیں ہنسا کرتے، ہنسنے کا سبب کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ آپ کو ہنستا رکھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ کے دشمن ابلیس کو معلوم ہوا کہ میری دعا قبول ہوئی اور میری امت کی بخشش ہو گئی تو وہ سر پر مٹی ڈالنے اور دوادیل کرنے لگا، اس کی جرز غفر سے مجھے ہنسی آگئی، اس حدیث کو ابن ماجہ اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے، اور ابوداؤد نے اس پر سکوت کیا ہے۔ اور ابن جریر نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کی شام کو ہمیں خطبہ دیا، جس میں ارشاد فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس مقام میں تم پر بہت ہی احسان فرمایا ہے۔ پس تمہارے نیکو کاروں سے رطاعات و عبادات کو قبول فرمایا، اور تمہارے نیکو کاروں کو وہ سب کچھ عطا کر دیا جس کا انہوں نے سوال کیا۔ اور تمہارے گنہگار تمہارے نیکو کاروں کو بہہ کر دیئے یعنی نیکو کاروں کی بدولت تمہارے گنہگاروں کی بخشش فرمادی، البتہ تمہاری باہمی حق تلفیاں معاف نہیں ہوئیں چلو اللہ کے نام پر عرفہ سے مزدلفہ چلو پس جب مزدلفہ کی صبح ہوئی۔ تو ارشاد فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے

تمہارے اس مقام میں تم پر بہت ہی احسان فرمایا، چنانچہ تمہارے نیکو کاروں سے دان کی طاعات و عبادات کو قبول فرمایا۔ اور تمہارے گنہگار تمہارے نیکو کاروں کو عطا کر دیئے یعنی نیک لوگوں کی بدولت گنہگاروں کو بخش دیا، اور تمہاری باہمی حق تلفیوں کا معاوضہ اپنے پاس سے ادا کر دیا، چلو اللہ تعالیٰ کے نام پر دُعا کی طرف، ”صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کل تو آپ ہمیں بہت ہی حُزن و ملال کی حالت میں لائے تھے۔ اور آج نہایت فرحت و مسرت کی حالت میں لے جا رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”کل میں نے اپنے رب سے ایک درخواست کی تھی جو منظور نہیں ہوئی۔ میں نے درخواست کی تھی کہ باہمی حق تلفیوں کو بھی معاف کر دیا جائے۔ مگر نا منظور ہوئی۔ اور آج جبریل علیہ السلام آئے اور کہا کہ آپ کا پروردگار آپ کو سلام کہتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے حقوق اپنے ذمہ لے لئے ہیں ان کو اپنے پاس سے ادا کروں گا۔“

عباس بن مرداسؓ کی حدیث طبرانی نے معجم میں، عبد اللہ بن احمد نے زوائد سند احمد میں اور ابو یعلیٰ داؤد بن عدی نے روایت کی ہے، جیسا کہ تخریج زلیعی میں ہے نیز بیہقی نے سنن میں ابن ابی شیبہ میں اور ابواللیث سمرقندی نے تنبیہ الغافلین میں بھی اس کو روایت کیا ہے، ابن جوزی نے اس کو بروایت عباس بن مرداس، بروایت ابن عمر اور بروایت عبید بن حماد - حصہ عبد الرزاق اور طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے۔ موضوعات میں ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے ”القول المسدّد“ میں اور سیوطیؒ نے ”اللائی المصنوعہ“ میں ابن جوزی پر تعقب کیا ہے۔ سیوطی کہتے ہیں کہ ”یہ حدیث ترمذی کی رائے کے مطابق حسن کی حد میں داخل ہے، بالخصوص جب کہ اس کے مجموعی طرق پر نظر کی جائے۔ اور ابوداؤد نے اس کا ایک حصہ روایت کر کے اس پر سکوت کیا ہے۔ لہذا یہ حدیث ان کے نزدیک صالح ہے۔ اور حافظ ضیاء مقدسی نے ”المختار“ میں بھی اس کی تخریج کی ہے، امام بیہقی شعب الایمان“ میں اس کو روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں: ”اس حدیث کے لئے بہت سے شواہد موجود ہیں جن کو ہم کتاب البعث میں ذکر کر چکے ہیں۔ یہ اگر اپنے شواہد کی وجہ سے صحیح ہو تو یہ حجت ہے۔ اور اگر صحیح بھی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے۔“ و ینفروا دون ذالک لمن یشاء، یعنی اللہ تعالیٰ شرک کے ناسوا کو جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔ اور شرک کے ناسوا میں ایک دوسرے کو بھی داخل ہے۔ اور یہ حدیث

بروایت انس بھی مروی ہے جس کو ابو یعلیٰ اور ابن منیع نے روایت کیا ہے۔ الخ "اور حاشیہ" کو کب میں ابن جوزی کے رد میں اس پر خوب بسط سے کلام کیا ہے۔

جس سے گناہوں کی مغفرت | ہے جس پر شروح حدیث اور کتب مناسک میں خوب بسط سے

لکھا گیا ہے۔ اور جن میں اس پر کسی قدر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ اور حاشیہ لامع میں اس کا خلاصہ ذکر کیا گیا ہے شیخ قدس سرہ لامع میں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: رجع عنا ولدنا تہ ائمہ کے ذیل فرماتے ہیں: بظاہر صغائر مراد ہیں اور ممکن ہے کہ صغائر کبار دونوں مراد ہوں کیونکہ موافق حج میں بہت سی دعائیں ہیں، جو حضور واستغفار کو متضمن ہیں۔ مگر حقوق العباد جب تک اصحاب حقوق کی طرف سے معاف نہیں ہو جاتے ان کے ساقط اور ختم ہو جانے کا قائل ہونے کی جرأت مشکل ہے۔ ہاں تو یہ صادق سے وہ گناہ معاف ہو جائیگا جو تعفیرت حقوق کی وجہ سے لازم آیا اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ اس مسئلہ پر شیخ نے پھر جامع ترمذی کے افادات میں جو الکوکب الدری، کے نام سے مطبوع ہیں، مختصر سا کلام کیا ہے۔ اور اس کے حاشیہ میں قدرے تفصیل ہے۔ اور اور جن میں ان روایات کو ذکر کرنے کے بعد، جن میں حج سے گناہوں کی تکفیر کا مضمون وارد ہوا ہے۔ لکھا ہے کہ بہت سے محققین، مثلاً قاضی عیاض اور ابن عبد البر وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ کہ کبار تو بہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، اس لئے بعض حضرات تو ان روایات کو صغائر کے ساتھ مؤول قرار دیتے ہیں۔ اور بعض حضرات اس طرف گئے ہیں کہ بعض اعمال کبار کو بھی مٹا دیتے ہیں۔ بالخصوص حج کہ اس کے بارے میں تو بڑی کثرت سے روایات وارد ہوئی ہیں۔ اور مؤثر مختاریں ہیں: کیا حج کبار کو مٹا دیتا ہے؟ بعض نے کہا ہے کہ ہاں، جیسے کوئی حری سمان ہوا اور بعض نے کہا ہے کہ صرف ان کبار کو بخوبی (کے حقوق) سے متعلق نہ ہو، جیسے ذمی اسلام لے آئے۔

شیخ ابن تیمیہ کہتے ہیں: جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ حج سے حقوق واجبہ ساقط ہو جاتے ہیں اس سے توبہ کرائی جائے، توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے، کیونکہ حج سے حقوق العباد بالاجماع ساقط نہیں ہوتے شیخ قدس سرہ الکوکب میں فریقین کے دلائل پر مفصل بحث کے بعد فرماتے ہیں: شامدہ حق بات جس سے عدول مناسب نہیں یہ ہے کہ تمام طاعات و عبادات میں عبادت کثرتگان کے مختلف

حالات کی بنا پر بے شمار تغادات ہوتا ہے۔ بہت سے سونے والے اللہ تعالیٰ کے ہاں اعلیٰ وارفع مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور بہت سے زاہدان شب زندہ دار کو بحر کلفت بیداری کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اور جب یہ ہے تو معلوم ہوا کہ تمام عبادات کا حکم یکساں نہیں۔ بلکہ بعض تو آدمی کو ایسا کر دیتی ہیں گویا آج کے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ اور یہ جب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں اپنی کوتاہیوں پر مذمت جو۔ اور گذشتہ زمانے میں جن حقائقوں کا ارتکاب کر چکا ہے ان پر حسرت و انکس ہو اور بعض ایسی ہیں کہ کبار تو کجا صغائر کو مٹانے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتیں، بلکہ عجب نہیں کہ اٹا دھال بن جائیں، اور آدمی کے لئے عتاب و نکال کی موجب ہوں۔ چنانچہ یوں آتا ہے کہ آدمی نے جب نماز کے آداب کی ٹھیکے غایت نہ کی ہو۔ خواہ ارکان و شرائط بجالایا ہو، تو نماز اس کو بد عادت بنی ہے کہ اللہ تجھے غارت کرے جیسے تو نے مجھے ضائع کیا۔ اس مضمون کی اور بہت سی روایات ہیں: ”اھ

رقا اسی مقام میں عودہ بن بصر بن طائیؓ نے ارشاد نبوی: جو شخص ہماری اس نماز میں حاضر ہوا اللہ

رضی اللہ عنہ اس کی عفو فرمائی اور اس کی ساری کوتاہیاں دیا، اور اپنی جان کو مشقت میں ڈالا، کوئی پہاڑ نہیں جس پر میں نہ چھڑا ہوں۔ تو کیا میرا حج ہو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص ہماری اس نماز میں حاضر ہوا پھر ہم اسے ساتھ وقوف کیا یہاں تک کہ ہم یہاں سے جائیں۔ جب کہ اس سے قبل رات یا دن کے کسی حصہ میں عرفات کا وقوف کر چکا تھا، تو اس کا حج تام ہے: ”ترندی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، اس حدیث کے پیش نظر بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ وقوف عرفہ کی طرح مزدلفہ میں شب باقی اور دنوں کا وقوف رکن ہے، یہ صحابہ و تابعین وغیرہم کی ایک جماعت اور داؤد ظاہری کا مذہب، اور شافعیہ کی ایک روایت ہے شیخ ابن قیمؒ نے رفیقین کے دلائل تفصیل سے ذکر کئے ہیں۔ مندرجہ بالا حدیث ابو داؤد و ترمذی، نسائی و ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔ حافظ فرماتے ہیں کہ ابن حبان و ترمذی اور حاکم نے اسی کو صحیح کہا ہے۔ اوشیخ ذیل میں فرماتے ہیں کہ حدیث میں وقوف عرفہ کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ واجبات حج میں سے ہے۔ اور شوکانی کہتے ہیں کہ اس حدیث سے امام احمد بن حنبل نے استدلال کیا ہے کہ وقوف عرفہ کا وقت ابعد زوال کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ یوم عرفہ کی صبح صادق سے یوم نحر کی صبح صادق تک اس کا وقت ہے۔ کیونکہ دن اور رات کا لفظ مطلق ہے اور چہ ہوا اس حدیث کا جواب یہ دیتے ہیں کہ دن سے مراد

دقال، ثم سار من مزدلفة مردنا للفضل۔

ترجمہ: پھر آپ مزدلفہ سے روانہ ہوئے اور فضل کو اپنے پیچھے سوار کیا۔

مابعد زوال ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے زوال کے بعد ہی وقوف کیا۔ اور الحلی میں ہے کہ اس حدیث سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہو جاتی ہے، جو کہتے ہیں کہ وقوف عرفہ یوم عرفہ کے غروب آفتاب سے فوت ہو جاتا ہے اور ان لوگوں کی بھی جو کہتے ہیں کہ اس کا وقت طلوع فجر کے بعد طلوع آفتاب تک رہتا ہے، انتہی مافی البدل مختصراً۔

وق، پھر آپ طلوع آفتاب سے قبل مزدلفہ سے روانہ ہوئے موقوف طلوع آفتاب سے قبل مزدلفہ سے چلنا کہتے ہیں: ہمیں اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں کہ سنت طلوع آفتاب سے پہلے چلنا ہے، اور خوب روشنی ہو جانے تک وقوف سنت ہے۔ امام شافعی اور اصحاب ائمہ کا یہی قول ہے۔ امام مالک کی رائے یہ تھی کہ اسفار سے پہلے چلنا چاہیئے۔ کذا فی الاوجز۔

(ش) امام ابو داؤد نے حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ اہل جاہلیت اس وقت تک نہیں چلتے تھے جب تک کہ کوہ ثبیر پر دھوپ نہ دیکھ لیتے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت فرمائی اور طلوع آفتاب سے پہلے چلے۔ اور بخاری کے الفاظ عمر بن میمون کی روایت سے یہ ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ آپ نے مزدلفہ میں صبح کی نماز پڑھی پھر وقوف کیا۔ پھر فرمایا کہ شرکین مزدلفہ سے نہیں چلتے تھے۔ یہاں تک کہ سورج نکل آئے اور وہ کہا کرتے تھے: "اشرق ثبیر" یعنی اے کوہ ثبیر! تو دھوپ سے روشن ہو جا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی اور طلوع آفتاب سے پہلے روانہ ہوئے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ثبیر مکہ کے پانچ پہاڑوں کا نام ہے جیسا کہ ثبیر مکہ کے پانچ پہاڑوں کا نام ہے | شیخ قدس سرہ نے بدل میں افادہ فرمایا ہے اور اسی طرح مجمع میں بھی مذکور ہے، شایع قاموس نے اس میں علماء کا اختلاف ذکر کیا ہے کہ ثبیر نامی پہاڑ منیٰ میں ہے یا کسی اور جگہ؟ تفصیل میرے حاشیہ شرح لباب میں ہے۔

اور فضل بن عباسؓ کو اپنے پیچھے سوار کیا اور حضرت اسماءؓ ابن عباسؓ کا رستے سے کنکریاں اٹھانا | یہ بدل چل پڑے۔ اور اسی رستے میں ابن عباسؓ کو کنکریاں اٹھانے کا حکم فرمایا۔ اور اس رات کو پہاڑ سے کنکریاں نہیں توڑیں، جیسا کہ بعض بے علم کرتے ہیں کذا فی الہدیٰ

(قال) دفع طریقہ تلافی

توجہ (ق) اور اسی راستے میں

زرقانی کہتے ہیں کہ سنن بیہقی اور نسائی میں بسند صحیح علی شرط مسلم مروی ہے نیز حاکم نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل بن عباسؓ سے یوم النحر کی صبح کو فرمایا کہ میرے لئے کنکریاں جمع کرو جیسے پھینکنے کی کنکریاں ہوتی ہیں۔“ کنکریوں کے مسائل پر اوجز میں بہت ہی بسط سے کلام کیا ہے۔ کہ ان کو رات ہی کو جمع کر لے یا راستے سے لے؟ اور یہ کہ صرف جمرہ عقبہ کے لئے سات کنکریاں لے؟ یا تمام دنوں کے لئے ستر کنکریاں لے؟ اور یہ کہ جہالت کے پاس سے کنکریاں اٹھا لینا جائز ہے یا نہیں؟ اس قسم کی اور بھی لطیف بحثیں کی ہیں۔ اور اسی میں یہ ہے کہ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ ”ابن حزمؒ کا یہ قول مردود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کنکریوں سے رمی کی تھی جو عبداللہ بن عباسؓ نے موضع رمی سے اٹھائی تھیں“ الخ اور ابن عربیؒ نے المحاضرہ میں ابن حزم کے قول کو رد کی موافقت کی ہے۔ اور حافظؒ نے تلخیص میں فضل بن عباسؓ کے نام کو ترجیح دی ہے۔ اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ کو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعفاد اہل بیت کے ساتھ رہا ہی کو منیٰ بھیج دیا تھا۔

دق، اور اسی راستے میں دش، ابن عربیؒ نے المحاضرہ میں بھی یہی قبیلہ خثعم کی ایک خاتون کا سوال ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ رجا کے آتا ہے راستہ میں پیش آیا، اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ آیا یہ واقعہ راستہ میں پیش آیا؟ جیسا کہ بخاری میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ”فضلؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھے۔ پس قبیلہ خثعم کی ایک عورت آئی، فضلؒ اس کی طرف دیکھنے لگے، اور موطا کی روایت کے الفاظ بھی اسی طرح کے ہیں۔ یا رمی کے بعد مخر میں یہ واقعہ پیش آیا جیسا کہ متعدد روایات میں ہے۔ اور اوجز میں ہے کہ حافظؒ فرماتے ہیں: ”احتمال ہے کہ قبیلہ خثعم کی خاتون کا سوال رمی جمرہ عقبہ کے بعد ہوا ہو، اور ابن عباسؓ بھی اس موقع پر حاضر ہوئے ہوں! اس لئے کبھی وہ اپنے بھائی فضلؒ سے روایت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہی صاحب واقعہ ہیں: اور کبھی خود اپنا مشاہدہ نقل کرتے ہیں۔ اس کی تائید ترمذیؒ و احمدؒ وغیرہما کی روایت سے ہوتی ہے۔ امام احمدؒ کے الفاظ پر روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ

عرضت له امرأة جميلة سألت عن الحج عن أبيها فامرهما أن تمح عنه.

ایک حسین جبیل عورت آپ کے پاس آئی، اور دریافت کیا کہ کیا وہ اپنے باپ کی جانب سے حج کر سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ اس کی جانب سے حج کرے۔

یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منہجیں پہنچے اور فرمایا: یہ منحربے، اور منیٰ کی ہر جگہ منحربے۔ اور آپ سے ایک عورت نے استفادہ کیا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کے پاس قبیلہ خثعم کی ایک جوان لڑکی آئی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل کی گردن موڑ دی، حضرت عباسؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے اپنے چچازاد بھائی کی گردن موڑ دی، آپ نے فرمایا: "میں نے دیکھا جوان لڑکا لڑکی ہیں، مجھے ان کے حق میں شیطان کا خطرہ محسوس ہوا" الخ۔ اور اسی میں یہ بھی ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ حدیث سند ابن عباس ہے یا منذ فضل؟ ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسماعیل بخاری سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں ابن عباسؓ کی روایت بواسطہ فضل زیادہ صحیح ہے۔ الخ۔

قبیلہ خثعم کی ایک حسین جو بیل خاتون آپ کے پاس آئی، حافظ کہتے ہیں اس کے نام کا ذکر نہیں آتا۔ اور دریافت کیا کہ کیا وہ اپنے باپ کی جانب سے، جو سواری پر بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتا، حج کر سکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اس کی جانب سے حج کرے، یہاں چند بحثیں ہیں۔ جو اجز میں مفصل مذکور ہیں۔ اول: یہ کہ سائل مرد تھا یا عورت تھی؟ اور اس نے اپنے باپ کے بارے میں سوال کیا تھا یا اپنی ماں کے بارے میں؟ حافظ اس سلسلہ میں روایات کے اختلاف کو تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "ان مجموعی طرق سے جو بات میرے سامنے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ سائل مرد تھا۔ اس کے ساتھ لڑکی بھی تھی، اس نے بھی سوال کیا، اور سوال مرد کے ماں باپ دونوں کے بارے میں تھا۔ الخ۔"

بحث دوم، جو شخص بذات خود قادر نہ ہو مگر جو شخص خود قادر ہو اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟ کسی دوسرے سے حج کر سکتا ہے اس پر حج فرض

ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ پر اجز میں خوب بسط سے لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قادر بالغیر پر امام شافعیؒ، احمد اور صاحبینؒ کے نزدیک حج فرض ہے۔ اور امام مالکؒ اور ابو حنیفہؒ کے نزدیک فرض نہیں۔ ان کی طرف سے اس حدیث کا جواب جیسا کہ حاشیہ لایا میں ہے یہ دیا گیا ہے کہ حدیث خثعمیہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کو دوسروں کی طرف متعدی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "من استطاع الیہ

سببِ لا یعنی حج اسی پر فرض ہے جو بیت اللہ تک پہنچنے کی طاقت رکھے۔ اور اوجز میں ہے کہ ابن عبد البر کا رجحان یہ ہے کہ یہ قصہ خشمیہ سے مخصوص ہے۔ اور قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس مسئلہ میں حجت نہیں کیونکہ ظاہر حدیث یہ ہے کہ اس خاتون نے بتایا کہ فریضہ حج ایسی حالت میں نازل ہوا کہ اس کا باپ طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے صرف یہ دریافت کیا کہ اس کے لئے اپنے باپ کی جانب حج کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ائمہ اور شیخ قدس سرہ کو کتب میں فرماتے ہیں: اس کا قول: اللہ تعالیٰ کے فریضہ حج نے اسے پایا۔ یہاں دو احتمال ہیں، اول یہ کہ جب حج کا حکم نازل ہوا اس وقت یہ بڑے میاں حج کی قدرت و استطاعت رکھتے تھے مگر پہلے سال حج نہ کیا، یا تو کچھ عوارض و موانع پیش آگئے ہوں گے یا یہ توقع ہو گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حج مشرف ہو سکیں گے، اور بعد میں کمزور ہو گئے ہوں گے۔ اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ حج کے حکم نے ان کو بڑھاپے کی حالت میں پایا۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ حج کے بارے میں حکم خداوندی نازل ہی اس وقت ہوا جب کہ وہ شیخ کبیر تھے۔ انتہی۔

اوجز میں ہے کہ موفق کہتے ہیں کہ جو شخص

بحث سوم: کسی شخص کی طیر فسخ حج بدل جائز ہے یا نہیں؟ بذات خود حج کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس کی

جانب سے حج واجب میں نیابت بالاتفاق جائز نہیں، ابن منذر کہتے ہیں کہ اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جس پر حج اسلام فرض ہوا اور وہ خود حج کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس کی جانب سے کسی دوسرے کا حج بدل کرنا صحیح نہیں۔ اور جو حکم حج فرض کا ہے وہی نذر کے حج کا ہے کہ اگر خود عاجز ہے تو کسی کو نائب بنا سکتا ہے۔ اور اگر خود قادر ہو تو نیابت صحیح نہیں کہ وہ بھی حج واجب ہے۔ اور نفلی حج کی تین قسمیں ہیں ایک کہ کسی نے حج فرض ادا نہیں کیا ایسا شخص کسی کو نفلی حج کے لئے اپنا نائب بنا نہیں بھیج سکتا، دوم یہ کہ حج فرض ادا کر چکا ہو اور حج نفل ادا کرنے سے عاجز ہے اس کی طرف سے نائب بنانا صحیح ہے سوم یہ کہ اس میں دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ صحیح ہے اور یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے دوسری یہ کہ صحیح نہیں اور یہ امام شافعی کا قول ہے پوری تفصیل اوجز میں ہے۔

اوجز میں المعنی سے نقل کیا ہے کہ مرد کا عورت

بحث چہام: مرد کا عورت کی جانب سے اور عورت کا مرد کی جانب سے حج کی جانب سے حج بدل امام اہل علم کے نزدیک صحیح ہے۔ اس مسئلہ میں

کسی کا اختلاف ہمیں معلوم نہیں بجز حسن بن صالح کے کہ ان کے نزدیک مرد کی جانب سے عورت کا حج بدل

کرنا مکروہ ہے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ حسن بن صالح کا یہ قول ظاہر سنت سے غفلت ہے۔۔۔ کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاتون کو اس کے باپ کی جانب سے حج کرنے کا حکم فرمایا: الخ یہ چار بحثیں حدیث الباب کے مناسب ہیں، ورنہ حج بدل کے مسئلہ میں بہت سی بحثیں ہیں۔ جن میں سے دس بحثیں اوجز میں مذکور ہیں، چنانچہ ”باب الحج عن الغیر“ کی ابتدا میں اوجز کے الفاظ یہ ہیں۔

”اس باب کے فروع بہت ہی زیادہ ہیں۔ ہم یہاں دس حج بدل کے متعلق دس بحثیں“

بعضوں میں ان مسائل کو ذکر کرتے ہیں جن کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ اول: حج فرض یا نفل میں نائب بنانا صحیح ہے یا نہیں؟ دوم: جو شخص خود ڈاؤن ہو البتہ دوسرے کی مدد سے حج پڑتا ہو اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟ ستوم: اپاہج کی طرف سے حج بدل کا حکم۔ چہارم: جس شخص کے مرض کے زائل ہونے کی توقع ہو اس کی طرف سے اور مجبوس کی طرف سے حج بدل کا حکم، پنجم: حج بدل کے بعد مریض کو صحت ہو جائے۔ ششم: امر کا اون شرط ہے یا نہیں؟ ہفتم: ثلث مال سے حج بدل کا حکم۔ ہشتم: دوسرے کی جانب سے حج ضرورت کا حکم۔ نہم: مرد کا عورت کی طرف سے اور عورت کا مرد کی طرف سے حج بدل۔ دہم: حج امر کی طرف سے ادا ہوتا ہے یا مامور کی طرف سے؟

دق، فضل اس عورت کی طرف اور وہ فضل کی طرف دیکھنے لگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل کا منہ پھیر دیا تاکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو نہ دیکھیں: (دش) اور کنز العمال میں یہ اضافہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آج کا دن وہ ہے کہ جس شخص نے اپنی نظر کو قابو میں رکھا اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل کا منہ عورت کی طرف سے ہٹایا، اس کے برعکس عورت کو منہ پھیرنے کا حکم نہیں کیا۔ اوجز میں اس کے وجوہ تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں۔ من جملہ ان کے باجی سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف فضل کا منہ دوسری طرف پھیر دینے کو کافی سمجھا، کیونکہ یہ چیز عورت کے لئے فضل کا چہرہ دیکھنے سے مانع تھی، اگویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے منع کر دیا۔ علاوہ ازیں دوسرے وجوہ اوجز میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ اجنبی مرد و عورت کا ایک دوسرے کو دیکھنے کا حکم اوجز میں دو مقام پر مفصل مذکور ہے۔ حدیث خشمیہ کے ذیل میں۔ اور عقدۃ المرأة فی تنبیہ کے ذیل میں۔

وسأله آخر عن أمه -

ترجمہ :- اور اسی موقع پر ایک شخص نے اپنی والدہ کے بارے میں یہی سوال کیا -

اور اسی موقع پر ایک اور شخص نے اپنی

ایک شخص کا اپنی والدہ کے بارے میں سوال

کے جواب میں ارشاد فرمایا: یہ بتا کہ اگر تیری ماں کے ذمہ قرض ہوتا تو تو اس کی جانب سے ادا کرتا یا نہیں؟ عرض کیا کہ ضرور کرتا۔ فرمایا: پھر اپنی ماں کی طرف سے حج بھی کر؟ کذا فی الہدی۔ یہ حدیث امام نسائی نے حضرت فضل بن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھے پس ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میری ماں الحہ امام نسائی نے اس حدیث پر یہ عنوان قائم کیا ہے ”باب حج الرجل عن المرأة“ امام نسائی کے طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو واقعے الگ الگ ہیں۔ چنانچہ شیخ ابن قیمؒ کا بھی یہی رجحان ہے۔ اور ابن عربی نے الحاضرہ میں اسی کو جزاً ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ قبیلہ خثعم کی خاتون کا واقعہ نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اسی نوعیت کا سوال ایک مرد نے بھی کیا: ”اھ اور پیچھے قریب ہی اور جز سے گزر چکا ہے کہ حافظؒ کا رجحان یہ ہے کہ یہ ایک ہی قصہ ہے۔ وہ روایات کا اختلاف نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ان تمام طرق کو ملانے سے جو بات میرے لئے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ سوال کرنے والا مرد تھا اس کے ساتھ اس کی لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی نے بھی سوال کیا، اور سوال مرد کے ماں باپ دونوں کے بارے میں تھا۔ اس کی تائید اس روایت سے نکلتی ہے جو ابویعلیٰ نے بسند قوی فضل بن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً کے پیچھے سوار تھا، ایک اعرابی آیا، اس کے ساتھ حسین و جمیل لڑکی بھی تھی۔ وہ اعرابی اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس نیت سے پیش کر رہا تھا کہ آپ اس سے نکاح کر لیں گے۔ اور میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا سر پکڑ کر دوسری طرف پھیر دیا، اس صورت میں اس جوان عورت کا یہ کہنا کہ میرے باپ کے ذمہ الحہ غالباً اس سے مراد داد ہوگا کیونکہ اس کا باپ تو اس کے ساتھ ہی تھا۔ غالباً اس شخص نے لڑکی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے کو کہا ہوگا تاکہ آپ اس کی بات سنیں اور اسے دیکھ لیں، امید یہ ہوگی کہ آپ اس سے نکاح کر لیں گے۔ جب آپ نے اس کو

فلما اتى بطن محشر حرك فاقته واسو ۶ السیر۔

ترجمہ :- پس جب بطن محشر پہنچے تو اوٹنی کو تحریک کی اور رفتار تیز کر دی۔

پسند نہ فرمایا تو اس نے اپنے باپ کے بارے میں خود بھی دریافت کیا ہوگا۔ اور کوئی مانع نہیں کہ اس شخص نے اپنی والدہ کے بارے میں بھی سوال کیا ہو! اھ۔

اور میرے نزدیک ان دونوں کے درمیان بہتر تطبیق یہ ہے کہ مذکورہ لڑکی اپنے باپ کیساتھ نہیں بلکہ اپنے چچا کے ساتھ ہوگی۔ کیونکہ ابوعلیٰ کی مندرجہ بالا ایک روایت میں "اس کی لڑکی کے لفظ کو حجاز پر محمول کرنا زیادہ آسان ہے، بہ نسبت اس کے کہ بہت سی مختلف روایتوں میں جو لڑکی کے سوال میں میرے باپ کا لفظ مذکور ہے اسے ہر جگہ حجاز پر محمول کیا جائے۔ حاصل یہ ہوا کہ لڑکی نے اپنے باپ کے بارے میں سوال کیا تھا۔ اور اس کے چچا نے اپنی والدہ کے بارے میں۔ مزید یہ کہ حافظہ کے تول کے مطابق جب وہ شخص اپنے باپ کے بارے میں دریافت کر چکا تھا تو دوبارہ اسی کے بارے میں لڑکی کے سوال کی ضرورت نہیں رہ جاتی، انتہی میں الاوجز مختصراً۔

پس جب بطن محشر پہنچے تو اوٹنی کو تحریک کی اور رفتار تیز کر دی۔

بطن محشر میں سواری کو تیز کرنا | مسلم اور ابوداؤد کے الفاظ حضرت جابر کی طویل حدیث میں یہ ہیں: یہاں تک کہ بطن محشر پہنچے تو تھوڑی سی تحریک کی: اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے: واؤ واؤی محشر میں (واؤٹنی کو) دڑایا۔ اور ارشاد فرمایا کہ میری امت کو مجھ سے مسائل چج سیکھ لینے چاہئیں شاید کہ اس سال کے بعد ان سے نزل سکوں: (رق) جن مقامات میں اللہ کے دشمنوں پر اللہ کا عذاب نازل ہوا وہاں آپ کی یہی عادت مبارکہ تھی کہ تیزی کے ساتھ وہاں سے گذر جاتے تھے، واؤی محشر میں اصحاب نبیل پر وہ عذاب نازل ہوا تھا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ نبیل میں کیا ہے اور اسی مناسبت سے اسے محشر کہتے ہیں کہ یہاں ہاتھی آگے چلنے سے عاجز ہو کر گر گئے تھے۔ اور مقام حجر اور دیار ثمود میں گذرتے ہوئے بھی آپ نے یہی کیا تھا کہ کپڑے سے چہرہ اوڑھ لیا اور رفتار تیز کر دی۔

اور محشر منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان بربخ ہے، نہ اس میں شامل ہے محشر کی وجہ تسمیہ | نہ اس میں: کذا فی البدئی۔ اور شرح لباب میں ہے کہ محشر میں تیز چلنا ائمہ

اربعہ کے نزدیک مستحب ہے، خواہ سواری پر ہو یا پیدل۔ اور اس کا نام مُحَشَّرُ اس لئے ہے کہ ہاتھی یہاں مرک گئے تھے۔ یا اس لئے کہ یہاں شیطان نے بعد حسرت وقوف کیا تھا، اھ اور زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں کہ مُحَشَّرُ بضم میم وفتح حائے ہملہ وکسرین مشدود ہملہ۔ منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ایک جگہ ہے اور اسنوسی کہتے ہیں کہ یہاں سے تیز گزرنے کی وجہ یہ ہے کہ بقول رافعی نصاریٰ یہاں وقوف کیا کرتے تھے۔ اور بقول وسط عرب یہاں ٹھہرتے تھے، ہمیں ان کی مخالفت کا حکم کیا گیا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس کی حکمت کے بارے میں مجھے ایک اور بات ظاہر ہوئی ہے وہ یہ کہ یہاں اصحاب فیل پر غارت نازل ہوا تھا یہ ایک قول ہے مگر صحیح قول اس کے خلاف ہے کیونکہ اصحاب فیل حرم مکہ میں داخل نہیں ہو سکے بلکہ حرم کے قریب ہلاک ہوئے۔ دراصل یہاں ایک آدمی نے شکار کیا تھا، آسمان سے آگ نازل ہوئی اور اس شکاری کو خاکستر کر ڈالا۔ اسی لئے اہل مکہ اس مقام کا نام ”وادی مارکھتے“ میں ڈالا اور نووی نے صرف قضاہ اصحاب فیل ہی کو وجہ تسمیہ میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: یہ نام یوں پڑا کہ اصحاب فیل یہاں تک کر عاجز رہ گئے تھے، اھ اور ابن حجر نے شرح مناسک نووی میں اس مقام میں تیز رفتاری کے وجہ بسط سے بیان کئے ہیں۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ اصحاب فیل پر غارت نازل تو اُس جگہ ہوا تھا جو عذہ کے محاذی ہے۔ اور جسے مُنَمَّسُ [دوسری میم کے فتح کے ساتھ اور کبھی مکسور بھی پڑھی جاتی ہے] کہا جاتا ہے۔ بلکہ معروف یہ ہے کہ اصحاب فیل حرم میں داخل ہی نہیں ہونے پائے تھے، جیسا کہ ابن اثیر نے حرم کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ الخ۔

ان معروف روایات کے جن میں وادی مُحَشَّر میں تیز چلنا مذکور ہے وہ روایت منافی نہیں جو ابو یوسف نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سکون کے ساتھ عذہ سے چلے، الحدیث۔ اسی میں عذہ سے چلنے کے بعد کا قصہ یوں نقل کیا ہے کہ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے فضل بن عباسؓ کو سوار کیا اور ارشاد فرمایا: اسے لوگوں گھوڑے اور اونٹوں کو دوڑانا کوئی نیکی نہیں، پس سکون کو لازم پکڑ دو۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں پس میں نے آپؐ کی اذیت کو قدم اٹھاتے (یعنی دوڑتے) ہوئے نہیں دیکھا، بظاہر یہ حدیث ان احادیث کے خلاف ہے جن میں وادی مُحَشَّر میں تیز رفتاری کا ذکر ہے۔ نووی شرح مہذب میں لکھتے ہیں کہ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ اس حدیث میں یہ تصریح نہیں کہ آپؐ نے مُحَشَّر میں بھی تیز رفتاری کو

حتیٰ اتی جمرۃ العقبة فرماھا را کبا

ترجمہ :- یہاں تک کہ جمرۃ عقبہ کے پاس پہنچے۔ پس سوار ہو نیکی حالت میں جمرۃ عقبہ کی رمی کی۔

ترک فرمایا تھا۔ لہذا یہ حدیث ان احادیث کے معارض نہیں جن میں تیز رفتاری کی تصریح ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر اس میں تیز رفتاری کے ترک کی تصریح بھی ہوتی تب بھی تیز رفتاری کے ثبوت کی روایات و وجہ سے مقدم تھیں۔ ایک یہ کہ ان میں انبات ہے اور وہ نفی پر مقدم ہے۔ دوسری یہ کہ وہ کثرتِ رواۃ و صحتِ سند اور شہرت میں اس سے بڑھ کر ہیں۔ لہذا وہ مقدم ہوں گی۔

جمرۃ عقبہ کے پاس آنحضرتؐ کس جگہ کھڑے ہوئے | یہاں تک کہ منیٰ آکر جمرۃ عقبہ کے پاس پہنچے، پس وادی کے نشیب میں کھڑے ہو کر جمرہ کا

استقبال کیا۔ یاس طور کہ بیت اللہ بائیں جانب اور منیٰ دائیں جانب تھا۔ کذا فی الہدیٰ۔ اور اس بیعت سے کھڑا ہونا ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مستحب ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل ان کی کتب فقہ سے اوجز میں ذکر کی گئی ہیں۔ اور حنا بلکہ کے نزدیک مستحب ہے کہ منہ قبلہ کی طرف ہو، اور اوجز میں حافظ سے نقل کیا ہے کہ کسی جگہ سے رمی کرے جائز ہے، خواہ جمرہ کی طرف منہ ہو، یا وہ دائیں جانب ہو یا بائیں جانب، اور اوپر سے رمی کرے یا اس کے نیچے سے۔ اختلاف صرف اس میں ہے کہ افضل کیا ہے؟

رق، درآخی لیکہ آپ اونٹنی پر سوار تھے، پس سوار ہونے کی حالت میں جمرہ عقبہ کی رمی کی۔ کذا فی الہدیٰ اور یہ بہت سی روایات میں معروف ہے۔ اور البدایہ والنبایہ میں یہ ہے کہ ابن ماجہ میں ائمہ جندب سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں: میں نے یوم النحر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمرۃ عقبہ کے پاس دیکھا درآخی لیکہ آپ حجر پر سوار تھے۔ الحدیث اور یہاں حجر کا ذکر بہت ہی غیر معروف ہے؟

باقی رمی کا حکم؟ تو جہوہور کے نزدیک یہ واجب ہے اگر اسے ترک کر دیا تو دم سے اسکی رمی کا حکم | اسلامی ہوگی۔ اور مالکیہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے اس لئے اس کی تلافی کی جائیگی، اور مالکیہ سے ایک روایت یہ ہے کہ جمرۃ عقبہ کی رمی رکن ہے اس کے ترک سے حج باطل ہو جائے گا۔ اور اس کے مقابل بعض کا قول ہے کہ رمی صرف تکبیر کی یادداشت کے لئے ہے۔ جیسا کہ تکبیر بوقت رمی کی مباحث میں آگے آتا ہے۔ تفصیل اوجز میں ہے۔

بعد طلوع الشمس ترجمہ: طلوع آفتاب کے بعد۔

اور جن میں اس مسئلہ پر تفصیل سے لکھا ہے ان دونوں صورتوں کے
 رمی پیدل ہو یا سواری پر؟ جواز پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کرنے کے بعد افضلیت میں اختلاف کا
 ذکر کرتے ہوئے موفقی سے نقل کیا ہے کہ: "نافع کہتے ہیں ابن عمرؓ یوم النحر کو جمرہ عقبہ کی رمی اپنی سواری پر کیا
 کرتے تھے اور باقی تمام ایام کی رمی پیدل ہی کرتے تھے۔ اور وہ اس عمل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف
 منسوب کرتے تھے" اس روایت جمرہ عقبہ کی رمی اور دیگر جہرات کی رمی کے درمیان فرق ثابت ہوتا ہے یہ
 فودی اپنے مناسک میں جمرہ عقبہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر منیٰ میں سواری پر آیا ہو تو
 اس کی رمی سواری پر کرے۔ اور ایام تشریق کے پہلے دونوں کی رمی پیدل مستحب ہے۔ اور تیسرے
 دن کی سواری ہو کر ابن حجر کہتے ہیں کہ یہی معتد ہے۔ اور درمیر لکھتے ہیں: "اور منیٰ میں پہنچتے ہی جمرہ عقبہ
 کی رمی مستحب ہے خواہ سواری ہو کر ہو۔ اور دیگر جہرات کی رمی پیدل کرنا مندوب ہے" آہ۔ و موفقی اس کی
 شرح میں لکھتے ہیں: یعنی مستحب یہ ہے کہ منیٰ پہنچتے ہی جس حالت میں پہنچا ہو، خواہ سواری ہو کر یا پیدل حالت
 بیہمی کرے: "اتبلی مختصر"۔ را حنفیہ کا مذہب: توشیح قدس سرہ کو کب میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی
 اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کی رمی سواری ہونے کی حالت میں کی یہ ہمارے نزدیک اگرچہ جائز ہے مگر خلاف
 اولیٰ ہے۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سواری پر ہونے کا غرور ہی ہے جو آپ کے سواری
 کی حالت میں طواف کرنے کا ہے کہ لوگ رمی کا طریقہ دیکھ لیں۔ یعنی رمی کرنے والا جہرات سے کتنی
 دور کھڑا ہو، کنکریوں کی مقدار کتنی ہو، اور کس جانب کھڑا ہونا چاہیے؟ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ
 وسلم نے پہلے دن کی رمی میں ان امور کو بیان فرمادیا تو اس کے بعد سواری ہو کر رمی نہیں کی۔ اور اس کے حاشیہ
 میں ہے کہ شیخ کا یہ ارشاد فقہ حنفی کے تین اقوال میں سے ایک کے مطابق ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ پیدل ہی
 کرنے میں کمال تصرف ہے نیز اس صورت میں لوگوں کی ایذا کا خطرہ نہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سواری ہو
 کر رمی کرنا مطلقاً افضل ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ جس رمی کے بعد رمی ہو اس میں پیدل رمی کرنا
 افضل ہے۔ ورنہ سواری ہو کر حضرت شیخؒ کے نزدیک پہلا قول مختار ہے۔ نیز آپ نے اپنے رسالہ زبدۃ
 المناسکؒ میں بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "اور پیدل رمی کرنا اولیٰ ہے۔ جیسا کہ ابن ہمام
 کا مختار ہے" آہ۔

طلوع آفتاب کے بعد یوم نحر کی رمی کے وقت میں ائمہ کا اختلاف: "ضعفاء کو مزدلفہ سے قبل

از وقت بھیجئے کی بحث میں گزر چکا ہے۔

جمرو کے پاس اٹھائی ہوئی کنکریوں سے می کرنا | اس دن کی رمی ان کنکریوں کے ساتھ کی تھی جو ابن عباسؓ نے مقام رمی سے اٹھائی تھیں: "اھ ابن عربی کا یہ قول انس روایت کے خلاف ہے جو پہلے گدڑ چکی ہے آنحضرت صلی اللہ نے ان کو راستہ سے کنکریاں اٹھانے کا حکم کیا تھا۔ جو کنکریاں موضع رمی سے اٹھائی جائیں ان سے رمی کرنے پر اوجز میں خوب بسط سے کلام کیا ہے۔ اوجز میں ہے کہ موقوف کہتے ہیں: رمی کی کنکریاں راستے سے اٹھائے یا مزدلفہ سے، اور یہ اس لئے مستحب ہے کہ منیٰ آنے کے بعد رمی سے پہلے کسی چیز میں مشغول نہ ہو، کیونکہ جس طرح مسجد حرام کا تختہ طواف ہے اسی طرح منیٰ کا تختہ رمی ہے۔ اور امام شافعیؒ نے اس کو مستحب قرار دیا ہے۔ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ کنکریاں جہاں سے چاہو اٹھا لو اور یہی صحیح تر ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ کیونکہ ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کی صبح کو، جب کہ آپؐ اپنی اونٹنی پر سوار تھے، مجھ سے فرمایا کہ میرے لئے کنکریاں اٹھا لاؤ۔ پس میں نے سات کنکریاں اٹھائیں، "الحديث۔ اور یہ منیٰ کا قصہ ہے اور اس میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں کہ جہاں سے اٹھالے کفایت کریں گی، انتہی۔

اور نووی شرح مہذب میں لکھتے ہیں: "ہمارا مذہب یہ ہے کہ رمی کے لئے کنکریاں اٹھانا مزدلفہ کے درمیان مستحب ہے اور حضرت عطاء اللہ امام الکلبیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جہاں سے چاہے اٹھالے: ابن منذر کہتے ہیں: اس امر میں علماء کے درمیان کسی اختلاف کا مجھے علم نہیں کہ جہاں سے بھی اٹھالے کفایت کریں گی، انتہی۔ اور اوجز میں درودیر سے نقل کیا ہے کہ رمی کے لئے جہاں سے چاہے کنکریاں اٹھالے۔ البتہ جمرہ عقبہ کے لئے مزدلفہ سے اٹھانا مستحب ہے: "اھ اور ابن عابدیؒ کہتے ہیں کہ: مستحب یہ ہے کہ جمرہ عقبہ کے لئے مزدلفہ سے یا راستہ سے سات کنکریاں اٹھالے۔ اور ان سات کے علاوہ کے لئے ہمارے نزدیک کوئی مخصوص جگہ مقرر نہیں۔ انتہی ملخصاً۔ اور ہدایہ میں ہے کہ: جہاں سے چاہے کنکریاں اٹھالے۔ مگر جمرہ کے پاس سے نہ لے۔ کہ یہ مکروہ ہے۔

واحدۃ بعد واحدۃ یکبر مع کل حصۃ

ترجمہ: یکے بعد دیگرے ایک ایک کنکری مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے۔

کیونکہ جمرہ کے پاس کی کنکریاں غیر مقبول ہوتی ہیں، حدیث میں یوں نہیں آتا ہے، اس لئے وہاں سے اٹھانے میں بدشگونی ہے۔ تاہم اگر کوئی ایسا کرے تو کفایت کرے گا۔ کہ فعل رمی بہر حال پایا گیا۔ اور اور موفق لکھتے ہیں: اگر موضع رمی سے کنکریاں اٹھا کر رمی کی تو اس کو کفایت نہیں کرے گی، اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس کو کفایت کریگی، کیونکہ یہ بھی کنکریاں ہیں۔ لہذا عموم میں داخل ہیں۔ ہمارے دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر موضع رمی سے کنکریاں لی تھیں۔ اور آپ نے فرمایا تھا: مجھ سے اپنے مناسک حاصل کر لو، اور اوجز میں اس پر مفصل کلام کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: ابن حزم کا یہ قول مردود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کنکریوں سے رمی کی تھی۔ جو عبد اللہ بن عباسؓ نے مقام رمی سے اٹھائی تھیں۔ علاوہ ازیں دونوں اقوال کے درمیان یہ تطبیق ممکن ہے کہ مزدلفہ سے جو کنکریاں لی تھیں شامدان میں سے کوئی حضرت فضلؓ سے گر گئی ہوگی۔ اس کے بدلہ میں آپؐ نے موقف سے یعنی جہاں آپؐ بطن وادی میں کھڑے تھے وہاں سے اٹھانے کا حکم فرمایا ہوگا۔ یہ نہیں کہ جہاں رمی کی کنکریاں گرتی ہیں وہاں سے اٹھانے کا حکم فرمایا ہو۔ لہذا۔ اوجز میں بہت ہی بسط سے لکھا ہے

یکے بعد دیگرے ایک ایک کنکری مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر رمی کے متعلق سبائجشیں

کہتے۔ کنانی الہدی۔ اور اوجز میں مسائل رمی پر خوب بسط سے کلام کیا ہے، جس میں تقریباً بیس ابحاث ذکر کی ہیں۔ سات بحثیں اس مقام سے متعلق ہیں۔ اول: تکبیر کے وقت رفع یدین کا حکم۔ دوم: تکبیر کس وقت کہی جائے۔ رمی کے ساتھ یا رمی کے بعد؟ ائمہ اربعہ کے نزدیک رمی کے ساتھ تکبیر کینا مختار ہے۔ جیسا کہ اوجز میں ان کی کتب فقہ سے نقل کیا ہے۔ سوم: اس تکبیر کا حکم؟ حافظ کہتے ہیں: اس پر ان کا جملہ ہے کہ جو شخص تکبیر کر کرے اس کے ذمہ کچھ لازم نہیں۔ البتہ امام نوویؒ کا قول ہے کہ تارک تکبیر کھانا کھلائے اور اگر دم کے ذریعہ اس کی تلافی کرے تو میرے نزدیک اور بھی اچھی بات ہے۔ اھ۔ چہام۔ الفاظ تکبیر اور اوجز میں فروغ ائمہ سے اس کے کہ الفاظ نقل کئے ہیں مثلاً ۱۔ سحر اللہ، ۲۔ اللہ اکبر اور ۳۔ اللہ اکبر کبیرا وغیرہ، پنجم: اگر تکبیر کے بجائے تسبیح کہے تو مضائقہ نہیں۔

ششم: ایک ایک کنکری پھینکنا یہاں ہی ساتوں کنکریاں ایک ہی بار پھینکنا حکم | بحث اصل مقصود ہے اور اجز میں اس پر بھی خوب بسط سے لکھا ہے۔ موثق کہتے ہیں: اگر بہت سی کنکریاں ایک ہی دفعہ پھینک دیں تو صرف ایک سمجھی جائے گی۔ امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے۔ اور یہی امام مالک، امام شافعی اور اصحاب سائے کا قول ہے۔ اور عطاء کہتے ہیں کہ اگر ساری ایک ہی دفعہ پھینک دیں تو کفایت کریں گی: میں کہتا ہوں کہ حافظ نے حذیفہ کا قول جو عطاء کے موافق نقل کیا ہے یہ صحیح نہیں۔ حنفیہ کی کتابوں میں معروف وہی ہے جو موثق نے نقل کیا ہے۔

ہفتم: جو اجز میں بحث دوم کے ضمن میں ذکر کی گئی ہے۔ وہ رمی کے بجائے دوسرے تکبیر کہہ لینا | یہ طبری نے بعض کا قول نقل کیا ہے کہ اگر کوئی کنکری نہ پھینکے بلکہ ہر حجرہ کے پاس سات مرتبہ تکبیر کہتا رہے تب بھی کافی ہے۔ ان صاحب کا کہنا ہے کہ کنکریاں پھینکنا دراصل سات تکبیروں کی یادداشت کے لئے ہے، جیسا کہ تسبیحات میں انگلیاں بند کرنا محض گنتی یاد رکھنے کے لئے ہے۔ پوری بحث اجز میں دیکھئے، امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک باب کا عنوان یہ قائم کیا ہے: باب یک بتریع کل حصاة میرے نزدیک اوجہ یہ ہے کہ اس عنوان سے مقصود اس قول کی تردید ہے۔ چنانچہ میں نہ تراجم بخاری میں اس کو بیان کیا ہے۔

رق، اور حضرت بلالؓ اور حضرت اسامہؓ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ایک نے آپؐ کی اوٹنی کی مہار تھاں رکھی تھی۔ دوسرے صاحب آپؐ کو دھوپ سے بچانے کے لئے کپڑے سے سایہ کر رہے تھے۔ اگر یہ یوم نحر کا قصہ ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ محرم کے لئے کجاوہ وغیرہ کے سائے میں بیٹھنا جائز ہے۔ اور اگر یہ ایام منیٰ میں سے کسی اور دن کا قصہ ہے تو مسئلہ مذکورہ کی دلیل نہیں۔ اور حدیث میں یہ ذکر نہیں آتا کہ یہ کس وقت کا قصہ ہے۔ کنانی الہدی (رض) ان محرم کے سائے میں بیٹھنے کا مسئلہ اختلافی ہے اس کا بیان رسالہ کے ابتدائی صفحات میں آچکا ہے۔ جہاں یہ بحث آئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اوٹنی پر حج کیا۔ اور شکوۃ شریفی میں روایت مسلم ام حبشیؓ سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: میں نے اسامہؓ و بلالؓ کو دیکھا کہ ان میں سے ایک آپؐ کی اوٹنی کی مہار تھاں ہوئے تھے۔ اور دوسرے اپنے کپڑے سے آپؐ کو سایہ کر رہے تھے۔ یہاں تک

کہ آپ جمرہ عقبہ کی رمی سے فارغ ہو گئے۔ یہ حدیث اسی لفظ سے ابو داؤد میں بھی آئی ہے۔ تلامذہ فارسی کہتے ہیں اول سے مراد بظاہر بلالؓ ہیں اور دوسرے سے اسامہؓ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نسائی میں اسی حدیث کی روایت میں اس کی تصریح موجود ہے۔ روایت کے لفظ یہ ہیں آپس میں نے بلالؓ کو دیکھا کہ آپ کی اونٹنی کی ہمارے تھامے ہوئے ہیں۔ اور اسامہ بن زیدؓ آپ پر کپڑے سے سایہ کر رہے ہیں۔ اور آپ احرام کی حالت میں تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے جمرہ عقبہ کی رمی کی، الخ اس میں آپ کے محرم ہونے کی بھی تصریح ہے۔ جس سے اس بات کی تعمین ہو گئی کہ یہ قصہ یوم نحر کا ہے۔ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ابو داؤد میں عمرو بن احوص کی اپنی والدہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر بطن وادی سے جمرہ کی رمی کر رہے تھے۔ اور ہر کنکر می کے ساتھ تبرکیر کہتے تھے۔ ایک آدمی پیچھے سے آپ کو پردہ کر رہا تھا۔ میں نے اس شخص کا نام دریافت کیا تو لوگوں نے بتلایا کہ یہ فضل بن عباسؓ ہیں، الخ شیخ بدل میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ حدیث امام احمد نے مفصل ذکر کی ہے۔ اور اس کے سیاق سے یہ اشکال حل ہو جاتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ بطن وادی سے جمرہ عقبہ کی رمی کر رہے تھے۔ اور آپ کے پیچھے ایک آدمی آپ کو لوگوں سے پردہ کر رہا تھا۔ کہ کہیں کوئی پتھر آپ کو نہ لگے، الخ تو اب صورت یہ ہوئی کہ حضرت فضلؓ تو آپ کو پیچھے سے پردہ کرتے ہوئے تھے، تاکہ آپ کو پیچھے سے آنے والی کنکریوں سے بچائیں۔ اور حضرت اسامہؓ اپنے کپڑے سے آپ کے سر مبارک پر دھوپ سے سایہ کر رہے تھے۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں قصے دو الگ الگ آیام کے ہوں مگر ائمہ حصینؒ کی حدیث کا واقعہ معین طور پر یوم نحر کا ہے۔ کیونکہ نسائی کی روایت میں آپ کے محرم ہونے کی تصریح ہے اور زرقانیؒ نے یوں تطبیق دی ہے کہ ممکن ہے دونوں باری باری سایہ کر رہے ہوں۔ اور دیکھ سے منی اجلنے کی بحث میں گذر چکا ہے کہ بلالؓ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی جس پر کپڑا لٹکا کر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سایہ کر رہے تھے۔

ولم یزل یلبی الی اول حصاة ثم رجع الی متی فخطب خطبة
توجہ: اور پہلی کنکری تک آپ برابر تبلیہ پڑھتے رہے، پھر متی کی طرف لوٹے اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔

اور پہلی کنکری پھینکنے تک آپ برابر تبلیہ پڑھتے رہے۔ مشہور
حاجی تبلیہ کتب کرنے؟

اختلافی مسئلہ ہے جو اوجز میں بسط کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ اس کا
اجمالی خلاصہ حاشیہ الایع میں مذکور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حاجی تبلیہ کتب ختم کرے؟ بخاری کی حدیث
میں حضرت فضلؓ اور حضرت اسماءؓ دونوں کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمی جبرہ عقبہ
تک برابر تبلیہ کہتے رہے یہ جہور کے قول کی۔ جن میں امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ
بھی شامل ہیں، دلیل ہے کہ جبرہ عقبہ کی رمی تک تبلیہ کہتا ہے۔ البتہ اس میں ان کا اختلاف ہے
کہ پہلی کنکری کے ساتھ بند کر دے یا رمی پوری کرنے کے بعد، جہور پہلی صورت کے قائل ہیں۔
اور امام احمدؒ اور بعض اصحاب شافعیؒ دوسری صورت کے اور ایک گروہ کا قول ہے کہ محرم حب حرم
میں داخل ہو جائے تو تبلیہ بند کر دے۔ لیکن جب مکہ سے عذہ کی طرف نکلے تو دوبارہ تبلیہ شروع
کر دے۔ ابن عمرؓ کا یہی مذہب ہے۔ اور ایک گروہ کا قول ہے کہ جب عرفات میں موقف کی
طرف چلے تو تبلیہ بند کر دے۔ امام مالکؒ اسی کے قائل ہیں۔ اور انہوں نے اس کو یوم عذہ کے زوال
آفتاب کے ساتھ مقید کیا ہے۔ پوری تفصیل اوجز میں دیکھی جائے۔

پھر متی کی طرف لوٹے اور ایک تبلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں آئمہ
خطبہ یوم نحر کا اختلاف یوم الترویہ کے ذیل میں گذر چکا ہے۔ چنانچہ شافعیہ و حنابلہ اس
کے قائل ہیں۔ اور حنفیہ و مالکیہ اس کے قائل نہیں، بلکہ وہ اسے وصایا عامہ پر محمول کرتے ہیں یعنی
نے یہ بات بڑے وثوق سے کہی ہے کہ خطبہ وصایا عامہ کے باب سے متعارف نہ کہ مناسک حج سے، اور
شیخ بذل میں فرماتے ہیں کہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ خطبہ مذکورہ متعلقات حج سے نہیں تھا کیونکہ
احکام حج میں سے اس میں کوئی بات نہیں بیان فرمائی گئی۔ اس میں صرف وصایا عامہ ذکر فرمائے۔
اور کسی نے یہ نقل نہیں کیا کہ آپؐ نے اس خطبہ میں یوم نحر سے متعلق کوئی حکم بیان فرمایا ہو جس سے ہم
یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ خطبہ حج کی خاطر مقصود نہیں تھا، اور ابن قسار کہتے ہیں: یہ خطبہ آپؐ نے
ان مضامین کی تبلیغ کی خاطر ارشاد فرمایا تھا۔ جو اس میں ذکر کئے گئے ہیں کیونکہ دنیا کے دور دراز گوشوں

سے بہت سا مجمع جمع تھا۔ دیکھنے والوں نے بوں گمان کیا کہ آپؐ نے خطبہ دیا؟ اھ ان حضرات کا یہ کہنا کہ یہ خطبہ دھایا عامہ کے قبیل سے تھا۔ اس کی تائید ان مضامین سے ہوتی ہے جو شیخ ابن قیمؒ نے اس خطبہ کے ضمن میں نقل کئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ”آپؐ نے لوگوں کو ایک مبلغ خطبہ دیا جس میں یومِ شکرِ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرمت اور تمام شہروں کے مطالبے میں مکہ مکرمہ کی عزت و حرمت بیان فرمائی۔ اور حکم فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے اس کی سمیع و طاعت بجا لاؤ۔ اور لوگوں کو ارشاد فرمایا کہ وہ اپنے مناسک چھ سیکھ لیں۔ اور ارشاد فرمایا کہ شاید میں اس سال کے بعد حج نہیں کروں گا۔ ان کو احکام حج کی تعلیم فرمائی۔ ہاجرین و انصار کے لئے ان کے منازل تجویز فرمائے۔ لوگوں کو حکم فرمایا کہ وہ آپؐ کے بعد کفر کی طرف نہ لوٹ جائیں کہ ایک دوسرے کا کلا کاٹنے لگیں۔ آپؐ نے حکم فرمایا کہ حاضرین نے جو کچھ سنا ہے، آپؐ کی جانب سے مان لوگوں کو جو یہاں موجود نہیں، پہنچا دیں اور آپؐ نے بتایا کہ بیت سے لوگ جن کو احکام پہنچائے جائیں۔ سننے والے سے زیادہ محفوظ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور آپؐ نے خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ہر مجرم کا جرم صرف اسی کی ذات پر عائد ہوگا کسی دوسرے سے اس کی بات پس نہیں ہوگی، اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لئے لوگوں کے کان کھول دیئے۔ یہاں تک کہ اہلِ نبیؐ اپنی اپنی جگہ پر آپؐ کا خطبہ سن رہے تھے اور آپؐ نے اپنے اسی خطبہ میں فرمایا: ”اپنے رب کی عبادت کرو۔ نماز پنجگانہ ادا کرو۔ ماہِ مبارک کے روزے رکھو۔ اپنے اولوالاہر کی اطاعت کرو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے“ اور آپؐ نے اس وقت لوگوں کو الوداع کہی۔ اس لئے اس کا نام ”حجۃ الوداع“ ہوا۔“

رضی، اور اسی خطبہ میں آپؐ نے ایک دوسرے کے خون۔ مال اور آبرو کی حرمت بیان فرمائی۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وارث کے لئے وصیت نہیں، جیسا کہ نزلِ علیؑ میں ہے اور یہ بھی فرمایا کہ زمانہ گھوم کر اپنی اصلی ہیئت پر آگیا ہے۔ سال کے بارے میں جیسے ہیں جن میں چار حرمت کے جیسے ہیں: اور اس میں یہ بھی فرمایا ”اور غریب تم اپنے رب کے سامنے جاؤ گے، وہ تمہارے اعمال کے بارے میں دریافت فرمائیں گے۔ دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہو جاؤ“ الخ جیسا کہ روایات میں معروف ہے۔ اور یہ بھی تین بار فرمایا: ”دیکھو! کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟“ اور فرمایا ”سنو! جو حاضر ہیں وہ ان کو پہنچا دیں جو حاضر نہیں“ الخ کنانی الطبقات۔ اور آپؐ نے مسیح و تہال کا بھی ذکر فرمایا۔ اور بڑا طویل بیان فرمایا۔

یہ پوری حدیث بخاری باب ”حجۃ التواضع“ میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی وصیتیں فرمائی ہیں۔ جو بہت سی کتب احادیث میں بالخصوص طبقات ابی سعد میں وارد ہوئی ہیں۔ اور اس سے زیادہ البزّی والنبہایہ میں ہیں، پس یہ تمام روایات دلالت کرتی ہیں کہ اس خطبہ میں وصایا عامہ ذکر فرمائی تھیں۔ اسی بنا پر امام طحاوی فرماتے ہیں، جیسا کہ زر قانی نے ان سے نقل کیا ہے کہ اس خطبہ کے کسی راوی، ابن عمر، ابن عباسؓ اور ابی بکرؓ وغیرہ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ آپؐ نے کسی ایسی چیز کی تعلیم فرمائی ہو جس کا تعلق یوم نحر ہے۔

اور زر قانی یہ بھی کہتے ہیں کہ بیہقی میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث سے
سورۃ النصر کا نزول | بسند ضعیف اس وداع کا سبب مذکور ہے اس کے لفظ یہ ہیں کہ: ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ“ وسط ایام تشریق میں نازل ہوئی اور آپؐ نے پہچانا کہ یہ پیغام وداع ہے، پس آپؐ نے اپنی قصوں نامی اونٹنی کو تیار کرنے کا حکم فرمایا، پس تیار کی گئی۔ پس آپؐ سوار ہوئے، اور عقبہ میں شہرے اور لوگ آپؐ کے گرد جمع ہو گئے۔ پس آپؐ نے فرمایا اے لوگو! اس کے بعد حدیث کے مضامین وہی ہیں جو اوپر ذکر ہوئے، اور یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ یہ خطبہ یوم نحر میں نہیں۔ بلکہ ایام تشریق میں ہوا تھا کیونکہ یہ خطبہ سورۃ النصر کے نزول کے بعد تھا۔ اور سورۃ النصر وسط ایام تشریق میں نازل ہوئی سورۃ النصر کے زمانہ نزول میں روایات مختلف ہیں کہ آیا اس کا نزول وصال نبوی سے ایک سال پہلے ہوا تھا یا دو سال پہلے اور یہ کہ اس کا نزول مکہ میں ہوا یا مدینہ میں؟ ان روایات کی تفصیل درنثور میں ہے۔ مندرجہ بالا روایت جوز قانی نے نقل کی ہے، علامہ سیوطیؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کی تخریج ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، بزار، ابویعلیٰ، ابن مردودہ، اور بیہقی نے دلائل نبوت میں ابن عمرؓ سے کی ہے۔ اور ایام منیٰ کے ذیل میں بھی وسط ایام تشریق میں اس کے نازل ہونے کا بیان آئے گا۔

حضرت شیخ ندل میں فرماتے ہیں کہ مولانا محمد یحییٰ نے اپنے شیخ نور اللہ مرقدہ کے افادات میں تحریر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات حج کے سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ اور ظاہر یہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دن خطبہ دیا۔ بلکہ ساتوین تا یسّیخ سے ختم مناسک تک تمام ایام میں خطبہ دیا۔ اور اس میں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سے یہی

ظاہر ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو ہر وقت وعظ و تذکرہ فرماتے تھے، خصوصاً ان دنوں میں وہ وعظ نصیحت کے بہ نسبت دیگر اوقات کے زیادہ محتاج تھے۔ اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع بھی تھے۔ لہذا یہ مناسب نہیں کہ خطبات کی تمام روایات کو تین یا چارہ خطبوں کی طرف راجع کیا جائے۔ اور ہمارے علماء احناف رحمہم اللہ کا یہ مذہب کہ امام ۷ؑ ہر روزی الحجہ کو خطبہ دے پھر وہ پھر امام کو تو اس کا مقصد لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ ان کے یومیہ اجتماع سے انہیں حرج لاحق ہوگا کہ انہیں ہر دن سامان اٹھانا اور چیزیں درست کرنا پڑے گی اور سامان کی حفاظت بہ وزن و سلاطین گاہمارے علماء کا یہ مقصد نہیں کہ ان خطبات پر زیادتی کرنا ممنوع یا بدعت ہے۔ واللہ اعلم۔ انتہی۔ پھر حنفی مذہب ہے کہ شیخ ابن قیمؒ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ خطبہ بوقت چاشت ہوا، اور مناسب نووی میں ہے کہ ”امام کے لئے سنت ہے کہ اس دن نماز ظہر کے بعد خطبہ دے“ اور ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اس پر امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کا اتفاق ہے۔ مگر اس میں اشکال ہے کیونکہ احادیث میں تصریح ہے کہ یہ خطبہ یوم نحر کی چاشت کو ہوگا نہ ظہر کے بعد۔ ابو داؤد میں بسند ثقافت مروی ہے: ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ منیٰ میں شہباز نامی خچر پر چاشت کے وقت خطبہ دے رہے تھے۔“ مصنف نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ صحیح بخاری میں ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطبہ زوال کے بعد تھا کیونکہ اس روایت میں ہے کہ بعض سالکین نے عرض کیا کہ میں نے شام ہونے کے بعد رمی کی، اور شام کا اطلاق زوال کے بعد ہوتا ہے۔ اس لئے ابن عباسؓ کی روایت مقدم ہے کیونکہ وہ صحت و شہرت میں ابو داؤد کی روایت سے فائق ہے۔ اور علامہ سبکی نے یہ جواب دیا کہ ابو داؤد کی روایت میں جو خطبہ مذکور ہے وہ یوم نحر کا نہیں بلکہ گیارہ تاریخ کا خطبہ تھا چنانچہ طبقات ابن سعد میں عمرو بن یثربؓ سے ہی روایت اس طرح مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم نحر سے اگلے دن کا خطبہ یاد رکھا ہے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قصوراز نامی اونٹنی پر سوار تھے، اور وہ اس پورے خطبہ کو نقل کیا کرتے تھے۔

زرقانی کہتے ہیں کہ آپؐ نے شہباز نامی خچر پر خطبہ دیا۔
خطبہ خچر پر دیا تھا یا اونٹنی پر؟ ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ شہباز کے معنی ہیں جس کا رنگ سفید ہو اور اس میں قدیمے سیاہی کی آمیزش ہو، اور زرقانی کہتے ہیں یعنی سفید رنگ جس کی سفیدی

قلت، وعلی رضی اللہ عنہ یعدہ عنہ

ترجمہ: (رش)، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترجمانی کر رہے تھے۔

سیاہی پر غالب ہو، اور ابوداؤد کی کتاب اللباس کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ ”اور سرخ چادر آپ کے زیب تن تھی“ یہ حدیث ابوداؤد نے رافع بن عمر المزنی سے اسی طرح روایت کی ہے۔ اور ابوداؤد ہی میں ہر اس بن زیاد سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: ”میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کے دن منی میں اپنی عضبان نامی اونٹنی پر خطبہ دے رہے تھے“ شیخ قدس سرہ بذل میں فرماتے ہیں کہ ”یہ رافع بن عمرو کی روایت، ہر اس کی روایت کے مخالف ہے لہذا ہر اس کی روایت کو خطبہ یوم نحر پر محمول کیا جائیگا، اور رافع بن عمرو کی حدیث خطبہ یوم النحر کے علاوہ کسی اور دن پر“

(رش)، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترجمانی کر رہے

حضرت علی کا ترجمانی کرنا تھے جیسا کہ زندقانی میں ہے۔ زندقانی کہتے ہیں ”یَعْبُرُ بضم اول تشدید بار۔ یعنی آپ کی آواز کو دور تک پہنچاتے تھے۔ جو ہری کہتے ہیں کہ جب کسی کی جانب سے گفتگو کرو تو اس کے لئے عَبْرَتْ عَنْ فُلَانٍ کہا جاتا ہے۔ اور زبان مافی الضمیر کی ترجمانی کرتی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ آپ کی عبارت کی تفسیر و تشریح کرتے تھے۔ اس صورت میں یہ لفظ تعبیرِ خواب سے مانوڑ ہوگا جس کے معنی ہیں تفسیر کرنا۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات لوگوں کو سمجھاتے تھے۔ یہ عَبْرَتْ الْكِتَاب سے مانوڑ ہوگا۔ لیکن پہلے معنی ظاہر بلکہ متعین ہیں: ”اور مآ علی قاریؒ کہتے ہیں: ”یعنی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز دور کے لوگوں کو پہنچاتے تھے۔ گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی دور کھڑے تھے جہاں تک آپ کی آواز پہنچ رہی تھی، اور وہ اسے سمجھ کر دور کے لوگوں کو کسی نہیادتی کے بغیر سمجھا رہے تھے۔ اور ابن حجر کا یہ کہنا بے محل ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے پہنچاتے تھے“ اور۔

علامہ زندقانی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحابہ کے اس قول کے خلاف نہیں کہ ”ہمارے کان کھل گئے تھے اور ہم اپنی اپنی جگہ آپ کی آواز سن رہے تھے۔“ کیونکہ ممکن ہے کہ یہ خطبہ اس خطبہ کے علاوہ ہوگا کہ منی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی بار خطبے ہوئے، یا یہ کہا جائے کہ معجزہ صرف انہی لوگوں کے حق میں تھا جو اس مجلس میں موجود نہیں تھے۔ اور جو لوگ اس مجلس میں حاضر تھے وہ معتاد طریقے ہی سے سنتے

تھے۔ اس لئے بسا اوقات کوئی لفظ شغل کی وجہ سے سننے سے رہ جاتا تھا، یا بعض لوگ اس لغت سے ناواقف ہوں گے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے خطاب فرما رہے تھے۔ کیونکہ اس موقع پر مختلف قبائل سے بہت سی مخلوق جمع تھی۔ اور دلی عراقی نے کہا ہے کہ یہ خطبہ اس خطبہ کے علاوہ تھا جو قبل انیس ذکر کیا گیا۔ کیونکہ یہاں اونٹنی کا ذکر ہے اور وہاں خچر کا ذکر تھا۔ اور وہ حدیث جس میں خچر کا ذکر ہے۔ ابو داؤد، نسائی، بغوی اور طبرانی وغیرہ نے ان ہی سے یعنی رافع بن عمر والمزنی سے طوالت کے ساتھ روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں: میں اپنے والد کے ساتھ حجۃ الوداع کو گیا۔ اس وقت میری عمر دس بارہ برس یا اس سے زیادہ تھی، میں نے دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شہبائی نامی خچر پر لوگوں سے خطاب فرما رہے ہیں۔ اور علی بن ابی طالبؓ آپؐ کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ لوگ کچھ کھڑے ہیں کچھ بیٹھے ہیں میرے والد تو بیٹھ گئے۔ اور میں اونٹوں کے درمیان سے ہوتا ہوا خچر تک جا پہنچا پس میں نے آپؐ کو رکاب پکڑ لی، پھر میں نے آپؐ کے زانو پر ہاتھ رکھ کر پٹلی تک ہاتھ پھیرا، یہاں تک کہ قدم مبارک تک پہنچ گیا۔ پھر میں نے نعل مبارک اور پاؤں مبارک کے درمیان ہاتھ ڈالا۔ مجھے آج تک یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپؐ کے قدم مبارک خنکی ہیں اپنے ہاتھ میں پاتا ہوں: آھ۔۔۔ زرقانی کا کلام ختم ہوا۔

اور صحابہ کا یہ قول کہ ”ہم منیٰ میں اپنی اپنی جگہ بیٹھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سن رہے تھے۔“ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے تو حضرات صحابہؓ اپنے اپنے خیموں میں کیسے بیٹھے رہے؟ حضرت شیخ قدس سرہ نے بذل میں اس کا بہت ہی عمدہ جواب اللہ بنصود سے نقل کیا ہے، یہ میرے والدہ مرحوم نور اللہ مرقدہ کے سنن ابو داؤد کے افادات کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ”جواب یہ ہے کہ کیا تو اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ کسی ضرورت سے اپنے خیموں میں رہ گئے تھے وہ بھی آپؐ کی آواز سن رہے تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ سب اپنے اپنے خیموں میں بیٹھے رہے یا یہ مراد ہے کہ اگر وہ اپنے خیموں میں بھی ہوتے اور خطبہ میں حاضر نہ ہوتے تب بھی آپؐ کی آواز سن سکتے تھے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے متفرق مسائل اتفاقاً ذکر کئے ہوں۔ اور ان کو جمع کرنے کا اہتمام نہ فرمایا، مگر وہ حضرات لازماً جمع ہوتے الخ“ میں کہتا ہوں کہ اس ناکارہ کے نزدیک یہ تطبیق بھی ہو سکتی ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ اپنی اپنی قیام گاہوں اور خیموں میں تھے کہ ان کی قیام گاہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطبہ کے بعد متعین فرمائی تھیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ خطبہ سننے کے لئے اس مجلس میں جہاں بھی کوئی بیٹھا تھا خواہ وہ آپؐ سے کتنا ہی دور تھا وہیں آپؐ کا خطبہ سن رہا تھا۔ گویا اس حدیث

قال، وودع الناس فسمي حجة الوداع

ترجمہ: رِق، اور آپؐ نے لوگوں کو الوداع کہی، اس لئے یہ حج ”حجۃ الوداع“ کہلایا۔

میں منازل سے مجلس خطبہ کی نشست گاہیں مراد ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ سے دور تھیں کیونکہ صحابہ کرامؓ اس موقع پر ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے۔ ظاہر ہے سب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب جگہ ملنا ممکن نہیں تھا۔ اور ان دنوں لاؤڈ سپیکر یا مکمل الصوت بھی ایجاد نہیں ہو تھا، اس لئے سب تک آواز کا پہنچنا آپؐ کا معجزہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کان کھول دیئے۔

رِق، اور اس موقع پر آپؐ نے لوگوں کو الوداع کہی،

حجۃ الوداع کی وجہ تسمیہ و کسر نام | اس لئے یہ حج حجۃ الوداع کہلایا، اور اجز میں ہے کہ یہ نام

متعدد احادیث میں آتا ہے۔ اور ”وداع“ واؤ کے فتح کے ساتھ ہے، اور اس کا کسرہ بھی جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس حج میں رخصت کیا، اور آپؐ کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسکے بعد آپؐ کو ایسے کسی اور موقع کا اتفاق نہیں ہوگا۔ نہ اس جیسا اجتماع میسر ہوگا۔ اور سب اس کا یہ مؤا کو وسط ایام تشریق میں آپؐ پر اذا جاء نصر اللہ، نازل ہوئی، اور آپؐ نے جانا کہ یہ کوچ کا بیغا ہے۔ کذافی الجمع۔ اور عینی کہتے ہیں ”اس کو حجۃ الوداع“ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں لوگوں کو رخصت کیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ شاید اس سال کے بعد تم سے نہیں مل سکو ننگا، جن لوگوں نے اس نام کو مکروہ کہا ہے یہ ان کی غلطی ہے، اور اس کو حجۃ البلاغ کا نام بھی دیا گیا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں فرمایا تھا هَلْ بَلَغْتُ دُكْيَا میں نے پہنچا دیا؟ اور اس کو حجۃ الاسلام بھی کہتے ہیں کہ اس سال پہلی بار صرف مسلمانوں نے حج کیا۔ کوئی مشرک شریک حج نہیں تھا اور لامع کے حاشیہ میں قسطلانی سے نقل کیا ہے کہ اس کو حجۃ الوداع اس بنا پر کہا گیا کہ آپؐ نے اس میں اور اس کے بعد لوگوں کو ووداع رخصت کیا اور اس کا نام ”حجۃ الاسلام“ اس وجہ سے ہے کہ رخصیت حج کے بعد آپؐ نے مدینہ سے اس کے علاوہ کوئی حج نہیں کیا۔ اور حجۃ البلاغ اس بنا پر کہلاتا ہے کہ آپؐ نے اس میں مسائل حج کی تولا و فعلا تبلیغ فرمائی۔ نیز اس کا نام ”حجۃ التمام“ اور ”حجۃ الکمال“ بھی ہے۔ احمد۔ بخاری کے حاشیہ مطبوعہ ہندوستان میں اس پر یہ اضافہ ہے: کیونکہ ارشاد خداوندی، الیوم اکملت لکم دینکم الایہ۔ اس میں نازل ہوئی، احمد اور عینی نے اس پر یہ اضافہ

کیا ہے کہ ”حجۃ الوداع“ کا نام زیادہ مشہور ہے۔ اھ اور ملا علی قاری فرماتے ہیں: ”اس کا نام ”حجۃ الوداع“ اس وجہ سے ہوا کہ آپ نے اس حج میں لوگوں کو یا حرم کو الوداع کہی۔ اھ اور نیل المارب میں ہے: ”اس کو حجۃ الوداع“ کہنا مکروہ ہے، یہ کراہت کا قول صاحب خمیس نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔“ اور جز کی عبارت ختم ہوئی۔

اور امام بخاریؒ اپنی صحیح میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ”ہم آپس کی گفتگو میں حجۃ الوداع“ کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے۔ جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے۔ مگر ہمیں خبر نہیں تھی کہ حجۃ الوداع کا مفہوم کیا ہے؟ شیخ بیل بن فراتے ہیں کہ صحابہ کرام میں حضرات شیعین اور دیگر اعلیٰ طبقہ کے حضرات تو اس کی وجہ تسمیہ جانتے تھے۔ مگر عام لوگ صرف دوہروں کی تقلید میں یہ لفظ استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ کوئی بھی اس کی وجہ تسمیہ سے واقف نہ ہو مگر اس کے باوجود یہ نام استعمال کرتے ہوں۔ اور بعید نہیں کہ اس نام رکھنے کی ابتداء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوئی ہو کہ شاید میں تم کو اس سال کے بعد نہیں دیکھ سکوں گا۔ پس لوگوں نے آپ کے اس ارشاد کو اس معنی پر محمول کیا ہے کہ آپ آئندہ اس اجتماع کے ساتھ حج نہیں کریں گے۔ اس بنا پر انہوں نے اس کا نام ”حجۃ الوداع“ رکھا۔ پھر جب اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ کا وداع کہنا کسی خاص جماعت سے مخصوص نہیں تھا۔ اور یہ کہ یہ صرف ان عوام کو جو اس حج میں جمع تھے رخصت کرنا نہیں تھا بلکہ خاص و عام سب کو رخصت کرنا تھا۔ آھ اور اس کے حاشیہ میں مولانا محمد من علی کے افادات سے نقل کیا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد کہ ہمیں خبر نہیں تھی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں خبر نہیں تھی کہ اس کو ”حجۃ الوداع“ کیوں کہتے ہیں کیونکہ غایت محبت کی بنا پر ہمارے دل ہیں اس کا وہم بھی نہیں تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے رخصت ہو جائیں گے۔ آھ اور حافظ کہتے ہیں: ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کا لفظ ذکر فرمایا، اور صحابہ اسے استعمال کرنے لگے۔ مگر ان کا ذہن ادھر نہیں گیا کہ وداع سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کو وداع کرنا ہے یہاں تک اس کے کچھ عرصہ بعد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ پیش آیا تو صحابہ کرام اصل مراد کو سمجھ، اور انہیں معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اپنی اس وصیت

لے دنی الاصل راعنی البذل“ اذ لا یبعد۔ والظاہر اذ یبعد۔ شیخ۔

کے ذریعہ رخصت کیا تھا کہ آپ کے بعد کفر کی حالت کی طرف نہ لوٹ جائیں۔ اور اس وداع کو یوں منکر فرمایا کہ پہلے ان کو اس بات پر گواہ بنایا کہ آپ تمام احکام خداوندی ان تک پہنچا چکے ہیں۔ اور پھر ان کی گواہی پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا۔ اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ ”حجۃ الوداع“ کے لفظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کیا تھی؟ اور بخاری کی کتاب الحج، باب الخطبہ بمنی میں بروایت عاصم عن ابیہ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ اس حدیث میں یہ لفظ ہے خودع الناس پس آپ نے لوگوں کو رخصت کیا، اور یہی حدیث میں ہے کہ سورۃ اذا جاء نصر اللہ والفتح وسط ایام تشریق میں نازل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ یہ وداع یعنی رخصت کا پیغام ہے، پس آپ سوار ہوئے اور لوگ جمع ہو گئے۔ پس آپ نے خطبہ دیا آخر پوری تفصیل حاشیہ لایع میں ہے۔

ارشاد نبوی: شاید میں تمہیں | ارشاد: شاید کہ میں تمہیں اس سال کے بعد نہیں دیکھوں گا، کے ذیل اس سال کے بعد نہیں دیکھوں گا | میں فرماتے ہیں: اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس بات کی ترغیب دینا تھا کہ وہ آپ سے احکام سیکھ لیں، آپ نے اس حج میں اپنی امت مرحومہ کو وداع کیا تھا۔ اس لئے اس کا نام حجۃ الوداع ہوا۔ تمام صحابہ اس کی وجہ تسمیہ کو نہیں سمجھ پائے۔ البتہ بعض فقہاء صحابہ نے شروع ہی سے جان لیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ ہی عرصہ میں انہیں چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو رہے ہیں، اور ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کار ساز ہے، پھر جب اس حج کے فریضہ دو ماہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دار دنیا سے رہ کر لائے عالم آخرت ہوئے عام صحابہ کو تب معلوم ہوا کہ اس حج کو حجۃ الوداع کے نام سے کیوں موسوم کیا گیا؟ اہ اور نووی لکھتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: شاید کہ میں اس حج کے بعد اور حج نہ کر سکوں۔ اس میں ان کو وداع کہنے کی طرف اشارہ تھا۔ اور انہیں وصال نبوی کے قریب کی اطلاع دینا تھا۔ اور اس امر پر براہِ نگینہ کرنا تھا کہ آپ سے اخذ استفتاء کا بہت ہی اہتمام کریں، آپ کی ملازمت اور آپ سے دین کے امور کے سیکھنے کی فرصت کو قیمت جائیں، اسی بنا پر اس کو حجۃ الوداع کا نام دیا گیا، واللہ اعلم۔

وسئل هناك عن اشياء بالتقديم والتاخير فقال افعل ولا حرج

ترجمہ: اور اس موقع پر آپ سے چند چیزوں کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ آپ نے فرمایا:

”کوئی حرج نہیں، اب کر لو“

اور اس موقع پر آپ سے چند چیزوں کی تقدیم و تاخیر

ارشاد نبوی: کوئی حرج نہیں اب کر لو | کے بارے میں دریافت کیا گیا، آپ نے فرمایا: کوئی حرج

نہیں۔ اب کر لو! شیخ ابن قیم فرماتے ہیں کہ اس موقع پر آپ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے رمی سے پہلے حلق کر لیا۔ اور یہ بھی دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے رمی سے پہلے ذبح کا عمل کر لیا، آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے نہیں دیکھا کہ آپ سے اس دن کسی چیز کے بارے میں دریافت کیا گیا ہو اور آپ نے یہ نہ فرمایا ہو کہ کوئی حرج نہیں، اب کر لو۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ ذبح، حلق اور رمی کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں آپ سے عرض کیا گیا۔ آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں۔ یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ اور اُسامہ بن شریک کہتے ہیں: ایک شخص عرض کرتا کہ یا رسول اللہ! میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی، یا میں نے فلاں چیز کو مؤخر کر دیا اور فلاں چیز کو پہلے کر لیا۔ مگر آپ ہر ایک کو یہی فرماتے کہ کوئی حرج نہیں، کوئی حرج نہیں، البتہ حرج اس شخص پر ہے جس نے کسی مسلمان آدمی کی عزت، بطور ظلم، پامال کی۔ پس یہ ایسا شخص ہے جو حرج میں واقع ہوا اور ہلاک ہوا، اور یہ لفظ اکرمین نے طواف سے پہلے سعی کر لی اس حدیث میں محفوظ نہیں۔ محفوظ یہ ہے کہ رمی، انحراد حلق کی تقدیم و تاخیر کا سوال کیا گیا تھا۔ انتہی۔ اور اسے بن شریک کی اس روایت کو ابو داؤد، طحاوی، اور دارقطنی نے روایت کیا ہے، جیسا کہ نووی نے شرح ہندب میں لکھا ہے، اور دارقطنی کہتے ہیں کہ: میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی، یا کا فقرہ صرف جریر نے شبانی سے روایت کیا ہے۔

رقن، اور یہاں چند بحثیں ہیں:-

اول:- یہ سوال و جواب کس وقت ہوا، بعض روایات سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال و جواب بوقت چاشت خطبہ کے دوران

یوم النحر کے چار افعال کی تقدیم

و تاخیر سے متعلقہ مباحث

ہوئے۔ اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ شام کے وقت خطبہ کے دوران ہوئے۔ کیونکہ ایک سوال یہ ہوا تھا کہ

میں نے شام ہو جانے کے بعد رمی کی: اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سوال وجواب دورانِ خطبہ نہیں ہوئے۔ بلکہ اس وقت ہوئے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم اور فتویٰ کے لئے تشریف فرما تھے، چنانچہ مؤطا کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں لوگوں کی خاطر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور لوگ آپ سے سوالات کر رہے تھے: ”اے اللہ اور مسلم شریف میں بھی یہ روایت اسی سند سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ اس سے زیادہ واضح ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی خاطر ٹھہرے، دیکھا لیکہ لوگ آپ سے سوال کر رہے تھے: اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک باب کا عنوان یوں قائم کیا ہے ”باب الفقیاء علی الدائرۃ عند الجمرۃ“ اور اس کے ذیل میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ یوم النحر میں خطبہ دے رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے اس حدیث کو خطبہ پر نہیں بلکہ مسائل بتانے پر محمول کیا ہے چنانچہ اتنی کہتے ہیں بخاری کا ترجمہ الباب دلالت کرتا ہے کہ یہ خطبہ نہیں تھا: اھ تفصیل اوجز میں ہے۔

روایات میں معروف یہ ہے کہ سوال ان چار چیزوں کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں **بحث دوم** | تھا جو اس دن کی جاتی ہیں یعنی رمی، ذبح، حلق، اور افاضہ طواف کے لئے مکہ جانا، اگر یہی چار کام اس دن کئے جاتے ہیں۔ اور جن میں بسط کے ساتھ ان روایات کو ذکر کیا، جو ان چاروں کے بارے میں مروی ہیں۔ اور اسامہ بن شریک کی روایت میں طواف سے پہلے سعی کرنے کا ذکر بھی ہے۔ اور شیخ ابن تیمیہ کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ یہ محفوظ نہیں۔ اور اور جن میں ہے کہ حافظ کہتے ہیں: ”جو شخص طواف سے پہلے سعی کرے اس کے بارے میں دو قول ہیں، بعض اہل حدیث اسامہ بن شریک کی روایت کی بنا پر اس کے قائل ہیں کہ یہ صحیح ہے (اعادہ کی ضرورت نہیں) اور جمہور کہتے ہیں کہ یہ کفایت نہیں کرے گی۔ وہ حدیث اسامہ کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ یہ طواف قدم کے بعد اور طواف افاضہ سے پہلے سعی کرنے پر محمول ہے اور ابن حزم کا مذہب یہ ہے کہ سعی کی تقدیم جائز ہے۔ اور ابن حزم نے ان لوگوں پر رد کیا ہے جو طواف و سعی کی تقدیم و تاخیر کے درمیان اور باقی اشتباہ کی تقدیم و تاخیر کے درمیان فرق کے قائل ہیں: اھ

اور نووی شرح منہب میں لکھتے ہیں: ”اگر کسی نے طواف سے پہلے سعی کر لی تو ہمارے نزدیک اس کی سعی صحیح نہیں، یہی جمہور علماء کا قول ہے۔ اور ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ماوردی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، اور یہی امام مالک، امام ابو حنیفہ، اور امام احمد کا مذہب ہے۔ ہمارے دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے طواف کے بعد سعی کی اور فرمایا کہ مجھ سے مناسک سیکھ لو۔ رہی اسامہؓ کی حدیث! تو خطابی وغیرہ کی توجہ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے طوافِ قدوم کے بعد اور طوافِ افاضہ سے پہلے سعی کی: اھ۔

بحث سوم | فرماتے ہیں کہ مجموعہ روایات سے چند صورتیں نکلتی ہیں جو ضرب و تقسیم کے بعد چوبیس تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض تو مذکور ہیں اور بعض کو راویوں نے ذکر نہیں کیا۔ یا تو اختصار کی بنا پر یا اس وجہ سے کہ پیش نہیں آئی تھیں۔ اور جن میں ان چوبیس صورتوں کا نقشہ بصورت جدول دیا گیا ہے، تاکہ ان کا سمجھنا آسان ہو۔ جی چاہے تو دہاں دیکھ لو۔

جاننا چاہیے کہ یومِ نحر میں علی الترتیب چار عمل کئے جاتے ہیں، رشی، ذبح، حلق، طوافِ افاضہ۔ یہ ترتیب

بحث چہارم: ان افعال میں ائمہ کا اختلاف | علماء کے نزدیک سنون ہے، کیونکہ بہت سی روایات میں آتا ہے کہ آپؐ نے یہ عمل اسی ترتیب سے ادا کئے۔ امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک ان اشیاء میں ترتیب سنت ہے واجب نہیں: اس لئے اگر ان میں سے کسی چیز کو آگے پیچھے کر دیا تو ان کے نزدیک دم واجب نہیں۔ ان کا استدلال ان روایات سے ہے۔ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے: "افعل ولا حرج" یعنی کوئی مضائقہ نہیں، اب کر لو، مگر امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک بعض چیزوں میں ترتیب واجب ہے اور بعض میں سنت۔ پس جس نے ترتیب واجب کے خلاف کیا اس کے ذمہ دم لازم ہے۔ اور جس نے ترتیب سنون کے خلاف کیا اس کے ذمہ دم تو نہیں مگر اس نے بڑا کیا۔ چنانچہ امام مالکؒ کے نزدیک رمی کے درمیان اور باقی تین چیزوں کے درمیان ترتیب واجب ہے پس اگر ان تین چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی رمی سے مقدم کر دیا تو دم واجب ہو گا۔ اور باقی تین چیزوں میں ترتیب سنت ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک صرف مفرد بالجمع کے لئے طواف اور ذبح کے درمیان ترتیب سنت ہے۔ ان کے علاوہ باقی تمام چیزوں میں ترتیب واجب ہے۔ خواہ مفرد ہو یا غیر مفرد پس جو شخص ترتیب واجب کے خلاف کرے اس کے ذمہ دم لازم ہو گا۔ یہ اس تفصیل کا خلاصہ ہے جو اجزہ میں مذاہب اربعہ کی کتابوں سے نقل کی گئی ہے۔ اور اجزہ میں کتب فروع وغیرہ سے نقل مذاہب ائمہ کے دلائل اور ان کے جواب میں خوب بسط سے کلام کیا ہے ترتیب

اور دم کے واجب ہونے پر حنفیہ اور ان کے موافقین کا استدلال متعدد وجوہ سے ہے۔ ایک یہ کہ معروف قاعدہ ہے کہ راوی حدیث کا فتویٰ جب اس کی روایت کے خلاف ہو تو اس کے فتویٰ پر عمل ہوگا۔ اور حدیث الباب کے راوی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وجوب دم کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اور حافظ نے جو اس کا جواب دیا ہے عینی نے اس پر رد کیا ہے جسکی تفصیل اوچیز میں ہے۔ دوم یہ کہ امام مالک موطا میں فرماتے ہیں: وہ امر جن میں ہمارے یہاں اختلاف نہیں یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے سر کا حلق نہ کرے، نہ اپنے جسم کے بال کاٹے یہاں تک کہ نخر کرے رانگے چل کر فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْلِقُوا دُفْسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيَ مَحَلَّهُ۔

سوم: یہ کہ ابن رشد کہتے ہیں کہ امام مالک کا اعتماد اس بات پر ہے کہ جس شخص نے کسی ضرورت کی بنا پر قبل از وقت حلق کیا اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ کا حکم فرمایا، اب جو شخص بلا ضرورت ایسا کرے اس پر کوئی چیز کیوں واجب نہ ہوگی شیخ ابن ہمام نے اس پر جو جرح کی ہے اس کا جواب اوچیز میں دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور متعدد دلائل جن سے وجوب دم ثابت ہوتا ہے، اوچیز میں مفصل مذکور ہیں۔ نیز وہ احادیث جن میں یہ آتا ہے کہ اَفْعَلْ وَلَا حَرَجَ، کوئی مضائقہ نہیں اب کر لو، ان کے بارہ جواب تفصیل سے ذکر کئے ہیں۔ ان میں سب سے واضح جواب یہ ہے کہ ولا حرج میں گناہ کی نفی کی گئی ہے۔ دم دے کہ وجوب یا عدم وجوب ہے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اوچیز میں ہے: یہاں صرف گناہ کی نفی مراد ہے کسی اور چیز کی نہیں۔ اس کی ایک دلیل ابو داؤد کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کوئی حرج نہیں مگر اس شخص پر جس نے کسی مسلمان کی عزت کو بطور ظلم پامال کیا، پس یہی ایسا شخص ہے جو حرج میں واقع ہوا اور ہلاک ہوا، یہ حدیث باؤاز بلند پکار کرتی ہے کہ یہاں صرف گناہ کی نفی مقصود ہے۔ کیونکہ سلف و خلف میں سے کوئی شخص اس کا قائل نہیں کہ کسی مسلمان کی عزت پامال کرنے پر دم لازم آتا ہے۔ شیخ کوکب میں ارشاد نبوی: (دم ولا حرج،) اب رمی کر لو، اور کوئی مضائقہ نہیں) کے ذیل میں فرماتے ہیں: اس سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے جو ان امور ثلاثہ میں عدم ترتیب کے قائل ہیں، کیونکہ لا نفی جنس کے لئے ہے جس سے تمام اقسام حرج کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور امام صاحب فرماتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر ایسی چیزوں کو حرج شمار نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ صحابہ کرام نے

وَنَزَّلِ النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ

توجہ: اور آپ نے لوگوں کو ان کی قیام گاہوں میں اتارا کہ ہر قبیلے کیلئے جائے قیام تجویز فرمائی۔ جب خطبہ سنا اور انہیں احکام کا علم ہوا تب انہیں احساس ہوا کہ وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے خلاف عمل کر چکے ہیں۔ اور یہ خیال ان کے لئے بے چینی کا باعث ہوا کہ اندریں صورت تمہیں اپنے حج سے بجز بارگناہ کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ اور قضا کے واجب ہونے میں انہوں نے حرج محسوس کیا۔ اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد سے دفع کیا، کہ جس چیز کا تمہیں اندیشہ ہے کہ ان غلطیوں کی وجہ سے قضا لازم ہوگی، اس سے کوئی حرج لاحق نہیں ہوا یعنی نہ تم گناہ گار ہوئے۔ نہ ان افعال کی قضا لازم ہے۔ رمل و وجوب دم کا مسئلہ؛ تو وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ لہذا اس پر عمل ہوگا۔

اور ابن عباسؓ کی یہ حدیث اوجہ میں طحاوی اور ابن ابی شیبہ کے حوالے سے متعدد طرق کے ساتھ مذکور ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان ائمہ عظام پر تعجب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد نہ افعلا ولا حرج، نہ کوئی مضائقہ نہیں۔ اب کر لوں سے استدلال کرتے ہوئے ان افعال اربعہ میں تو وجوہ ترتیب کے قائل نہیں۔ لیکن رمی جرات میں ترتیب کو واجب کہتے ہیں حالانکہ جمرہ اولیٰ سے پہلے جمرہ وسطیٰ کی رمی کرنا بھی تقدیم و تاخیر میں داخل ہے۔ مگر یہاں وہ افعلا ولا حرج کو نہیں لیتے۔

اور آپ نے لوگوں کو ان کی قیام گاہوں میں

مہاجرین و انصار کیلئے منازل کی تعیین | اتارا کہ ہر قبیلے کے لئے جائے قیام تجویز فرمائی۔

یہ حدیث ابوداؤد میں ان الفاظ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں لوگوں کو خطبہ دیا اور انہیں ان کی قیام گاہوں میں اتارا، چنانچہ قبلہ کی داہنی طرف اشارہ کر کے فرمایا: مہاجرین یہاں اتریں اور قبلہ کی بائیں جانب اشارہ کر کے فرمایا اور انصار یہاں فروکش ہوں۔ اور دوسرے لوگ ان کے ارد گرد قیام کریں۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں ہمیں خطبہ دیا۔ پس ہمارے کان کھل گئے۔ یہاں تک کہ جو بھی ارشاد فرماتے ہمیں اپنی اپنی جگہ سنائی دے رہا تھا۔ پھر آپ لوگوں کو حج کے مسائل سکھانے لگے، یہاں تک کہ رمی جرات کے بیان تک پہنچ گئے، پھر آپ نے اپنی دونوں انگشتیں شہادت (دکانوں میں) رکھ کر بلند آواز سے فرمایا

اتنی کٹکری ہو جو انگلی پر رکھ کر پھینکی جاتی ہے، پھر مہاجرین کو حکم دیا تو وہ مسجد کی اگلی جانب اترے اور انصار کو حکم فرمایا تو وہ مسجد کی پچھلی جانب فروکش ہوئے۔ اس کے بعد پھر دوسرے لوگ اُترے۔ شیخ قدس سرہ پہلی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: ”ان کا تارا، یعنی ان کیلئے متعین کیا۔“ قبلہ کی دائیں جانب یعنی جب تم قبلہ کی جانب نہ کر کے کھڑے ہو تو جو جانب تمہارے دائیں ہاتھ واقع ہوگی وہ قبلہ کی دائیں جانب ہے۔ اور جو تمہارے بائیں ہاتھ واقع ہوگی وہ قبلہ کی بائیں جانب ہوگی اور اگلی حدیث میں آئے گا کہ مہاجرین کو حکم فرمایا تو وہ مسجد کی اگلی جانب اترے اور انصار کو حکم فرمایا تو وہ مسجد کی پچھلی جانب اترے (اس کے بعد پھر دوسرے لوگ اترے) ان دونوں کے درمیان تطبیق یہ ہوگی کہ مہاجرین یمن قبلہ کی جانب مسجد کے اگلے حصہ میں اترے اور انصار قبلہ کی بائیں جانب مسجد کے پچھلے حصہ میں: ”پھر اور لوگ“ یعنی مہاجرین و انصار کے علاوہ جو اور لوگ ہیں وہ ان کے گرد اترے۔ آپ نے ان کی فرود گاہیں اس لئے معین کیں تاکہ ان کے مختلف قبائل کا اختلاط نہ ہو، اور تاکہ ایک دوسرے کے قریب رہیں۔ اور انہیں اپنی ضروریات میں تنگی پیش نہ آئے۔“ اھ

پھر یہاں یہ امر بھی پیش نظر ہے کہ اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ ان کے منازل کی تعیین خطبہ کے بعد ہوئی، یا خطبہ سے پہلے؛ اور اس اختلاف کا حل اس کے ناممکن نہیں جو پہلے بھی کئی بار گزر چکا ہے کہ آپ کا خطبہ ان ایام میں کئی بار ہوا۔ اور بار بار تعلیم فرمائی اس لئے یہ کہا جائے گا کہ منازل کی تعیین ایک خطبہ کے بعد اور دوسرے خطبہ سے پہلے ہوئی۔ یہاں اس پر بھی تنبیہ ضروری ہے کہ امام بخاری نے عمرہ تنعیم کے باب میں یہ حدیث ذکر کی ہے کہ مراقب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جمرہ عقبہ کے پاس ملے، جب کہ آپ اس کی رمی کر رہے تھے، تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ آپ ہی لوگوں کے لئے خاص ہے، فرمایا ”نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے“ اھ۔ مگر آپ کی سعی کے ذکر میں

گزر چکا ہے کہ یہی سوال انہوں نے مروہ

کے پاس کیا تھا۔ تفصیل دہاں

گزر چکی ہے۔

تھا انصرف الی المنحر۔ فنحرت ثلاثا وستین

توجہ :- پھر منحر و قربان گاہ کی طرف گئے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترسیحہ اونٹ منحر ذبح کئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربان گاہ گئے۔ یہ منی میں ایک معروف جگہ ہے یوں منی کی ساری

زمین قربانی کی جگہ ہے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ ابن التین کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کی جگہ جمرہ اولیٰ کے قریب ہے جو مسجد کے متصل ہے۔ یہ توزرقانی میں ہے۔ اور ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ جمرہ عقبہ کے قریب تھی، اور یہ جو جمرہ وسطیٰ کے قریب مسجد کی صورت میں مشہور ہے۔ اور جسے عوام مسجد منحر کہتے ہیں اس کی کچھ اصل نہیں بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کی جگہ آپ کی تیام گاہ ہی میں تھی، مسجد خیف کے قریب اور قبلہ مسجد خیف سے آگے۔

پس آپ نے عمر مبارک کے سالوں کی تعداد کے

آنحضرتؐ نے کتنے اونٹ خود ذبح کئے | مطابق اپنے دست مبارک سے ترسیحہ اونٹ منحر

ذبح کئے۔ کذافی الہدی۔ اور توزرقانی کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ترسیحہ اونٹ ذبح کر کے اپنی عمر مبارک کے کل سالوں کی تعداد کا قصہ کیا۔ چنانچہ عمر مبارک بھی ۶۳ سال تھی، پس ہر سال کے مقابلہ میں ایک اونٹ ہوا۔ یہ بات قاضی عیاض نے نقل کی۔ بعد ازاں توزرقانی کہتے ہیں: ظاہر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف وہی اونٹ ذبح کئے جو آپ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے۔ اور ان کی تعداد ۶۳ تھی۔ جیسا کہ ترمذی نے روایت کیا ہے: اور سویتیں سے باقی ماندہ کے ذبح کا کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا: اور مرقات میں قاضی عیاض سے نقل کیا ہے کہ: بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف وہی اونٹ ذبح کئے جو آپ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے۔ اور سویتیں سے باقی ماندہ جو حضرت علیؓ کے ساتھ منی سے آئے تھے وہ حضرت علیؓ کو عطا کر دیئے: اور لامع کے حاشیہ میں ہے کہ اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے کتنے اونٹ ذبح کئے۔ چنانچہ بخاری کی اس حدیث سے، جو حضرت انسؓ سے مروی ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے سا اونٹ ذبح کئے، اور علماء کے یہاں معروف اور راجح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر مبارک کے سالوں

کی تعداد کے مطابق ۶۲ اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح کئے تھے بیشخ ابن قیمؒ الہدی میں کہتے ہیں کہ آپ نے ۶۲ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کئے۔ اور بقیہ کے ذبح کرنے کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا تھا۔ پس اگر کہا جائے کہ تم اس حدیث کا کیا کر دو گے جو صحیحین میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے ساٹھ اونٹ ذبح کئے۔ اس کے جواب میں ابن حزمؒ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ کی حدیث کی تین توجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعی سات سے زیادہ اونٹ بدست خود ذبح نہ کئے ہوں جیسا کہ حضرت انسؓ کا بیان ہے، البتہ ایسا ہوا کہ سات کے بعد ۲۳ تک تو آپؐ نے اپنے سامنے ذبح کر لئے، اور پھر وہاں سے تشریف لے گئے اور باقی ماندہ کے ذبح کرنے کا حکم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا۔ دوم یہ کہ حضرت انسؓ نے صرف سات ہی کو ذبح ہوتے دیکھا ہو، اور حضرت جابرؓ نے ۶۲ کو اور ہر شخص نے اپنے اپنے مشاہدہ کو بیان فرمایا۔ سوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات اونٹ تو بلا شرکت غیر ذبح کئے، انہی کو حضرت انسؓ نے بیان کیا، اس کے بعد حضرت علیؓ نے آچے ساتھ نیزہ پکڑا، اور دونوں نے مل کر ۲۳ تک ذبح کئے، چنانچہ عروہ بن حارث کنندیؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ نے نیزہ اوپر کی جانب سے پکڑا اور حضرت علیؓ کو نیچے کی طرف سے پکڑنے کا حکم فرمایا، پھر دونوں نے مل کر اونٹ ذبح کئے۔ اور ۶۲ کے بعد سو تک حضرت علیؓ نے تنہا ذبح کئے، جیسا کہ حضرت جابرؓ کا بیان ہے اگر کہا جائے کہ تم اس حدیث کا کیا کر دو گے جو امام احمدؒ اور ابوداؤد نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس اونٹ ذبح کر لئے تو مجھے حکم فرمایا، باقی میں نے ذبح کئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے، دراصل حضرت علیؓ کے ربع کردہ اونٹوں کی تعداد کو راوی نے غلطی سے الٹ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا۔ اگر کہا جائے کہ تم عبداللہ بن قرط کی حدیث کا کیا کر دو گے جس میں یوں آتا ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پانچ اونٹ لائے گئے، پس وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آگے بڑھنے لگے کہ آپؐ کس سے ابتداء فرماتے ہیں؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم اسے قبول کر کے اس کی تصدیق کرتے ہیں دراصل سوا اونٹ کی بادگی ہی آپؐ کے پاس نہیں لائے گئے تھے، بلکہ گروہ درگروہ لائے جاتے تھے، ان میں سے ایک گروہ پانچ نفری تھا۔ اور یہی گروہ تھا جن میں سے ہر ایک آگے بڑھ کر یہ چاہتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اس سے لسم اللہ کریں۔ ابن قیمؒ کی تقریر مختصر ختم ہوئی۔

اور ہمارے شیخ قدس سرہ نے حضرت علیؑ اور حضرت جابرؓ کی حدیث میں متعدد وجوہ تطبیق دی ہے۔ ان میں سے ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کسی کی اعانت کے بغیر ذبح کئے اور ۳۳ حضرت علیؑ کی شرکت کے ساتھ۔ اور باقی ماندہ حضرت علیؑ نے ذبح کئے، میں کہتا ہوں یہ جواب میرے نزدیک سب سے عمدہ ہے، کہ اس میں حضرت علیؑ کی روایت کو غلط کہنے اور راوی پر لفظ کے الٹ جانے کا دعویٰ کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔ اور حضرت انسؓ کی حدیث میں سات کی تخصیص کی سب سے عمدہ توجیہ یہ ہے کہ یہ سات وہی ہیں جن کا ذکر عبداللہ بن قرطؓ کی حدیث میں جو بحوالہ احمد و ابوداؤد و ابوداؤد پر گندمی یوں آیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ آپؐ کس سے ابتداء کرتے ہیں؟ اور ان کی خصوصیت کی بنا پر انہیں الگ ذکر کیا، اور عبداللہ بن قرطؓ کی اس حدیث میں امام احمدؒ اور ابوداؤد نے پانچ یا چھ کا لفظ شک راوی کے ساتھ ذکر کیا ہے، پس بعید نہیں کہ وہ سات ہوں۔ اور مغنی میں موفق کے کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ عبداللہ بن قرطؓ کی حدیث میں ذکر شدہ پانچ اونٹوں کو حضرت جابرؓ کی حدیث کے سوا اونٹوں کے علاوہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس بحث میں کہ قربانی کا گوشت کھانا مستحب ہے، لکھتے ہیں: "اصحاب رائے کہتے ہیں کہ صدق جتنا زیادہ ہو بہتر ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے سوا اونٹ ذبح کئے اور ہر اونٹ سے گوشت کا ٹکڑا لینے کا حکم فرمایا، اور پھر ان سب کا شوربا نوش فرمایا۔ اور آپؐ نے پانچ اونٹ ذبح کئے اور فرمایا جو چاہے ان کا گوشت کاٹ کر لے جائے، آگے چل کر لکھتے ہیں: "اور آپؐ نے ان میں سے کچھ نہیں کھایا۔" احمد موفق کے ان دونوں عبارتوں سے ظاہر ہے کہ وہ پانچ اونٹوں والی حدیث کو قصہ حجۃ الوداع کے علاوہ کسی اور موقع پر محمول کرتے ہیں، "حاشیہ لامع کا مضمون ختم ہوا۔"

اور اس ناکارہ کے نزدیک جیسا کہ ابھی گذرا ان پانچ یا سات سات اونٹوں کی تخصیص کی وجہ | علی اختلاف روایات کی تخصیص کی سب سے عمدہ توجیہ وہی ہے جس کی طرف ابوداؤد کی روایت میں یوں اشارہ کیا گیا ہے: "ان میں سے ہر ایک آگے بڑھنا تھا کہ آپؐ سب سے پہلے کس سے ابتداء فرماتے ہیں؟ اردو شاعر نے خوب کہا ہے۔

داغ جاتے تو ہیں قتل میں بڑا دل سب سے

دیکھئے دار کرے وہ ستم آرا کس پر؟

اور فارسی شاعر نے اسی مضمون کو یوں باندھا ہے: ۵

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف | امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد (میر خسرو)

نیز: —

نشود نصیبِ شمن کہ شود بلاکِ تیغ
سہر دستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی (عراقی)
وق ۲ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا کہ
قربانی کی جھول اور کھال کے قصہ کا حکم | انکی جھول چمڑے اور گوشت مساکین پر صدقہ کر دیں،
اور یہ بھی فرمایا کہ قصاب کو اجرت میں قربانی کی کوئی چیز نہ دیں، اور فرمایا کہ اجرت ہم اپنے پاس سے دیں
گئے، اور فرمایا کہ جس کا جی چاہے گوشت کاٹ کر لے جائے، آہ

اور لایع کے حاشیہ میں ہے کہ لغوی کہتے ہیں، جب قصاب کو
قصاب کو اس میں اجرت نہ دی جائے | اجرت پوری دے دی جائے اور پھر اگر وہ فقیر ہو تو اس پر صدقہ
کر دیا جائے، تو کوئی حرج نہیں۔ اور لغوی کے علاوہ دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ قصاب کو اس کی اجرت
میں گوشت دینا ممنوع ہے، کہ یہ معاوضہ ہے۔ اور بطور صدقہ یا ہدیہ کے دینا اندوئے قیاس جائز ہے،
لیکن شارع کے مطلقاً منع کرنے سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس کو صدقہ کے طور پر دینا بھی ممنوع ہے کیونکہ
اس کی وجہ سے اجرت میں رعایت کرنے کا احتمال ہے، بالآخر یہ بھی معاوضہ ہی کی صورت ہو جائے گی۔
اور صرف حسن بصریؒ اور عبد اللہ بن علیؒ نے اس کی رخصت دی ہے۔

بخش، اور مشکوٰۃ میں سلم وغیرہ کی جو طویل حدیث حضرت جابرؓ
انحضرت نے شور بانوش فرمایا | سے مروی ہے اس میں ہے، حضرت علیؓ کو حکم فرمایا انہوں نے باقی
ماندہ اونٹ ذبح کئے، پھر حکم فرمایا کہ ہر قربانی کا ایک ایک ٹکڑا لیا جائے۔ چنانچہ ان کو ہنڈیا میں پکایا
گیا۔ پس دونوں حضرات نے ان کا گوشت کھایا اور شور بانوش کیا۔

ہدی کے کن کن جانوروں کا گوشت کھانا جائز ہے | فوٹی کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا کہ نفل کی ہدی اور
قربانی سے کھانا مستحب ہے، اور سو قربانیوں کو الگ الگ پکانے میں زحمت تھی، اس لئے سب کو
ایک ہی ہنڈیا میں ڈال دیا گیا۔ تاکہ آپ اس مجموعہ کے شور بے کو جس میں ہر ایک کا جزیہ ہے، نوش فرما سکیں،
اور شور بے میں جو گوشت ہے اسے بقدر ضرورت تناول فرما سکیں۔ اور علماء کا اتفاق ہے کہ نفل ہدی اور
قربانی سے کھانا سنت ہے واجب نہیں۔ آہ۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے موفق نے المعنی میں اور صاحب بدایہ نے استدلال کیا ہے کہ متع او قیاب

کی ہدی سے کھانا مستحب ہے۔ یہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے جس کی تفصیل اوجز میں ان کی کتب فروع سے نقل کی گئی ہے، اور اس کا خلاصہ حاشیہ لایع میں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "جن ہدایا کا گوشت کھایا جاسکتا ہے ان کے بیان میں ناظین مذاہب کا اختلاف ہے جس کی تفصیل اوجز میں ذکر کی گئی ہے۔ اور اس میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ گزشتہ عبارتوں سے واضح ہوا کہ حنا بلکہ کے نزدیک دم متع، دم قران اور دم تطوع کے علاوہ کسی کا کھانا جائز نہیں۔ یہی قول خفیہ کلب ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ ہر وہ ہدی جو اپنے محل میں پہنچ چکی ہو اس کا کھانا جائز ہے۔ البتہ تجائے صید قدریہ اذنی، اور نذر مساکین کی ہدی کا کھانا جائز نہیں۔ لیکن شافعیہ کے نزدیک کسی دم واجب کا کھانا جائز نہیں۔ حتیٰ کہ دم متع اور دم قران کا کھانا بھی درست نہیں۔ اور دم تطوع کا کھانا جائز ہے۔ مگر کچھ گوشت کا صدقہ کرنا بھی واجب ہے" اھ

کیا ان سوا اوٹوں میں ابو جہل کا اونٹ بھی تھا؟
کیا حجۃ الوداع میں ابو جہل کا اونٹ نحر کیا گیا جیسا کہ ترمذی شریف کے باب حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم

میں حضرت جابر سے اس کی تصریح منقول ہے۔ اور موطا امام مالک کے الفاظ بروایت عبد اللہ بن ابی بکر بن حزم یہ ہیں کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج یا عمرہ میں ابو جہل کا اونٹ ہدی کیا تھا" اور اوجز میں ہے کہ یہ راوی کا شک ہے، اور ابو داؤد میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے سال من جملہ اور ہدایا کے ابو جہل کا اونٹ بھی ذبح کیا تھا، اس کے ناک میں چاندی کی نکیل تھی اور ترمذی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حج کئے، دو ہجرت سے پہلے، اور ایک ہجرت کے بعد جس کے ساتھ عمرہ بھی تھا، آپ اپنے ساتھ ۶۳ اونٹ لے گئے تھے۔ اور باقی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں سے لائے تھے، ان میں ابو جہل کا اونٹ بھی شامل تھا،" صاحب عارضۃ الایحوی وغیرہ نے اس اختلاف سے سکوت اختیار کیا، اور شیخ کوکب میں فرماتے ہیں: "یہ صحیح نہیں کیونکہ ابو جہل کا اونٹ عمرہ حدیبیہ میں ذبح فرمایا تھا اور اگر یہاں نہیں تو عمرہ قضا میں۔ اور وہ اتنی مدت زندہ نہیں رہا کہ اسے حجۃ الوداع میں ذبح کرنے کی نوبت آتی۔ جس میں آپ نے سوا اونٹ قربان کئے تھے، اھ اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ یہی صحیح ہے کیونکہ عام اہل سیر ابن اسحق، ابن ہشام اور ابن کثیر

قلت، وذبح عن نسائه بقرۃ

توجہ: دش) اور آپ نے ازواج مطہرات کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔

میں نے ”الہدایہ والنہایہ“ میں ابو جہل کے اونٹ کی قربانی کا قصہ عمرہ حدیبیہ میں ذکر کیا ہے، حجۃ الوداع میں نہیں۔ چنانچہ زاد المعاد میں قصہ حدیبیہ کے فوائد کے ضمن میں لکھا ہے: ”من جملہ ان کے اللہ کے دشمنوں کو غیظ دلانے کا استجاب ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمدی کے جانوروں میں ابو جہل کا اونٹ بھی قربان کیا، اوشیح قدس سرہ نے اپنے اس قول میں کہ اگر یہاں نہیں تو عمرہ قضا میں“ اس قصہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو اہل سیر نے ذکر کیا ہے کہ یہ اونٹ بھاگ گیا تھا چنانچہ انہیں میں ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ حدیبیہ میں من جملہ اور ہدایا کے ابو جہل کا اونٹ بھی ہمدی کیا تھا۔ یہ آپ کو غزوہ بدر کی غنیمت میں حاصل ہوا تھا۔ مروی ہے کہ ابو جہل کا یہ اونٹ بھاگ کر مکہ مکرمہ چلا گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کارندے اس کے تعاقب میں گئے، سفہار قریش نے ارادہ کیا کہ اسے واپس نہ کیا جائے، مگر سہیل بن عمروؓ نے جس نے عمارت صلح کا سنگ بنیاد رکھا تھا، انہیں اس سے منع کیا، چنانچہ روہ واپس لایا گیا تو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بخر کیا، پورے تفصیل اور جز میں ہے۔

صاحب خمیس نے لکھا ہے کہ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کے سالوں کی تعداد کے مطابق ۶۳ اونٹ ذبح کئے اور ۶۳ غلام آزاد کئے، اور حیوۃ الجوان میں ہے کہ آپؐ نے حجۃ الوداع میں ۶۳ اونٹ ذبح کئے اور ۶۳ غلام آزاد کئے۔

ازواج مطہرات کی طرف سے گائے

دش) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔ ابو داؤد

کے لفظ بردایت ابو ہریرہؓ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی

ذبح کرنا اور اس میں اشکال

اللہ علیہ وسلم نے ان ازواج مطہرات کی جانب سے جنہوں نے عمرہ کیا تھا، ایک گائے ذبح کی جو ان کے مابین مشترک تھی، اس پر شہور اشکال ہے کہ ازواج مطہرات تو نو تھیں، ایک گائے ان سب کی طرف سے کیسے کافی ہوگئی؟ اور جز میں اس اشکال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں۔ اور اس کا خلاصہ لامع کے حاشیہ میں ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں: ”اور میرے نزدیک سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کی جانب سے الگ گائے ذبح کی تھی جیسا کہ مسلم میں حضرت جابرؓ کی روایت سے مفہوم ہوتا ہے اور بقیہ ازدواج کی جانب سے ایک گائے تھی، جو ابو داؤد کی روایت میں مذکور ہے حضرت عائشہؓ ان میں داخل نہیں تھیں۔ کیونکہ ابو داؤد کے الفاظ: "ان ازدواج کی طرف سے جنہوں نے عمرہ کیا تھا" اس سے مانع ہیں کیونکہ حضرت عائشہؓ ہمہا کے نزدیک مفرد بالچ تھیں۔ البتہ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو خارج کر کے بھی تو ازدواجِ مطہرات کی تعداد آٹھ ہوتی ہے، میرے نزدیک بعید نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سوڈہؓ کو حضرت عائشہؓ کی گائے میں شریک کر دیا ہو۔ کیونکہ انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے رکھی تھی۔ اس توجیہ کے مطابق حضرت عائشہؓ کی حدیث پر شذوذ کا حکم کرنے کی حاجت نہیں رہتی، جیسا کہ حافظؒ نے کہا ہے اور ابن حزمؒ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ دیگر ازدواجِ مطہرات کے ساتھ شریک نہیں تھیں۔ کیونکہ دیگر ازدواج کا منع تھا۔ اور حضرت عائشہؓ کا قرآن۔ اور قرآن والے پر ابن حزمؒ کے نزدیک ہدی لازم نہیں۔

ابن قیمؒ اس پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ مسلک فاسد ہے جس میں ابن حزمؒ تمام لوگوں سے متفرد ہیں، کیونکہ صحابہؓ، تابعینؓ اور ائمہ کے تمام حضرات اس پر متفق ہیں کہ قادن پر ہدی لازم ہے، جس طرح کہ متمتع پر لازم ہے" میں کہتا ہوں حضرت عائشہؓ کا قادن ہونا ان کے مسلک پر مبنی ہے ورنہ ہمارے نزدیک مفرد بالچ تھیں۔ یہ بحث احرامِ عائشہؓ کے بیان میں پہلے گذر چکی ہے، بعد ازاں ابن قیمؒ نے طویل کلام میں اصل انکال کا جواب دیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ روایات جن میں سات کی شرکت کا ذکر ہے تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور صحت میں بھی ناقتی ہیں۔ اور زرقانی نے شرح مواہب میں ان روایات پر خوب بسط سے لکھا ہے، اور نسائی کی اس روایت کو جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، ترجیح دی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے حج کے سال ہماری جانب سے ایک ایک گائے ذبح کی تھی" اور حافظؒ نے جو اس حدیث پر شذوذ کا حکم کیا ہے اس پر زرقانی نے تعقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "حدیث عائشہؓ کا راوی عمار الدہنیؓ مسلم اور سنن اربعہ کا راوی ہے اس کی زیادتی مقبول ہوگی کہ جو لفظ دوسرے نے یاد نہیں رکھا وہ اس نے یاد رکھا۔ اور اس راوی کی زیادتی دوسرے راویوں کے خلاف بھی نہیں کیونکہ معمر کی روایت میں جو الفاظ ہیں کہ آپ نے صرف گائے ذبح کی"

اس سے مراد جنس ہے، مطلب یہ کہ اونٹ اور بکری کی قربانی نہیں کی بلکہ صرف گائے کی قربانی کی تھی۔ اسلئے یہ اس صریح روایت کے خلاف نہیں۔ جس میں ہر ایک کی جانب سے گائے ذبح کرنے کا ذکر آتا ہے۔ اور خذوذ کا حکم توجب کیا جاسکتا ہے جب کہ دو روایتوں میں تطبیق ممکن نہ ہو، اور یہاں ممکن ہے الخ حاصل یہ کہ قربانی کا رجحان اس طرف ہے کہ تمام ازواج کی جانب سے ایک ایک گائے ذبح کی انتہی مختصر۔

اس حدیث میں چند تجزیں ہیں۔ جن کی تفصیل اور جز میں
نحر کی جگہ ذبح اور ذبح کی جگہ نحر | ہے۔ ایک یہ کہ روایات میں ذبح اور نحر دونوں الفاظ آتے

ہیں۔ اس امر میں علماء کا اختلاف ہے کہ قابل ذبح جانور کا نحر، اور قابل نحر جانوروں کا ذبح جائز ہے یا نہیں؟ موفق کہتے ہیں: اہل علم کے درمیان اس امر میں تو اختلاف نہیں کہ اونٹ کا نحر مستحب ہے اور اس کے علاوہ دوسرے مویشیوں کا ذبح۔ رہا اونٹ کا ذبح اور دیگر مویشیوں کا نحر؛ تو جمہور علماء کے نزدیک جائز ہے۔ اور داؤد ظاہری سے منقول ہے کہ اونٹ نحر کے بغیر اور دیگر جانور ذبح کے بغیر حلال نہیں ہوں گے۔ انتہی مختصراً۔ امام مالک کا صحیح مذہب یہ ہے کہ اونٹ کا نحر واجب ہے، جیسا کہ اہل حجاز میں درویر اور دوسوئی کا قول مفصل مذکور ہے۔

ایک بحث یہ ہے کہ ہدایا میں اشتراک جائز ہے یا نہیں؟ جمہور
ہدی میں اشتراک: بحث دوم | کے نزدیک جائز ہے اور مالک کے نزدیک جائز نہیں۔ چنانچہ مؤطا میں ہے کہ امام مالک فرماتے ہیں کہ انہوں نے بعض اہل علم سے سنا ہے کہ ایک بدنہ داؤد یا گائے میں مرد اور عورت دونوں شریک نہ ہوں۔ بلکہ ہر ایک کو الگ بدنہ کی ہدی کرنی چاہیے، اور درویر کہتے ہیں: ہدی خواہ واجب ہو یا تطوع، اس میں اشتراک صحیح نہیں۔ نہ ذات میں نہ اجر میں، اگر وہ افراد نے اشتراک کیا تو دونوں کی ہدی جائز نہیں ہوئی، اھ دسوتی کہتے ہیں: پس ہدی کا معاملہ قربانی سے مختلف ہے کہ قربانی کے اجر میں اشتراک صحیح ہے الخ۔ پورے تفصیل اس میں دیکھی جائے۔

روایات میں دونوں الفاظ وارد ہیں، جن کی
بحث سوم: یہ گائے ہدی کی تھی یا قربانی کی | تفصیل اور جز میں ہے، حافظ فرماتے ہیں: بظاہر

یہ راویوں کا تصرف ہے، کیونکہ ابو ہریرہ کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ گائے ان ازواج کی جانب سے ذبح کی گئی جنہوں نے عمرہ کیا تھا۔ اس سے ان لوگوں کی روایت قوی ہو جاتی ہے، جنہوں نے ہدی کا لفظ

روایت کیا ہے۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ یہ ہدی تمتع کی تھی۔ اور اس میں امام مالکؒ کے اس قول کے خلاف کوئی دلیل نہیں کہ ”اہل منیٰ کے ذمہ قربانیاں نہیں“ ان کے علاوہ اور بھی بحثیں ہیں جنکی تفصیل اب جو نہیں ہے یہ امر بھی مختلف فیہ ہے کہ آنحضرت

حجۃ الوداع میں اپنے بکری بھی ذبح کی یا نہیں؟ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر بکریاں

بھی ذبح کی تھیں یا نہیں؛ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کی حدیث سے جو آگے آتی ہے، بظاہر ثبات معلوم ہوتا ہے شیخ ابن قیمؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایا پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”اگر کہا جائے کہ تم اس حدیث کا کیا کرو گے جو صحیحین میں حضرت ابو بکرؓ سے مروی ہے اور جس میں منیٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ یوم النحر کا ذکر ہے اور اس کے آخر میں بروایت مسلم یہ لفظ ہے: ”پھر آپ لوٹ کر اٹنے دو سیاہ مینڈھوں کی طرف“ پس ان کو ذبح کیا۔ اور بکریوں کے ایک ریوڑ کی طرف“ پس اس کو ہمارے درمیان تقسیم فرمایا“ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مکہ کا ہے۔ اس کے برعکس حضرت انسؓ کی حدیث سے جو صحیح بخاری کے متعدد مواضع میں مروی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ کا واقعہ ہے۔ جواب یہ ہے کہ لوگوں نے اس سلسلہ میں دو طریق اختیار کئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس موقع پر حضرت انسؓ کا بیان صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں دو مینڈھے ذبح کئے تھے۔ اور یہ کہ آپ عید کی نماز سے فارغ ہو کر دو مینڈھوں کی طرف لوٹے، چنانچہ حضرت انسؓ نے مکہ میں اونٹ ذبح کرنے اور مدینہ میں مینڈھے ذبح کرنے کے واقعہ کو ایک دوسرے سے مینر کر کے بیان کیا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دو واقعے ہیں، اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جتنے حضرات نے منیٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کا ذکر کیا ہے انہوں نے صرف اونٹوں کا نحر ذکر کیا ہے، یہی ہدی آپؐ ساتھ لے کر گئے تھے۔ اور ان کا نحر کرنا افضل تھا۔ بجائے اس کے کہ جو بکریاں آپؐ ساتھ نہیں لے گئے انہیں ذبح کرتے۔ چنانچہ حضرت جابرؓ نے قصہ حجۃ الوداع میں ذکر کیا ہے کہ ”آپؐ رمی کر کے واپس ہوئے تو اونٹوں کا نحر کیا۔“ دراصل بعض راویوں کو اس میں اشتباہ ہو گیا۔ چونکہ مینڈھوں کے ذبح کرنے کا واقعہ عید کے دن کا تھا۔ اس بنا پر انہوں نے خیال کر لیا کہ یہ منیٰ کا واقعہ ہے۔ دوسرا طریقہ ابن حزمؒ اور ان کے ہم مسلک لوگوں کا ہے کہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ اور دونوں عمل جہاد ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے مکہ کی قربانی کا ذکر کیا ہے۔ اور حضرت انسؓ نے مدینہ کی قربانی کا۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے یوم النحر میں بکریوں کو ذبح کیا۔ اور گائے اور اونٹوں کا نحر کیا تھا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی دی تھی، صحیحین میں ہے اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر میں حضرت عائشہ کی طرف سے ایک گائے ذبح کی تھی، اور سنن میں ہے کہ آپؐ نے آل محمد کی جانب سے ایک گائے نحر کی تھی۔ ابن حزم کا مذہب ہے کہ حاجی کے لئے ہدی کے ساتھ قربانی بھی مشروع ہے۔ اور صحیح۔ انشاء اللہ پہلا طریقہ ہے۔ اور حاجی کے لئے ہدی مقیم کی قربانی کا حکم رکھتا ہے، کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل نہیں کیا نہ آپکے صحابہ کرام سے کہ انہوں نے ہدی اور قربانی کو جمع کیا ہو، بلکہ ان کی ہدی یہی قربانی تھی۔ پس یہ منیٰ میں ہدی ہے اور دوسری جگہ میں قربانی۔ را حضرت عائشہؓ کا یہ بیان کہ آپؐ نے اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی کی تھی تو اس میں ہدی پر قربانی کا اطلاق کیا گیا ہے۔ ابن قیم کا کلام ختم ہوا۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ کی یہ حدیث امام بخاری نے صحیح بخاری میں تو جگہ روایت کی ہے کہیں مختصر کہیں مطول۔ مگر اسی کے کسی طریق میں سینڈول کے ذبح کرنے کا ذکر نہیں دیکھا۔ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں: "قاضی کہتے ہیں کہ دارقطنی نے کہا ہے کہ راوی کا یہ قول پھر آپؐ کو لے لیا یہ ابن عون کا وہم ہے، دراصل یہ جملہ ابن سیرین نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے، مگر ابن عون نے اسے ابن سیرین کی سند سے ابوبکرؓ کی اس حدیث میں ذکر کر دیا۔ قاضی کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے یہ حدیث ابن عون سے روایت کی ہے مگر اس میں یہ فقرہ ذکر نہیں کیا، غالباً انہوں نے اسے عمداً ترک کر دیا ہے۔ اور یہی حدیث مسلم شریف کی کتاب الدیات میں ابوبکرؓ اور قرہ نے ابن سیرین سے روایت کی ہے انہوں نے بھی یہ زائد فقرہ نقل نہیں کیا، قاضی کہتے ہیں کہ بظاہر زائد فقرہ خطبہ عید الاضحیٰ کے سلسلہ میں کسی اور حدیث کا تھا، مگر راوی کو وہم ہوا اور اس نے اس کو خطبہ حج میں ذکر کر دیا۔ یا یہ دو حدیثیں تھیں جو ایک دوسری میں ملا دی گئیں۔ امام مسلمؒ نے الصحاح میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث بروایت ابوبکرؓ و بشام عن ابن سیرین روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھی، پھر خطبہ دیا، پس حکم دیا کہ جو لوگ نماز سے پہلے قربانی کر چکے ہیں۔ ان کی قربانی صحیح نہیں ہوئی اس لئے، وہ دوبارہ قربانی کریں۔ اس حدیث کے آخر میں ہے: پھر آپؐ لوٹ کر گئے دو سیاہ سینڈھوں کی طرف الخ۔ پس یہی صحیح ہے اور اس سے اشکال رفع ہو جاتا ہے۔ انتہی۔

د قال، فلما اكمل نحوه استدعى بالخلق
توجه: پس جب نحر کا عمل پورا کر لیا تو حلاق کو طلب فرمایا،

اور حاجی کی قربانی کا مسئلہ اختلافی ہے،
کیا مسافر اور حاجی کے ذمہ قربانی واجب ہے | چنانچہ اجماع کے حاشیہ میں ہے کہ عینی کہتے ہیں: کیا

مسافر کے ذمہ بھی قربانی واجب ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے، امام شافعی کا قول ہے کہ یہ سب
لوگوں کے لئے سنت ہے۔ منیٰ میں حاجی پر بھی۔ اور امام مالک کا قول ہے کہ اس کے ذمہ قربانی نہیں۔
اور سوائے منیٰ میں حج کرنے والے کے کسی کو اس کے ترک کرنے کا حکم نہیں کیا جائے گا۔ اور امام ابو حنیفہ
فرماتے ہیں کہ مسافر پر قربانی واجب نہیں، اھ اور موفق، کتاب الحج میں کہتے ہیں: ”جب یوم النحر میں جمرہ
عقبہ کی رمی سے فارغ ہو تو ٹھہرے نہیں، بلکہ فوراً واپس آجائے، اب سب سے پہلے جو کام اسے کرنا ہے وہ
ہدی کا نحر ہے۔ اگر اس کے ساتھ ہدی ہو، خواہ واجب ہو یا نفل کی۔ پس اگر ہدی ساتھ نہ لایا ہو، اور اس
کے ذمہ ہدی واجب ہو تو خرید لے اور اگر اس کے ذمہ واجب نہیں تو بہتر ہے کہ قربانی کا جانور خرید کر قربانی کر دے۔“

اور صحابہؓ نے گائے اور اونٹوں میں شرکت کی تھی صحیح
اونٹ اور گائے میں صحابہ کا اشتراک | مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ ”ہم نے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا۔ پس ہم نے اونٹ کا سات آدمیوں کی جانب سے خر کیا اور گائے
بھی سات کی جانب سے ذبح کی۔“ امام مسلمؒ نے اس مضمون کی متعدد روایتیں نقل کی ہیں۔

پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر کا عمل پورا کر لیا تو حلاق
حلاق کے نام میں اختلاف | کو طلب فرمایا، شیخ ابن قیمؒ کی تصریح کے مطابق یہ معمر بن عبد اللہ بن خثلمہ

بن عوف تھے۔ اور بدل میں ہے کہ ”نودویؒ کہتے ہیں کہ حلاق کے نام میں اختلاف ہے، پس صحیح اور مشہور
یہ ہے کہ ان کا نام معمر بن عبد اللہ عدوی ہے۔ اور بخاری میں ہے کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ معمر بن عبد اللہ
تھے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا نام خراش بن امیہ بن ربیعہ الکلبی ہے۔“ اھ اور زر قانی نے شرح مواہب میں
ان دونوں ناموں پر مفصل کلام کیا ہے۔ اور دونوں کے بارے میں روایات نقل کی ہیں۔ اور پہلا نام
معمر بن عبد اللہ بن فضلہ ذکر کیا ہے، یعنی ”خثلمہ“ کے بجائے ”فضلہ“ اور حافظؒ نے بھی فتح میں ”فضلہ“
بی ذکر کیا ہے۔ پس البدی میں خثلمہ کا لفظ تصحیف ہے اور زر قانی نے اس کو بفتح نون اور سکون

فخلق رأسه و قدم شعده۔

ترجمہ: پس اس نے آپؐ کا سر کا حلق لیا۔ اور اپنے موئے مبارک تقسیم فرما دیئے۔

ضاد کے ساتھ ضبط کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ بڑی عمر کے صحابی تھے، ہماجرین حبشہ میں شامل تھے۔ اور کہا کہ ابن السکن کا بیان ہے کہ خراش بن امیہ صرف ایک حدیث کے راوی ہیں۔ اور وہ یہ کہ میں نے عمرۃ القنصار میں مروی کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلق کیا تھا، ابن الکلبی کہتے ہیں کہ انہوں نے عمرۃ القنصار میں حلق کیا تھا یا عمرہ حدیبیہ میں؟ احد اور حافظ فرماتے ہیں: حلاق کے نام میں اختلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ وہ عمر بن عبد اللہ تھے، جیسا کہ بخاری نے ذکر کیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ خراش بن امیہ تھے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ خراش نے عمرہ حدیبیہ میں حلق کیا تھا، احد ابن ہشام نے عمرہ حدیبیہ کے بارے میں ابن اسحاق کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میری اطلاع کے مطابق آپؐ کا حلق خراش بن امیہ بن الفضل الخزاعی نے کیا تھا، احد۔ پس اس نے آپؐ کے سر کا حلق کیا، اور ناخن تراشے اور لبوں اور خنوروں کے بال لٹے۔ جیسا کہ طبقات ابن سعد میں ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے موئے مبارک تقسیم فرما دیئے۔
موئے مبارک کی تقسیم جیسا کہ روایات میں معروف ہے، اور طبقات میں ہے کہ آپؐ نے اپنے موئے مبارک اور ناخنوں کو دفن کرنے کا حکم فرمایا، احد ممکن ہے پہلے آپؐ نے دفن کرنے کا حکم فرمایا، پھر جب صحابہؓ کا شدید اشتیاق دیکھا کہ وہ موئے مبارک حاصل کرنا چاہتے ہیں تو تقسیم کرنے کا حکم فرمایا، چنانچہ طبقات ہی میں ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حلاق آپؐ کا حلق کر رہا ہے، اور آپؐ کے صحابہؓ آپؐ کے گرد جمع ہیں وہ چاہتے ہیں کہ جو بال بھی گرے کسی آدمی کے ہاتھ ہی میں گرے۔ الخ اور اگر تطبیق کے لئے یہ توجہ نہ کی جائے تو صحیح بخاری کا بیان زیادہ صحیح ہے۔ رقی ایسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلاف روایات کے مطابق ابو طلحہ کو دائیں یا بائیں جانب کے موئے مبارک عطا فرمائے۔ (دش) اس امر میں روایات بہت ہی مختلف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کونسی جانب ابو طلحہ کو مرحمت فرمائی اور کونسی جانب لوگوں میں تقسیم فرمائی۔ دو صورت اول خود ابو طلحہ کو عطا فرمائے یا ان کی اہلیہ ام سلیم کو؟ اس سلسلہ میں شیخین وغیرہ کی روایات مختلف ہیں جیسا کہ شیخ ابن قیم صاحب البدایہ والنہایہ اور زرقانی نے شرح مواہب میں تفصیل سے ذکر کی ہیں شیخ ذہبی

سرف نے بدل میں شیخ ابن قیم کے کلام کا خلاصہ ذکر کیا ہے اور میں نے تلخیص بدل میں خلاصہ کا خلاصہ دیا ہے جو بہت ہی مختصر ہے اور وہ اس مختصر کے مناسب ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "اس کا قول: وہ ابو طلحہ کو بیٹے اور سلم کی روایت میں ہے کہ ام سلمہ کو دیئے پس احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہ کو دیئے ہوں کہ وہ اپنے شوہر ابو طلحہ کو دے دیں۔ غالباً ابو طلحہ اس وقت وہاں موجود نہ ہوں گے۔ بلکہ مومنے مبارک کی تقسیم میں مشغول ہوں گے شیخ قدس سرہ کا رجحان اسی طرف ہے، اور یہ احتمال بھی ہے کہ آپ نے ابو طلحہ کو دیئے ہوں تاکہ وہ ام سلمہ کے سپرد کر دیں کہ ان کے پاس محفوظ رہیں۔ رہا دائیں، بائیں کا اختلاف، تو شیخ ابن قیم نے اس کو مفصل لکھا ہے۔ ان کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ مقدسی کا رجحان اس طرف ہے کہ ابو طلحہ کو دائیں جانب عطا فرمائی، اور مقدسی نے اس کو بائیں عوں کی روایت سے ترجیح دی ہے جو صحیح بخاری میں ان الفاظ سے مروی ہے: ابو طلحہ پہلے شخص تھے جنہوں نے آپ کے مومنے مبارک حاصل کئے اور حافظ ابن قیم کا رجحان یہ ہے کہ ابو طلحہ کو خود ان کی ذات کے لئے بائیں جانب عطا فرمائی تھی۔ اور وہ بخاری کی روایت کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ ابو طلحہ کو دائیں جانب میں سے بھی حصہ ملا تھا۔ اور بائیں جانب تو خاص ان ہی کے لئے مخصوص تھی۔ ابن قیم نے اپنے قول کی تائید میں متعدد روایات ذکر کی ہیں جن میں تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں جانب تقسیم فرمائی تھی۔ اور بائیں جانب ابو طلحہ کو ان کی ذات کے لئے عنایت فرمائی تھی۔ اس بنا پر ابن قیم کے نزدیک ابو داؤد کی روایت راجح ہے، جس میں حضرت انس سے مروی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلاق کو بلایا، اس نے آپ کے سر کی دائیں جانب کے بال اتارے۔ پس آپ ارد گرد لوگوں کے درمیان ایک ایک دو دو بال تقسیم فرمانے لگے، اسی طرح شیخ قدس سرہ نے بدل میں اس روایت کو اصل قرار دیا ہے۔ اور سلم شریف کی وہ روایت جس کے الفاظ یہ ہیں: "آپ نے دائیں جانب حلاق کی طرف کی، اس نے دائیں جانب حلق کیا، آپ نے ابو طلحہ کو بلا کر یہ بال ان کو دے دیئے۔ پھر حلاق کی طرف بائیں جانب کی اور اسے بال اتارنے کا حکم فرمایا۔ اس نے بائیں جانب کے بال اتارے وہ آپ نے ابو طلحہ کو دے کر فرمایا یہ لوگوں میں تقسیم کر دئے شیخ نے اس کی یہ توجیہ فرمائی ہے کہ اس روایت میں تقدیم و تاخیر ہوئی ہے، یا یہ کہا جائے کہ اس کو تقسیم کر دئے۔" کی ضمیر قریب کی طرف نہیں بلکہ بعید کی طرف راجح ہے یعنی جو بال پہلے اتارے گئے تھے ان کو تقسیم کرنے کا حکم فرمایا، پس غور کر لو، تلخیص بدل کا مضمون ختم ہوا۔

اور حافظ روایات کا کچھ اختلاف ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں اور ان روایات میں تعارض نہیں۔ بلکہ ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ آپ نے دونوں جانب کے بال ابو طلحہ کو دیئے، دائیں جانب کے تو ابو طلحہ نے آپ کے حکم سے تقسیم کر دیئے اور بائیں جانب کے انہوں نے آپ کے حکم سے اپنی بیوی ام سلیم کو دے دیئے۔ اور امام احمد کی روایت میں یہ اضافہ ہے "تاکہ وہ ان کو اپنی خوشبو میں ڈال لیا کریں" الخ۔

آپ کے پسینہ مبارک کی خوشبو | میں کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلیم کو خوشبو میں موئے مبارک ڈالنے کا جو حکم فرمایا غالباً

اس کی وجہ روایت ہے جو جمع الوسائل میں صحیح مسلم سے نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ام سلیم کے ہاں آرام فرما رہے تھے، آپ کو پسینہ آیا، ام سلیم آپ کا پسینہ صاف کر کے شیشی میں جمع کرنے لگیں، آپ بیدار ہوئے تو دریافت فرمایا کہ یہ کیا کرتی ہو؟ ام سلیم نے عرض کیا کہ یہ آپ کا پسینہ مبارک ہے، ہم اس کو اپنی خوشبو میں ڈالیں گے۔ اور یہ سب سے عمدہ خوشبو ہے۔ احجب آپ کے پسینہ کا یہ حال ہے تو آپ کے موئے مبارک کی عطری نری کا کیا پوچھنا؟

اور زرقانی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم | موئے مبارک کی تقسیم کی حکمت اور ابو طلحہ کی تخصیص کی وجہ

اور سامان تسلی ہو۔ گویا اس سے قرب اجل کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔ اور ابو طلحہ کو موئے مبارک کی تقسیم پر مامور فرمانے میں اسی مضمون کی طرف اشارہ تھا، کیونکہ ابو طلحہ ہی نے آپ کی قبر مبارک تیار کی، الحمد للہ، اور اس میں کچی اینٹوں کی چٹائی کی۔ اور اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ امام کبیر بعض حضرات کو عطیہ اور ہدیہ وغیرہ کی تقسیم پر مامور کر سکتا ہے۔ اخیر شیخ قدس سرہ کو کتب میں فرماتے ہیں: آپ نے وہ موئے مبارک ابو طلحہ کو، جو ام سلیم والدہ انس بن مالک کے شوہر تھے۔ عطا فرمائے، اس سے ان حضرات کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اکابر کے بالوں کے ساتھ ادب اسی طرح لباس وغیرہ کے ساتھ تبرک حاصل کرنا جائز ہے۔ اور یہاں سے یہ نکتہ بھی استنباط کیا جاسکتا ہے کہ تقسیم کے معاملہ میں افاضل کی تقدیم ضروری نہیں، چنانچہ

و قسم اظفاراً

ترجمہ: اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ناخن تقسیم فرمائے۔

اس موقع پر حضرات ابو بکر، عمر اور دیگر افاضل صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ مگر جس قدر موئے مبارک ابوطحہ کو عطا فرمائے کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمائے، البتہ اگر اس سے ان کی کبیدگی کا اندیشہ ہو تو ایسا کرنا مناسب نہیں: "اھ

حلق نسکے یا حصر ممنوع

پھر حلق نسک (عبادت) ایسے یا محض ممنوع اشیاء کو مباح کرنے کے لئے ہے؛ یہ ایک مشہور اختلافی مسئلہ ہے جس کی تفصیل اوپر میں ہے۔ جمہور علماء پہلی رائے پر ہیں۔ اور امام بخاریؒ نے "صحیح میں ایک

باب کا عنوان قائم کیا ہے "باب الحلق والتقصیر عند الاحلال"، حافظ فرماتے کہ امام بخاریؒ اسی ترجمہ الباب سے بتانا چاہتے ہیں کہ حلق عبادت ہے۔ کیونکہ انہوں نے "حلال ہونے کے وقت حلق و تقصیر" کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی حلق خود تحلیل نہیں بلکہ حلال ہونے کے وقت کیا جاتا ہے، گویا انہوں نے اس دعا پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کرانے والوں کے لئے دُعا فرمائی۔ اور دعا ثواب کے کام پر ہوتی ہے۔ اور ثواب عبادت پر ہی ہوتا ہے۔ نہ کہ مباحات پر۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلق کو قصر سے افضل قرار دینا بھی اسی طرف مشعر ہے۔ کیونکہ مباحات میں باہمی تفاضل نہیں ہوتا ہے۔ اور جمہور حلق کے عبادت ہونے کے قائل ہیں۔ اور ثنائیہ کے نزدیک بھی یہی صحیح ہے۔ اور نوویؒ شرح ہندب میں فرماتے ہیں کہ ابن منذر وغیرہ کے کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حلق کے عبادت نہ ہونے کے صرف امام شافعیؒ قائل ہیں، اور امام احمد سے بھی ایک روایت ہے۔ اور امام ابو یوسفؒ سے بھی نقل کیا گیا ہے۔ موثق کہتے ہیں امام احمدؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ یہ عبادت نہیں، بلکہ احرام کی بنا پر جو چیزیں ممنوع اور حرام عقیم محض ان کو مباح کرنا ہے، "اتہی من الادجز مختصراً۔"

اُپ کے ناخن کی تقسیم

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ناخن تقسیم فرمائے۔ اور الدی

ابن مسند امام احمد کی روایت سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے اپنے سر کی بائیں جانب کے موئے مبارک ابوطحہ کو دیئے، پھر ناخن تراشے اور ان کو لوگوں پر تقسیم فرمادیا، اور ایک روایت میں محمد بن زبید سے مروی ہے کہ ان کے والد نے ان سے بیان کیا کہ وہ قریش کے ایک آدمی کے سامنے برائے

رقلت، ثم لبس ثيابه وتطيب (قال)، ثم افاض الى مكة قبل الظهر (اكباً رقلت)
على راحلته

ترجمہ: (دش) پھر آپ نے اپنے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائی (رق)، پھر آپ مکہ کی جانب روانہ ہوئے ظہر
سے پہلے، سوار ہو کر (دش) اپنی اونٹنی پر،

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے، اور آپ قربانی کے جانور تقسیم فرما رہے تھے،
مگر ان کو کچھ نہ ملا، نہ ان کے رفیق کو، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کپڑے میں سر کا حلق کر لیا،
پس وہ آپ کی خدمت آئے اور ان میں سے کچھ بال چند افراد پر تقسیم فرمائے، اور آپ نے اپنے ناخن
ہمارے، پس وہ ان کے رفیق کو عطا فرمائے۔ انتہی۔

رق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کرنے والوں کے لئے تین مرتبہ اور قصر کرنے والوں
کے لئے ایک مرتبہ دعا فرمائی۔ (اصیخ ابن قیمؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کا سعی پوری کرنے کے بعد مردہ کے پاس یہ دعا فرمانا پہلے گزر چکا ہے۔ اور اسی جگہ یہ بحث بھی
گند چکی ہے۔ کہ یہ تعصب حدیبیہ کا ہے یا حجتہ الوداع کا؟ اور بر تقدیر دوم مردہ کے پاس کا ہے یا منی
کا! اور یہ کہ محققین کے نزدیک رائج یہ ہے کہ یہ دعا دونوں موقعوں پر فرمائی۔ لیکن حجتہ الوداع میں مردہ
کے پاس فرمائی یا منی میں؟ تو اس بارہ کے نزدیک مردہ کے پاس ہونا اوجہ ہے کیونکہ وہاں حلق کرنا حلال
ہونے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا کمال اتباع تھا، لیکن منی میں حلق کرنے والوں کی کوئی
تخصیص نہ تھی کہ ان کے لئے تین بار دعا فرماتے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ
الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللَّهُ اٰمِنِينَ مَحْلِقِينَ رُءُوسِهِمْ وَمَقْصُرِينَ لَاتَخْفَوْنَ مِنْهُمْ" پس وہاں
تفصیر میں بھی ارشاد خداوندی: "و مقصرین کی بیرونی تھی۔"

(دش) پھر آپ نے اپنے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائی۔

طوافِ افاضہ کیلئے تشریف لیجانا | اس سلسلہ کی روایات صاحب البدایہ والنہایہ نے تفصیل

سے ذکر کر دی ہیں۔ (رق)، پھر آپ اسی دن بروز ہفتہ مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اور اس پر گفتگو آگے
آتی ہے کہ کیا آپ نے رات کے قریب تک طواف مؤخر کیا؟ ظہر سے پہلے اور اس پر گفتگو آگے آتی
ہے کہ آپ نے ظہر مکہ میں پڑھی یا منی میں؟ سوار ہو کر (دش) اپنی اونٹنی پر جیسا کہ البدایہ والنہایہ

میں متعدد روایات میں اس کی تصریح ہے۔ اور ابو داؤد نے اپنی سند سے حضرت غزوہ بن حارث کنزی سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”میں حجة الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس ابوالحسن (حضرت علیؓ) کو بلاؤ۔ بعد ازاں پوری حدیث ذکر کی، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ دونوں کامل کراؤٹھوں کا ٹکڑا کرنا مذکور ہے۔ اور اس کے آخر میں ہے۔ پس جب فارغ ہوئے تو اپنی چھر پر سوار ہوئے اور حضرت علیؓ کو اپنے پیچھے سوار کیا، صاحب البدایہ والنہایہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ”ابو داؤد اس کے ساتھ متفرد ہیں، اور اس کی سند اوتھن میں غرابت ہے؟“ ابو داؤد کی اس حدیث پر یہ اشکال ہے کہ صحیح مسلم میں ابو داؤد کی کتاب الحج: باب بنید السقاء میں بکر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ابن عباسؓ سے کہا کہ کیا قصہ ہے کہ اس گھڑنے کے لوگ بنید پلاتے ہیں؟ اس کا سبب بخل ہے یا احتیاج؟ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر ہمارے پاس تشریف لائے، آپ کے پیچھے اسامہ بن زید سوار تھے الخ۔ اس حدیث سے اسامہ بن زید کا آپ کے پیچھے سوار ہونا ثابت ہے، اس کی توجہ یہ ہے کہ اسامہ کا پیچھے سوار ہونا فتح مکہ میں تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری کی روایت میں حضرت ابن عمرؓ سے اس کی تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن اعلیٰ مکہ سے اپنی اونٹنی پر تشریف لائے۔ اور اسامہ بن زید کو اپنے ساتھ سوار کر رکھا تھا الخ۔ یا یہ کہا جائے کہ ابو داؤد کی روایت میں غرابت ہے، جیسا کہ صاحب البدایہ والنہایہ نے کہا ہے۔

صاحب نسیم الریاض نے شرح شفا میں ان حضرات کے ناموں کی فہرست ذکر کی ہے جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اور جن حضرات کو آپ کے ساتھ سوار ہونے کا شرف حاصل ہوا ان کے ناموں کی فہرست

وہ یہ ہیں، اسامہ بن زیدؓ عرفہ سے واپسی میں، حضرت ابوبکر صدیقؓ سفر بھرتہ میں، عثمانؓ علیؓ حجة الوداع میں عبد اللہ بن جعفرؓ آپ کے نواسے بنو ہاشم کے دوڑ کوں کے ساتھ۔ حضرت عباسؓ کے تینوں صاحبزادے حسنؓ حسینؓ، معاویہؓ، معاذ بن جبلؓ، ابوذرؓ، زید بن حارثہؓ، ثابت بن ضحاکؓ، شریک بن سویدؓ، سلمہ بن کوثرؓ، زید بن سہیلؓ، ابوطالبؓ، سہیل بن رضادؓ آپ کے نواسے۔ علی بن زینبؓ، عبد اللہ بن زبیرؓ، بنو مطلبؓ کا ایک لڑکا۔ اسامہ بن غیرؓ، صفیہ بنت حنیؓ۔ ابو الدردارؓ، آمنہ بنت ابی الصلتؓ، ابویاسؓ، ابوہریرہؓ، قیس بن سعدؓ

طواف طواف الافاضۃ زقلت، راکباً۔

توجہ : پس طواف افاضۃ کیارش (سواری پر۔

نوات بن جبیر، جبریل علیہ السلام براق پر شب امراء میں، ام حبیبہ عورتہ۔ زید بن ارقم، جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم، اور ابن مندہ نے بعض دیگر حضرات کا بھی اضافہ کیا ہے، انتہی مختصراً۔

پس طواف افاضۃ کیا۔ اس کو طواف زیارتہ اور طواف صد بھی کہتے ہیں۔ کدانی

طواف افاضہ | الہدیٰ۔ اور مختصر تحفیل میں ہے : مکر وہ ہے یہ کہ کہا جائے طواف زیارت یا کہا جائے کہ زیارت کی ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی : درود پر کہتے ہیں : کیونکہ زیارت کے لفظ سے استغناء مفہوم ہوتا ہے اور غالباً یہ کسی گذشتہ زمانے میں ہوگا، مگر آج کل یہ لفظ تعظیم کے لئے استعمال ہوتا ہے : اور رضی (سواری پر۔ سواری پر طواف کرنے کی بحث طواف قدوم میں گذر چکی ہے۔

اور اربع ثلاثہ میں ہمارے شیخ الشانخ شاہ عبدالغفر زیدلوی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ | قدس سرہ نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا : حجۃ الوداع میں جناب مسجدین بول و براز سے محفوظ رہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی پر سوار ہو کر طواف فرمایا تھا۔

جس سے مقصود تعلیم افعال طواف بھی اور لوگوں کے سوال کا جواب دینا اور اس حالت میں آپ کی اونٹنی نے نہ جگلا، نہ مینگنیاں کیں۔ اور نہ پیشاب کیا۔ پس حرمت مسجد بھی محفوظ رہی اور مقصود تعلیم بھی حاصل ہو گیا : اور حافظ فرماتے ہیں کہ : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سواری پر طواف کرنا اس ضرورت کی بنا پر تھا کہ لوگ آپ سے مناسک سیکھ سکیں۔ اسی بنا پر جن حضرات نے آپ کے خصائص کو جمع کیا ہے انہوں نے اس کو منجملہ خصوصیات نبویہ کے شمار کیا ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس وقت آپ کی اونٹنی بطور آپ کی کرامت کے : بول و براز سے محفوظ رہی ہو۔ اس لئے دوسرے مؤرخین کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا : ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں : اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کی ناقہ سدھائی ہوئی تھی، اس لئے اس کے چلنے کے دوران تلویث کا خطرہ نہیں تھا۔ ممکن ہے یہی حال ام سلمہ کے اذٹ کا بھی ہو : اور

رق، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے علاوہ کوئی طواف نہیں کیا۔ اور اس طواف کے ساتھ سعی نہیں کی : فتح ابن قیم کے نزدیک یہی صحیح ہے۔ اور اس امر کی تین جماعتوں نے مخالفت کی ہے۔ اول وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ آپ نے دو طواف کئے، طواف قدوم اور طواف زیارت۔ دوم وہ جماعت

جو کہتی ہے کہ آپ نے اس طواف کے ساتھ سعی بھی کی۔ کیونکہ آپ قارن تھے، سو وہ جماعت جن کا خیال ہے کہ آپ نے اس دن طواف نہیں کیا بلکہ طواف کو رات تک مؤخر کیا شیخ ابن قیمؒ ان کے دلائل ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ”اور اس شخص کو وہم ہوا جس نے یہ کہا کہ آپ نے دو مرتبہ طواف افاضہ کیا، ایک بار دن میں اور ایک بار رات میں“ (دش) اور اس پر گفتگو غفریب آتی ہے کیونکہ اس کا منشا بخاری کی روایت ہے۔

اور حنفیہ کا مسلک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کے بعد سعی بھی کی تھی۔ کیونکہ ان کا مسلک

یہ ہے کہ قارن کے ذمہ دو طواف اور دو سعی ہیں۔ اس کی تفصیل اول رسالہ میں گذر چکی ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی نوعیت میں اولام کا بیان آیا تھا۔ اور ائمہ ثلاثہ کا قول ہے کہ قارن کے ذمہ صرف ایک طواف اور ایک سعی ہے۔ شیخ ابن قیمؒ کا کلام اسی پر مبنی ہے۔ اور وہ اس کے خلاف کو وہم کہتے ہیں۔ اور القریٰ لقاصداً القریٰ میں بحوالہ سند احمد ابن عباسؒ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر طواف کیا، آپ اپنی چھڑی سے حجر اسود کا استلام فرماتے تھے، طواف سے فارغ ہوئے تو زمزم پر گئے، آپ کے بنوعم دھچیرے بھائی، پانی کی گھنچ ہے تھے۔ آپ نے فرمایا مجھے دو ڈول آپ کو دیا گیا، آپ نے نوش فرمایا، پھر نیکلے، پس صفاء مروہ کا طواف کیا۔ پس یہ حدیث اس باب میں صریح ہے کہ آپ نے طواف افاضہ کے بعد سعی کی، کیونکہ طواف قدوم بمیدل تھا، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

(رق) اور ابو داؤد اور نسائی میں جو حدیث

کیا آپ نے طواف افاضہ رات تک مؤخر کیا تھا

سے مروی ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم نحر کا طواف رات تک مؤخر کیا، یہ حدیث معلول ہے۔ اس کے علل کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ”بظاہر راوی سے طواف کے نام میں غلطی ہوئی ہے۔ کیونکہ رات تک تاخیر کا قصہ طواف وداع کا ہے۔“ بعد ازاں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ اوپر جو حدیث عائشہؓ و جابرؓ کا لفظ آیا ہے یہ کاتب کی غلطی ہے۔ ورنہ ابو داؤد میں ابو الزبیر کی حدیث حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اور خود حافظ ابن قیمؒ نے بھی حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے ابو الزبیر کے سماع پر بحث کی ہے اور بحث میں حضرت جابرؓ کا ذکر نہیں آتا۔ اسی طرح امام بخاری نے صحیح میں تعلیقاتوں ذکر کیا ہے: ”ابو الزبیر نے عائشہؓ اور ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت نے طواف زیارة

کورات تک مؤخر کیا: اھ اور علماء نے ابو الزبیر کی اس حدیث میں اختلاف کیا ہے اور حافظ ابن قیمؒ نے اسے ضعیف قرار دینے پر مفصل کلام کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہ حدیث واضح طور پر غلط ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل معروف کے خلاف ہے، جس میں آپؐ کے حج سے واقفیت رکھنے والوں کو ذرا بھی شک نہیں: اور امام ترمذی کا قول سبوح ان کی کتاب العلل میں ہے۔ نقل کیا ہے کہ انہوں نے (امام ترمذی) نے امام بخاریؒ سے دریافت کیا کہ ابو الزبیر کا سماع حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے ثابت ہے؟ امام بخاریؒ نے جواب دیا کہ ابن عباسؓ سے تو ثابت ہے اور حضرت عائشہؓ سے ان کا سماع محل نظر ہے، اور ابن قسطلان کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں، پوری تفصیل ترمذی کی کتاب العلل میں ہے۔ اور بحث کے آخر میں شیخ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ دراصل غلطی طواف کے نام میں واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف وداع کو آخر شب تک مؤخر کیا تھا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ یہاں حضرت عائشہؓ کی طویل حدیث جس میں ان کے اپنے بھائی کے ساتھ عمرہ تنعیم کا ذکر ہے نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: بغیر کسی شک و شبہ کے ٹھیک طور پر یہی طواف ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر شب تک مؤخر کیا تھا۔ پس ابو الزبیر نے یا ان سے روایت کنندہ نے غلطی سے جھٹ

طواف وداع کے طواف زیارۃ کا لفظ ذکر کر دیا، انتہی مختصراً۔
 اور صاحب البدایہ والنہایہ ان روایات کے طرق کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: اگر اس کی تاویل یہ کی جائے کہ آپؐ نے طواف زیارت کو مابعد زوال تک مؤخر کیا، گویا رات سے مراد شام ہے تو یہ روایت صحیح ہے اور اگر رات سے مراد مابعد غروب لیا جائے تو یہ بہت ہی بعید اور روایات صحیحہ کے مخالف ہے۔ اور جس طواف کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گئے تھے وہ طواف وداع ہے، بعض راویوں کو بھی طواف زیارت سے تعبیر کر دیتے ہیں: یا اس سے مراد زیارت محضہ کا طواف ہے، جو طواف وداع سے قبل اور طواف صدر یعنی طواف قرص کے بعد ہوتا کیونکہ روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کی راتوں میں ہر رات زیارت بیت اللہ کے لئے آتے تھے۔ مگر یہ تاویل بھی بعید ہے، انتہی مختصراً۔

ادیشخ بدل میں فرماتے ہیں: اس کی یہ تاویل ممکن ہے کہ حدیث کا اصل لفظ وہ تھا جو امام بخاریؒ نے تعلیقاً ذکر کیا ہے یعنی ”آپؐ نے مؤخر کیا زیارت کورات تک“ اور زیارت سے

اد طواف زیارۃ نہیں بلکہ زیارت بیت اللہ تھی۔ مگر کسی راوی نے اس سے یہ سمجھ کر کہ اد طواف زیارت ہے۔ اس کو یوں روایت کر دیا کہ ”مؤخر کیا طواف یوم النحر کورات تک“ اور امام بخاری نے بصیغہ ”مريض ذکر کیا ہے کہ“ اور ذکر کیا جاتا ہے بواسطہ ابو حسان کے ابن عباسؓ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم متی کے ایام میں بیت اللہ کی زیارت کیا کرتے تھے۔ ”گویا امام بخاری حدیث ابوانزہیر میں ذکر شدہ لفظ زیارت کو طواف زیارت پر نہیں بلکہ زیارت بیت اللہ پر محمول کرتے ہیں۔“ اھ اور میرے حاشیہ بذل میں ہے کہ ابن حجر نے شرح منہاج میں یہ تاویل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کا طواف مؤخر کیا، اور خود بھی ان کے ساتھ تشریف لے گئے۔“ اھ اور تلامذہ قاری نے ابن حجر کی مذکورہ بالا توجیہ کو نووی سے نقل کر کے لکھا ہے کہ ”اس تاویل پر کوئی دلالت نہیں نہ لفظاً نہ معنایاً نہ حقیقتاً نہ مجازاً۔“ مزید اُن یہ کہ اس کلام کے بین السطور یہ عجیب و غریب بات بھی پائی جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طواف زیارت کے لئے دوسری بار آئے، پس سب سے بہتر یہ توجیہ ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ نے رات تک تاخیر زیارت کو مطلقاً جائز رکھا ہے یا اپنی ازواج مطہرات کورات تک طواف مؤخر کرنے کا حکم فرمایا۔ اور ابن حجر کا یہ کہنا کہ ”خود آپؐ بھی ان کے ساتھ تشریف لے گئے۔“ صحیح نہیں۔ کیونکہ ازواج مطہرات کی معیت میں آپؐ کا دوبارہ رات میں آنا ثابت نہیں۔“ اھ لیکن شیخ ابن ہمام کا رجحان یہی ہے جیسا کہ ابھی آتا ہے اور امام سرخسیؒ نے مبسوط میں اس زیارت کو نفلی طواف پر محمول کیا ہے۔

اد شیخ قدس سرہ کو کتب میں فرماتے ہیں: ”قولہ: آخر طواف الزیارة اگر اس سے مراد یہ ہے کہ خود آپؐ نے رات وقت طواف کیا تو مسلم نہیں۔ کیونکہ اہل علم متفق ہیں کہ آپؐ نے ظہر سے قبل طواف کیا تھا۔ اور اگر یہ مراد ہے کہ دوسروں کے لئے اس کے وقت کورات تک مؤخر فرمایا، یعنی رات تک طواف کو جائز قرار دیا تو ظاہر ہے کہ طواف زیارت کو بارہ تاریخ تک مؤخر کرنا ہمارے نزدیک بلا کر امت اور بغیر وجوب دم کے جائز ہے۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ہمارا تاریخ تک پس ”رات تک تاخیر“ کے کوئی معنی نہ ہونے۔ اس لئے حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ طواف زیارت کے وقت مستحب کورات تک مؤخر کیا۔ اس کے بعد وقت مستحب باقی نہیں رہتا۔“ اھ اور اس کے

رقال) ثم انی ذمزم

توجہ: (رق) پھر زمزم پر آئے

حاشیہ میں درمختار سے نقل کیا ہے کہ یوم نحر میں طواف کر لینا افضل ہے۔ اور قربانی کے تین دنوں میں سے کسی دن کر لینا واجب ہے۔ پس اگر ایام نحر اور ان راتوں سے مؤخر کر دیا تو مکہ وہ تحریم ہے اور ترک واجب کی وجہ سے دم لازم ہوگا؛ انتہی مختصراً۔

گذشتہ بالا بحث سے سات جواب نکل آئے۔ اڈل یہ کہ حدیث صحیح نہیں، بلکہ معلول ہے۔ یہ ابن قحطان نے ذکر کیا ہے۔ دوم یہ کہ راوی سے طواف کے نام میں غلطی ہوئی۔ طواف وداع کے بجائے طواف زیارتہ کہہ دیا۔ یہ حافظ ابن قیمؒ نے ذکر کیا ہے۔ سوم یہ کہ رات سے مراد مابعد غروب نہیں بلکہ مابعد زوال ہے۔ چہاں یہ کہ بعض راوی طواف وداع کو طواف زیارت سے تعبیر کر دیتے ہیں، لہذا طواف زیارت طواف وداع کا غیر معروف نام ہے۔ پنجم یہ کہ اس سے طواف فرض مراد نہیں بلکہ طواف محض اور طواف نفل مراد ہے یہ میں جواب ابن کثیرؒ نے ذکر کیے ہیں۔ اور آخری جواب امام سرخسیؒ کا مختار ہے۔ اور یہی امام بخاریؒ کے ترجمہ الباب سے ظاہر ہے۔ ششم یہ کہ ازدواج مطہرات کے طواف کی تاخیر مراد ہے۔ یہ جواب نوویؒ نے شرح منہج میں ادا ان کی اتباع میں ابن حجرؒ کی نے شرح منہج میں ذکر کیا ہے۔ ہفتم یہ کہ طواف زیارت کی رات تک تاخیر کو جائز رکھنا مراد ہے۔

طواف افاضہ کے بعد زمزم پر تشریف لانا (رق) پھر طواف پورا کرنے کے بعد زمزم پر آئے۔ وہ لوگ پانی نکال رہے تھے، پس فرمایا کہ

اگر یہ خطرونہ ہوتا کہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے تو میں اتر کر تمہارے ساتھ پانی نکالتا۔ پھر انہوں نے آپؐ کو ڈول پکڑ لیا، پس آپؐ نے نوش فرمایا۔ کذا فی الہدی۔ اور تلخیص بدل میں ہے کہ منوویؒ کہتے ہیں کہ آپؐ کا اشد؛ اگر یہ خطرونہ ہوتا کہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے، ”نہ یعنی اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میرے عمل کو دیکھ کر لوگ یہ اعتقاد کر بیٹھیں گے کہ یہ بھی منجندہ مناسک حج کے ہے؛ پس اس کوشش میں تم پر خرمہ آئیں گے۔ اور تمہیں پانی نکالنے سے ہٹا دیں گے تو میں بھی تمہارے ساتھ پانی کھینچتا“۔ اعدیہ واقعہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں مذکور ہے اور اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ طبقات میں حضرت عطاءؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب طواف افاضہ

فشرَب قائلُما۔

موجہا پس کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔

کیا تو اپنے لئے خود ڈول نکالا، اس میں آپ کے ساتھ کوئی شریک نہیں تھا، پھر نوش فرما کر ڈول کا باقی ماندہ پانی کنویں میں ڈال دیا۔ اور ارشاد فرمایا، اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ اس کے نکلانے میں تم پر غالب آجائیں گے تو میرے سوا کوئی اس سے پانی نہ نکالتا۔ اس حدیث سے صاحب ہدایہ نے استدلال کیا ہے کہ خود نکالنا مستحب ہے۔ اور اس کے حاشیہ میں بنایہ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کو طبرانی و احمد اور ابن سعد نے روایت کیا ہے۔ احمد اور زیلعی نے تخریج میں اس کے طرق کو مفصل ذکر کیا ہے۔ شیخ ابن ہمام کہتے ہیں کہ ان دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ ابن سعد کی روایت کا قصہ طواف و داع کے بعد ہے اور حضرت جابرؓ کی حدیث کا واقعہ طواف افاضہ کے بعد کا ہے۔ اور اس کے الفاظ اس سلسلہ میں بالکل واضح ہیں کہ بد پس آپ بیت اللہ گئے۔ ظہر کی نماز مکہ میں پڑھی، پس بنی عبد المطلب کے پاس آئے، وہ لوگ پانی نکال رہے تھے، الخ اور آپ کا طواف و داع رات کے وقت ہوا تھا۔ اور حدیث پر ایک اشکال اس روایت سے بھی ہوتا ہے جو ازرقی نے تاریخ مکہ میں نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مستورات کی معیت میں رات کے وقت بیت اللہ پہنچے، پس اپنی اونٹنی پر طواف کیا، ہاتھ کی چھڑی سے حجر اسود کا استلام فرماتے تھے، پھر زمزم پر آئے اور فرمایا تم پانی نکالتے رہو اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم غلو ہو جاؤ گے تو میں بھی تمہارے ساتھ پانی نکالتا۔ پھر آپ کے حکم سے پانی کا ڈول نکالا گیا، پس آپ نے نوش فرمایا، الخ الا یہ کہ اس روایت کو اس پر محمول کیا جائے کہ ازواج مطہرات طواف افاضہ کیلئے بوقت شب تشریف لے گئیں تھیں، آپ بھی ان کے ہمراہ گئے تھے، اللہ اعلم۔ انتہی۔

پس کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔ کھڑے ہو کر پانی پینے میں علماء کا بہت ہی اختلاف ہے اور وجہ میں اس پر بہت ہی بسط سے کلام کیا ہے۔ اور

اس کی تلخیص حاشیہ الایض میں ذکر کی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ علماء کے اس میں چند اقوال ہیں۔ اول یہ کہ نہی زمزم اور وضو کے باقی ماندہ پانی کے اسوا کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ ہمارے بعض احناف کے ہاں مختار ہے۔ مثلاً صاحب نمبر۔ در مختار وغیرہ۔ دوم یہ کہ کھڑے ہو کر پانی پینا ضرورت کی بنا پر تھا۔ کہ دہاں بیٹھنے کی مناسب جگہ نہ ہوگی۔ سوم یہ کہ جواز کی حدیث منسوخ ہے ابن حزم کا رجحان اسی طرف ہے۔ چہاں یہ کہ نہی کی حدیث منسوخ ہے، اثرم اسی طرف مائل ہیں۔ اور نوذمی نے اس پر شدید رد کیا ہے۔ پنجم

ثم رجع الى منى -

ترجمہ: پھر منی واپس آگئے

یہ کہ نہی تنزیہ کے لئے ہے اور فعل جواز کے لئے یہ نو وحی اور یوحی وغیرہ کا مختار ہے۔ اور اکثر احناف نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ حتیٰ کہ جلی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ ششم: امام طحاوی نے اس کو اختیار کیا ہے کہ نہی حضرت کی بنا پر ہے پس یہ امر شرعی نہیں بلکہ ارشاد ہی و طہی ہے انتہی۔

عینی نے امام طحاوی سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور یہی امام طحاوی کی معافی الائنار اور مشکل الائنار میں مذکور ہے۔ اور حافظ ابن حجر نے امام طحاوی سے جو نقل کیا ہے کہ نہی اس صورت پر محمول ہے جب کہ پانی پیتے وقت بسم اللہ نہ پڑھے۔ تو یہ شاید ان دو کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں ہو گا۔ اور شیخ قدس سرہ لایح میں فرماتے ہیں کہ نہی اس صورت میں ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا نقصان دہ ہو، اور زمزم مضر نہیں۔ کیونکہ اس میں ضرر کا شائبہ تک نہیں؟ پس زمزم کھڑے ہو کر پینا جائز ہوا۔

اور لایح کے حاشیہ میں زمزم کی فضیلت کی روایات تفصیل سے ذکر

آب زمزم کی فضیلت

کی ہیں، من جملہ ان کے یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آپ کا سینہ مبارک آپ زمزم سے دھویا، اور اسی میں ہے کہ علماء کا اجماع ہے کہ زمزم کا پانی دنیا کے ہر پانی سے افضل ہے۔ سوائے اس پانی کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتان مبارک کے درمیان سے پھوٹ نکلا تھا۔ رہا یہ سوال کہ کیا آب زمزم آب کوثر سے بھی افضل ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کا قول نفی میں ہے۔

مگر محققین اس طرف گئے ہیں کہ آب زمزم آب کوثر سے افضل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ

شب معراج میں فرشتوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک آب زمزم سے دھویا تھا۔ اگر آب کوثر افضل ہوتا تو یقیناً وہی لایا جاتا۔ پوری تفصیل اسی جگہ دیکھی جائے۔

پھر آنحضرت منی واپس آگئے۔ اس میں اختلاف ہے کہ آپ

نے ظہر مکہ میں پڑھی یا منی میں واپس آکر؟ چنانچہ صحیحین

آنحضرت نے یوم نحر کی ظہر میں پڑھی یا منی میں؟

میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ظہر منی میں پڑھی یہ حدیث ابن قیم نے اسی طرح صحیحین سے نقل کی ہے، مگر حافظ زلیعی نے نصب الراية میں اور حافظ ابن حجر نے الدرر النور میں اور صاحب مشکوٰۃ نے صرف مسلم کی طرف منسوب کی ہے۔ نیز بیہقی نے السنن اور المعرفت میں صرف مسلم کی طرف

منسوب کی ہے، جیسا کہ زیلعی میں ہے۔ نیز ابن ہمام نے بھی صحیح مسلم کی طرف منسوب کی ہے اور صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ظہر مکہ میں پڑھی۔ اور یہی قول حضرت عائشہؓ کا ہے۔ اب ایک جماعت نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے، اور ایک جماعت نے دوسری کو۔ اور شیخ ابن قیمؒ نے منیٰ میں ظہر پڑھنے کو راجح کہا ہے۔ اور مکہ میں ظہر پڑھنے کو وہم قرار دیا ہے۔ موصوف نے حسب عادت اس پر خوب بسط سے کلام کیا ہے اور فریقین کے دلائل اور ان کے وجوہ ترجیح کو مفصل بیان کیا ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ یہ بہت ہی مشکل ہے، کیونکہ دونوں روایتیں صحیح ہیں: اور ایک لامحالہ وہم ہے، مگر معلوم نہیں کہ صحیح کیا ہے؟ احمد اور عینی شرح ہدایہ میں کہتے ہیں کہ ایک روایت وہم ہے۔ مگر اس کی تعیین معلوم نہیں؟ اور اسی طرح ابن سیداناس نے بھی کہا ہے۔ جیسا کہ زیلعی نے نقل کیا ہے کہ ایک روایت لامحالہ وہم ہے۔ نیز ماتط نے درایہ میں ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ ایک روایت وہم ہے اور زیلعی نے ابن حزم کے کلام میں یہ اضافہ کیا ہے کہ ایک روایت وہم ہے البتہ چودھوہ سے غلبہ یہ ہے کہ آپؐ نے ظہر مکہ میں پڑھی؟ یہاں اس کی وجوہ ذکر کریں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ آپؐ مکہ میں ظہر پڑھی ہوا مدینہ یا جوار کے لئے منیٰ میں دوبارہ پڑھی ہو۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے یہی تطبیق ذکر کی ہے۔ مگر یہ شافعیہ کے مذہب پر صحیح ہے کیوں کہ ان کے نزدیک فرض پڑھنے والے کا نفل پڑھنے والے کے پیچھے اقتدا کرنا صحیح ہے۔ اور مرقات میں ہے کہ نوویؒ کہتے ہیں ان دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زوال سے قبل طواف افاضہ کیا، پھر ظہر کی نماز اول وقت میں مکہ میں پڑھی، پھر منیٰ لوٹ کر صحابہ کرامؓ کی درخواست پر ان کے ساتھ وہاں دوبارہ پڑھی، گویا منیٰ میں آپؐ کی نماز نفل تھی، ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفل کو ایسی صورت پر محمول نہ کیا جائے جس کے جواز میں اختلاف ہو، بلکہ یہ تاویل کی جائے کہ آپؐ نے مکہ میں وہ گناہ طواف وقت ظہر میں ادا کیا اور منیٰ واپس آکر ظہر کی نماز پڑھی۔ یا یہ کہا جائے کہ دونوں روایتیں تعارض کی وجہ سے ساقط ہیں۔ پس ترجیح اس کو ہوگی کہ آپؐ نے مکہ میں ظہر پڑھی کہ وہاں افضل تھی۔ اور تنگی وقت اسکی مؤید ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طلوع آفتاب کے قبیل مزدلفہ سے چلے۔ منیٰ میں رمی کی سوانح تحریر کئے۔ ان کا گوشت پکایا کھایا۔ پھر مکہ گئے، طواف اور سعی کی۔ ظاہر ہے کہ ظہر کا وقت مکہ ہی میں آیا ہوگا۔ اور یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آپؐ بلا ضرورت اس کو مستحب وقت سے مؤخر کر دیتے،

فبات بہا

توجہ: پس رات و نماں رہے۔

اور یہاں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ واللہ اعلم! اضر اور اجزا میں ہے کہ ہمارے شیخ المشائخ شاہ ولی اللہ دہلوی نے "حجۃ اللہ" میں مکہ میں نماز کو ترجیح دی ہے۔ اسی طرح ابن ہمام نے فتح میں اس کو رائج کہا ہے۔ اور صاحب ہدایہ اور مبسوط نے صرف آپ کے منی میں نماز پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ اور مکہ میں نماز پڑھنے کی روایت ذکر نہیں کی۔ اور شراح لباب نے مکہ میں نماز پڑھنے کو ترجیح دی ہے۔ البتہ اس کے نسخوں میں جو ہمارے پاس ہیں طباعت کی غلطیاں بہت ہیں۔

حضرت ام سلمہؓ کا راکھ طواف کرنا | (حق) ابن حزم کہتے ہیں کہ مسلم کی روایت کے مطابق حضرت ام سلمہؓ نے اس دن اپنے اونٹ پر طواف کیا کیونکہ

وہ بیمار تھیں۔ مگر اس میں یہ اشکال ہے کہ اسی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سورہ طور کی قرات کرنے کا ذکر بھی ہے، دن کے وقت ام سلمہؓ نے آپ کی قرات کیسے سن لی؟ اس لئے یہ بعید ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ام سلمہؓ کا یہ طواف طواف وداع تھا جس کو شیخ ابن قیم نے دلائل کے ساتھ خوب بسط سے بیان کیا ہے، اور حافظ نے فتح میں اس کی تصریح کی ہے۔ اور نسائی کی روایت میں یہ مصرح ہے اور صاحب البدایہ والہنایہ نے بھی اس پر جو م کیا ہے اور کہہ ہے کہ یوم النحر کا لفظ راوی کی غلطی ہے مزید تفصیل اور جزیں

ایام تشریق کی راتیں منی میں گزارنے کا حکم | پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منی لوٹ آئے پس ایام تشریق کی راتیں منی میں رہے۔ زوال آفتاب کے

بعد جمرات کی رمی کرتے۔ کذا فی الزرقانی۔ پس رات و نماں رہے، جمہور کے قول کے مطابق منی میں رہنا واجب ہے۔ اور امام شافعی کا ایک قول اور امام احمد کی ایک روایت یہ ہے کہ یہ سنت ہے، یہی حنفیہ کا مذہب ہے۔ اور منی کی شب گزاری ترک کرنے پر دم کا واجب ہونا یا نہ ہونا اسی اختلاف پر مبنی ہے۔ اور رات رہنا واجب ہی ہوگا جب رات کا بیشتر حصہ نماں رہے۔ کذا فی الادلہ۔ اور ادجز میں ایک جگہ یہ تفصیل مذکور ہے کہ منی کی شب گزاری کے ترک پر دم واجب ہوگا یا صحت وغیرہ،

فلما زالت الشمس مشى الى الجمرات، فبدأ بالجمرۃ الاولى ثم رعى الثانية.
ترجمہ: پس جب آل ہوا تو جرات کی طرز چلے۔ پس جمرہ اولیٰ سے ابتدا کی، پھر دوسرے کی رمی کی

ایام تشریق میں رمی کا وقت | زوال آفتاب کا انتظار فرمایا۔ (حق) اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ائمہ
اربعہ کے نزدیک یوم النحر کے بعد کی رمی زوال سے پہلے جائز نہیں۔ اس کی تفصیل اوچتر میں ہے۔ اور اس
کی تفحیص حاشیہ لایع میں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "ایام تشریق کی رمی کا وقت باتفاق ائمہ زوال آفتاب کے بعد
ہے۔ البتہ ایام تشریق کے تیسرے دن کی رمی میں امام ابو حنیفہ کا اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس دن
کی رمی بطور استحسان۔ زوال سے قبل بھی صحیح ہے، امام اسحاق بھی اسی کے قائل ہیں، اور یہی ایک طاعت
امام احمد سے مروی ہے۔

رمی کا آخری وقت؟ پس وہ بالاتفاق ایام تشریق کا آخری دن ہے۔ اگرچہ وقت مستحب، وقت
کراہت، وقت بھواز اور در صورت تاخیر و وجوب دم میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل ان کی کتب فروع
سے اوچتر میں نقل کی گئی ہے۔ اور اس کا خلاصہ میرے حاشیہ بدل میں اس طرح ہے: "ائمہ کے نزدیک
ایام تشریق کی رمی زوال سے قبل بطور ادا جائز نہیں۔ البتہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک صرف یوم نحر
ثانی اس سے مستثنیٰ ہے۔ پھر امام شافعی، امام احمد اور صاحبین کے نزدیک چوتھے دن کے غروب تک
رمی کر سکتا ہے، اس کیلئے نہ کوئی معین وقت ہے نہ دم واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ہر دن کی
رمی کا وقت مستحب غروب تک ہے۔ اس کے بعد طلوع فجر تک وقت اباحت ہے۔ غیر معذور کو اس
وقت رمی کرنا مکروہ ہے۔ مگر دم واجب نہیں۔ اور طلوع فجر کے بعد چوتھے دن کے غروب تک قضا
ہے، جس میں دم واجب ہوگا۔ اور امام مالک کے نزدیک ہر دن کی رمی کا وقت ادا غروب تک ہے۔
اور اگر رات کو رمی کی تو دم واجب ہوگا۔" ۱۷ اور یوم نحر کی رمی کے وقت میں اختلاف اپنی جگہ گذر چکا ہے۔

پس جب زوال ہوا تو جمرات کی طرف پیدل چلے اور سوار نہیں ہوئے۔ قبل ازیں رمی جمرہ عقبہ کے
کے بیان میں یہ بحث گذر چکی ہے کہ پیدل رمی کرنا افضل ہے یا سوار ہو کر۔ پس جمرہ اولیٰ سے ابتدا کی
اور اس کے بعد دیر تک دعا فرماتے رہے، جو سورۃ بقرہ کی مقدار کے برابر تھی، پھر دوسرے کی رمی کی۔
یہاں بھی اسی طرح طویل دعا فرمائی جس طرح جمرہ اولیٰ کے پاس کی تھی۔ اور زوال ثانی میں ہے کہ جمرہ اولیٰ
اور جمرہ ثانیہ کے پاس دیر تک ٹھہرے۔ البتہ پہلے کے پاس زیادہ ٹھہرے۔ اور ان دونوں جمروں کے

شم دخی الثالثة .

پھر میرے کی رمی کی ۔

پاس کتنی دیر ٹھہرے؟ اس میں سلف کا اختلاف ہے جس کی تفصیل حاشیہ طبع میں اور جز سے نقل کی گئی ہے۔ اور اس میں ہے کہ موفی کہتے ہیں: اگر وقوف اور دعا کو ترک کر دیا تو سنت کو ترک کر دیا مگر اس کے ذمہ کوئی چیز لازم نہیں ہوگی۔ اس سلسلہ میں امام ثوریؒ کے علاوہ کسی کا اختلاف معلوم نہیں۔ اور امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ کچھ غلہ بطور فدیہ دے۔ اور اگر دم دیدے تو میرے نزدیک بہت ہی اچھا ہوگا۔ اور او جز میں ہے کہ جمرہ اولیٰ و ثانیہ کے پاس قیام کرنا بخاری شریف میں بروایت سالم بن عبد اللہ عن ابیہ مرفوعاً واربعہ۔ اور ابو داؤد میں حضرت عائشہؓ کی حدیث میں آیا ہے، اور حافظ نے ابن قدامہ کے حوالے سے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اور ائمہ اربعہ کی کتابوں میں پہلے دو جہروں کے پاس طویل قیام کی تصریح موجود ہے، جیسا کہ او جز میں ائمہ اربعہ کی فقہی کتابوں سے عبارتیں نقل کی گئی ہیں۔

اور یہاں ایک اور اختلافی مسئلہ ہے کہ انی دونوں جہروں **ان دو جہروں کے پاس دعا میں ہاتھ اٹھانا** کے پاس دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھائے جائیں یا نہیں؟ او جز میں اس پر بہت ہی تفصیل سے کلام کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ ابن منذر کہتے ہیں: مجھے معلوم نہیں کہ جمرہ کے پاس ہاتھ اٹھانے سے کسی نے انکار کیا ہو۔ بخیر اس کے جواب میں قاسم نے امام مالک سے نقل کیا ہے: ائمہ طویل بحث او جز میں دیکھ لی جائے۔ اس میں یہ اختلاف بھی ذکر کیا ہے کہ اس موقع پر اسی طرح ہاتھ اٹھائے جائیں جس طرح دعا میں اٹھائے جاتے ہیں یا قبلہ کی طرف؟

کیا تینوں جہرات کی رمی میں ترتیب واجب ہے پھر میرے کی رمی کا تینوں جہرات کی رمی میں ترتیب واجب یا نہیں؟ اس میں اختلاف چنانچہ موفی کہتے ہیں: ان جہرات میں ترتیب واجب ہے اگر ترتیب الٹ دی اور پہلے جمرہ عقبہ کی رمی کی پھر ثانیہ کی اور پھر اولیٰ کی تو صرف اولیٰ کی رمی صحیح ہوگی۔ امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے اور امام شافعی، اور امام مالک بھی اسی کے قائل ہیں۔ اور حسن اور عطاء کہتے ہیں کہ ترتیب واجب نہیں۔ اور یہی امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر ترتیب الٹ ڈالی تو اعادہ کرے۔ اور اگر اعادہ نہیں کیا تب بھی رمی صحیح ہوگی۔

ولم یقف عندہ

ترجمہ: اور اس کے پاس نہیں ٹھہرے۔

اور اس کے پاس نہیں ٹھہرے اور اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے جیسا
حجرہ عقبہ کے پاس ٹھہرے | کہ اوجز میں محلی سے نقل کیا ہے اور موقوف کہتے ہیں: اس کے پاس ٹھہرنا منسوخ

نہیں کیونکہ ابن عمر اور ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس نہیں ٹھہرے تھے۔
 اسی طرح ام جندبہؓ اور عائشہؓ کی روایت میں بھی یہی مضمون آیا ہے۔ اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں ترجمہ
 الباب قائم کیا: باب من رمی حجرۃ العقبة ولم یقف۔ و حجرہ عقبہ کی رمی کے بعد نہ ٹھہرنے کا بیان، حافظ فتح میں
 فرماتے ہیں: کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں، میں کہتا ہوں کہ اجماع کی حکایت مشکل ہے کیونکہ حصن میں روایت
 ابن ابی شیبہ حسن بھری سے مرفوعہ مروی ہے کہ تمام جہرات کے پاس دعا کرے اور کسی کی تعین نہ کرے: "الایہ کہ کہا
 جائے کہ یہ قول شاذ ہے اس لئے علمائے کرام کے نزدیک لائق التفات نہیں۔ یا یہ کہا جائے کہ اس قول سے مراد
 وہ ہے جو بلا علی قاری نے شرح لباب میں ذکر کیا ہے کہ تمام ایام رمی میں حجرہ عقبہ کے پاس دعا کے لئے
 نہ ٹھہرے بلکہ بغیر ٹھہرنے کے دعا کر لے۔ اور محلی میں ہے کہ پہلے دو جہروں کے پاس ٹھہرے اور حجرہ عقبہ
 کے پاس نہ ٹھہرنے میں حکمت یہ ہے کہ دعا و وسط عبادت میں واقع ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ حجرہ عقبہ
 لوگوں کی گذر گاہ میں واقع ہے اس لئے وہاں ٹھہرنے سے لوگوں کا راستہ بند ہو جائے گا۔ عموماً اہل علم
 نے دوسری وجہ کو اختیار کیا ہے۔ اور حافظ ابن قیمؒ اور صاحب ہدایہ نے پہلی وجہ یعنی دعا کے وسط عبادت میں
 واقع ہونے کی حکمت کو جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں ابن حجر کا یہ قول نقل کیا ہے
 کہ "حجرہ عقبہ کے پاس نہ ٹھہرے نہ یوم نحر میں نہ اس کے بعد۔ کیونکہ اس کی جگہ تنگ ہے۔ ٹھہرنے سے دوسرے
 کو تکلیف ہوگی لیکن یہ تعلیل زمانہ گذشتہ کے اعتبار سے ہے البتہ اگر یہ علت ذکر کی جائے کہ اس سے فارغ
 ہو کر نہ ٹھہرنے میں قبولیت کی نیک فالی ہے۔ تو بعید نہ ہوگا، اھ حاصل یہ کہ رمی عقبہ کے بعد نہ ٹھہرنا روایات
 مرفوعہ و موقوفہ سے ثابت اور ائمہ اربعہ کے نزدیک اجماعی ہے۔ البتہ اس کے سبب میں اقوال مختلف ہیں،
 بعض کے نزدیک دعا کا وسط عبادت میں واقع ہونا اس کا سبب ہے۔ بعض کے نزدیک جگہ کا تنگ ہونا
 اور بعض کے نزدیک قبولیت کی نیک فالی۔ کذا فی الاوجز۔

دقلت) وھل کان یانی مکة کل لیلة۔

توجہ: (رث) اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (منیٰ سے) ہر رات مکہ آیا کرتے تھے؟۔

آنحضرت نماز ظہر سے پہلے رمی کرتے تھے یا بعد میں؟ (ق) آنحضرت نماز ظہر سے پہلے رمی کرتے تھے

یا بعد میں؟ غالب ظن یہ ہے کہ ظہر سے قبل کرتے تھے۔ کذا فی الہدیٰ — اور ابن قیمؒ نے اس کے وجوہ ترجیح کو بسط سے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج میں ٹھہر کر دعا کرنے کے چھ مواقع پیش آئے۔ اول: صفا پر۔ دوم: مردہ پر۔ سوم: عرفہ میں۔ چہارم: مزدلفہ میں۔ پنجم: جمرہ اولیٰ کے پاس۔ ششم: جمرہ ثانیہ کے پاس۔

(رث) اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (منیٰ سے) ہر رات مکہ آیا

منیٰ کی راتوں میں ہر رات مکہ آیا کرتے تھے؟ حافظ ابن قیمؒ نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور اس کو اولام میں شمار کیا ہے۔ اور موفق کہتے ہیں: بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایام منیٰ میں ہر دن بیت اللہ کی زیارت کیا کرے اور بعض اس کو ترجیح دیتے ہیں کہ مکہ نہ آئے بلکہ منیٰ ہی میں مقیم رہے کیونکہ یہ منیٰ کے دن ہیں اور ابو عبد اللہ امام احمدؒ نے ابن عباسؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات مکہ جایا کرتے تھے: "اھ حضرت ابن عباسؓ کی یہ حدیث امام بخاری نے اپنی صحیح میں تعلیقاً ذکر کر دیا جاتا ہے کے لفظ سے ذکر کیا ہے۔ حافظ کہتے ہیں کہ اس کو طبرانی نے بسند متصل روایت کیا ہے: "اس کی تنقیح پر مفصل کلام کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "اور ایک مرسل روایت اس کی مؤید ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے طاؤس کے والد سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات بیت اللہ جاتے تھے: "اھ میں کہتا ہوں کہ امام سرخسیؒ کا رجحان اسی کی طرف ہے اور حافظ کا بھی۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رات تک تاخیر طواف کی حدیث کے ذیل میں قریب ہی گند چکا ہے۔

(ق) "اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں دو خطبے دیے۔ ایک

وسط ایام تشریق کا خطبہ | خطبہ یوم نحر کو۔ جو پہلے گند چکا ہے۔ اور دوسرا خطبہ وسط ایام تشریق میں۔ پس کہا گیا ہے کہ یہ یوم النحر سے اگلے دن تھا: "اھ رث) خفیہ اور مالکیہ اسی کے قائل ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بارہ تاریخ تھی جیسا کہ یہ شافعیہ اور حنابلہ کا قول ہے۔ اور خطبات حج میں ائمہ کا اختلاف ساتویں تاریخ کے خطبہ کی بحث میں گند چکا ہے اور خفیہ اور ان کے موافقین نے اراذی الحج کے خطبے پر ابو داؤد کی حدیث سے

استدلال کیا ہے کہ سراد بنت نبہان کہتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم الرؤس کو خطبہ دیا: اور حافظ ابن قیم کہتے ہیں کہ یوم الرؤس بالانفاق یوم النحر سے اگلا دن ہے: اور زرقانی کہتے ہیں کہ یوم الرؤس: بضماء و ہمزہ۔ یہ گیارہ ذی الحجہ کا نام ہے کیونکہ لوگوں کا معمول تھا کہ یوم النحر کو قربانیاں کیا کرتے، اور اس رات قربانی کے سردوں کو پکاتے اور صبح سویرے اٹھ کر کھایا کرتے تھے: اھ اور شرح فہامک نووی میں روایت طبقات ابن سعد عمرو بن یثربی سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کے اگلے دن ظہر کے بعد خطبہ دیا۔ جیسا کہ میرے حاشیہ بدل میں ہے۔ اور البدایہ والنہایہ میں یوم النحر کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کے بعد کا دن یوم النحر کہلاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس میں قرار پکڑتے تھے۔ اور اس کو یوم الرؤس بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں قربانی کے سر پکانے کا معمول تھا۔ یہ ایام تشریق کا پہلا دن ہے اور ایام تشریق کے دوسرے دن ۱۲ ذی الحجہ کو یوم النحر الاول کہتے ہیں، کیونکہ اس دن منیٰ سے رخصت ہوا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اسی دن کو یوم الرؤس کہا جاتا ہے: اھ میں کہتا ہوں کہ روایات میں جو آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وسط ایام تشریق میں خطبہ دیا ہے اس سے ۱۱ ذی الحجہ مراد ہے کیونکہ سراد بنت نبہان کی روایت میں، جو ابھی ابوداؤد کے حوالے سے قریب ہی گندی ہے۔ یہ لفظ ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یوم الرؤس میں خطبہ دیا، پس فرمایا کہ یہ کونسا دن ہے؟ ہم نے عرض کیا: اللہ ورسولہ اعلم۔ فرمایا: کیا یہ وسط ایام تشریق نہیں؟ الخ اور البدایہ والنہایہ میں ہے کہ ابن حزم کہتے ہیں: ”روایت میں آتا ہے کہ آپ نے یوم الرؤس کو خطبہ دیا۔ اور اہل مکہ سے بلا اختلاف منقول ہے کہ یہ یوم النحر سے اگلا دن ہے اور یہ بھی آتا ہے کہ آپ نے وسط ایام تشریق میں خطبہ دیا، پس احتمال ہے کہ اوسط بمعنی اشرف ہو، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا ۖ اٰتٰہی۔

حق اور امام بیہقی نے حضرت ابن عمر سے ذکر کیا ہے کہ آنحضرت کا قرب صال کو فحوس کر لینا یہ سورۃ: اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وسط ایام تشریق میں نازل ہوئی اور آپ نے جانا کہ یہ وداع کا پیغام ہے دش، اور البدایہ والنہایہ میں اس کے حوادث میں ہے: ”اس سال کا حادثہ عظمیٰ اور فاجعہ کبریٰ سید اولاد آدم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ ہے۔ اور اسی ذیل میں آیت کریمہ: الْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمُ الْاٰیۃ عَزَّ وَجَلَّ عرفہ کی شام کو نازل ہوئی اور ہم نے بسند جمید روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطاب

(قال) واستأذنه العباس رضي الله تعالى عنه ان يميت بمكة - واستأذنه رعاء الابل
توجه: (رق) اور حضرت عباس رضي الله عنه نے آپ سے مکہ میں رات رہنے کی اجازت چاہی۔ اور اونٹ
چرانے والوں نے بھی آپ کی اجازت چاہی۔

روپڑ سے رونے کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ کمال کے بعد صرف نقصان رہ جاتا ہے۔ گویا ان کو محسوس
ہو گیا کہ اس آیت میں وصال نبوی کی خبر ہے۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرف اشارہ فرمایا،
چنانچہ مسلم میں حضرت جابر سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ عقبہ کے پاس کھڑے ہوئے اور
فرمایا: ”مجھ سے اپنے مناسک حاصل کرو، شاید میں اس سال کے بعد حج نہیں کروں گا“ اور حافظ بزار اور
حافظ بیہقی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ جب یہ سورۃ اذ اجاء نصر اللہ والفتح ”ایام تشریق میں
نازل ہوئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہچانا کہ یہ پیغام وداع ہے، پس اپنی نافۃ تصور کی تیاری کا حکم فرمایا۔
پس وہ تباہی لگئی۔ اس کے بعد اس دن کے خطبہ کا ذکر کیا۔ اسی طرح جب عمر بن خطابؓ نے ابن عباسؓ
سے اس سورۃ کی تفسیر دریافت کی تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی
خبر ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں بھی اس سے ہی سمجھتا ہوں جو کچھ تم نے سمجھا ہے، جیسا کہ بخاری
کی متعدد روایات میں مروی ہے، الخ میں کہتا ہوں کہ اس امر میں روایات مختلف ہیں کہ یہ سورۃ کس وقت اور
کس جگہ نازل ہوئی، جیسا کہ خطبہ یوم النحر میں گذر چکا۔

(رق) اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سقایت زمزم کی
حضرت عباسؓ کا مکہ میں کعبہ پہنچنے کی اجازت مانگنا
خاطر آپ سے منی کی راتیں مکہ میں رہنے کی اجازت چاہی۔

چنانچہ آپ نے ان کو اجازت دے دی۔ یہ اختلاف قریب ہی گذر چکا ہے کہ منی میں رات رہنا واجب
ہے یا سنت؟ اور حنفیہ کا مسلک ہے کہ سنت ہے، اس لئے حضرت عباسؓ اور دیگر حضرات کے
برک ہیت میں ان کے نزدیک کوئی اشکال نہیں۔ اور جو حضرات وجوب کے قائل ہیں۔ ان کے مسلک
پر اشکال لازم آتا ہے، جس کا بیان ابھی آتا ہے۔

اور اونٹوں کے چرواہوں کا منی سے
گذرانے کی اجازت چاہی۔ چنانچہ آپ نے ان کو بھی اجازت
بابرہات گذرانے کی اجازت طلب کرنا
مرحمت فرمائی۔

اور اوجز میں ہے کہ یہ اختلاف تو پہلے گزر چکا
 کیا یہ اجازت نامہ مغذروں کو شامل ہے | ہے کہ منی میں رات نہاد واجب ہے یا سنت، لیکن

اس پر اتفاق ہے کہ چرواہوں کو یہ معاف ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ معافی صرف چرواہوں
 اور زمزم پلانے والوں سے مخصوص ہے یا تمام اصحاب عذر کو شامل ہے؟ اور امام بخاری کا ایک
 ترجمہ الباب یہ ہے، باب ہل یبیت اصحاب السقایہ او غیرہم بمکۃ لیلیٰ منیٰ، حافظ فرماتے ہیں کہ
 ”او غیرہم“ سے مقصود وہ لوگ ہیں جن کو مرض یا مشغل کا عذر ہو مثلاً لکڑہارے اور چرواہے۔ رہا
 یہ سوال کہ کیا سقایت کی اجازت حضرت عباسؓ کے ساتھ خاص ہے یا اس کا مدار ان اوصاف پر
 جو اس حکم میں معتبر ہیں؟ پس بعض کا قول ہے کہ یہ حکم صرف حضرت عباسؓ سے خاص ہے، یہ تو
 جود ہے، اور بعض کا قول ہے کہ اس حکم میں حضرت عباسؓ کے ساتھ ان کی آل، اور بقول بعض ان کی
 قوم بنو ہاشم بھی داخل ہیں۔ اور بعض کا قول ہے کہ ہر وہ شخص جو سقایت کا محتاج ہو اس کے لئے
 یہی حکم ہے۔ اور صحیح یہی ہے کہ حکم کو عام رکھا جائے۔ اور اس کی علت پینے والوں کے لئے پانی
 جمع کرنا ہے۔ رہا یہ سوال کہ کیا یہ حکم صرف پانی کے ساتھ مخصوص ہے یا کھانا وغیرہ، جو اس کے ہم
 معنی ہیں، وہ بھی اسی کے ساتھ ملحق ہیں۔ یہ محل احتمال ہے اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ صرف
 چرواہے اہل سقایت کے حکم میں ہیں۔ اور یہی امام احمد کا قول ہے، اسی قول کو یعنی اس حکم
 کے اہل سقایت اور چرواہوں کے ساتھ مخصوص ہونے کو ابن منذر نے اختیار کیا ہے اور امام
 احمد سے معروف روایت یہ ہے کہ یہ حکم صرف حضرت عباسؓ کے لئے مخصوص ہے، اور مالکیہ کہتے
 ہیں کہ چرواہوں کے علاوہ باقی سب امور میں دم واجب ہوگا۔ انتہی مختصر اسن الاوجز۔

اور منی میں رات پینے کے مسئلہ میں مذاہب کا خلاصہ یہ ہے کہ شافعیہ، حنابلہ، اور مالکیہ کے نزدیک چرواہوں
 اور زمزم نکالنے والوں کے لئے اس کا ترک جائز ہے۔ پھر مالکیہ کی ایک جماعت۔ درویر
 وغیرہ کا قول یہ ہے کہ رخصت صرف اونٹوں کے چرواہوں کے ساتھ مخصوص ہے، اور شافعیہ
 کی ایک جماعت مثلاً ابو اسحق کی المہذب، اور امام غزالی کی الوجیز سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔
 اور مالکیہ کی ایک جماعت مثلاً ابن شاش، ابن حاجب اور ابن عوف کا قول ہے کہ یہ اجازت
 چرواہوں کے علاوہ دوسروں کو بھی عام ہے، نزد قافی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور کیا اہل

و لم يتعجل فی یومین

ترجمہ: اور آپ نے دو دن میں دمک واپس آنے میں تعجل نہیں کی۔

اعدار مثلاً مریض اور وہ شخص جس کے اہل ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو وغیرہ کا حکم بھی یہی ہے۔ اس میں شافیہ کی دو روایتیں ہیں، دونوں میں صحیح تر روایت اثبات میں ہے۔ اور یہی خیالہ کا قول ہے۔ اور دوسری کا جواب نفی میں ہے، اور یہی مالکیہ کا قول ہے۔ اور کیا یہ حکم حضرت عباسؓ کے ساتھ خاص ہے؟ رافعی کہتے ہیں کہ اہل ستفایت کی رخصت عباسیہ کے ساتھ خاص نہیں کیونکہ معنی رطلت حکم ان کے ساتھ دوسروں کو بھی شامل ہے، اور امام مالک و ابو حنیفہ سے مروی ہے کہ یہ اولاد عباس کے ساتھ خاص ہے۔ اور یہی ایک وجہ روایت ہمارے اصحاب کے لئے بھی ہے اور بعض نبولہ شمس سے اختصاص کو نقل کرتے ہیں۔ کذا فی الاوجز مع زیادة عن غیرہ۔

رق، اور آپ نے اونٹوں کے چرواہوں کو چرواہوں کو دو دن کی رمی جمع کر نیکی اجازت رخصت دی کہ وہ یوم نحر کی رمی کر لیں اور یوم نحر کے بعد دو دن کی رمی ایک ہی دن کر لیا کریں۔ الخ دش شیخ ابن قیم کے کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ چرواہوں کو اختیار تھا کہ چاہے دو دن کی رمی پہلے دن کر لیا کریں۔ یا دوسرے دن۔ یعنی جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں کا اختیار تھا۔ اس سلسلہ میں روایات حدیث مختلف ہیں۔ جیسا کہ ترمذی، ابو داؤد، مؤطا مالک، اور موطا محمد میں ہے۔ اور بادل، کوکب اور اوجز میں ان روایات کی اور اقوال ائمہ کی توجہ پر تفصیل سے ذکر کی گئی ہے۔ زیادہ تفصیل اوجز میں ہے۔ اور اس کا خلاصہ میرے حاشیہ بادل میں ہے کہ ابن حزم وغیرہ کا قول ہے کہ انہیں جمع تقدیم و تاخیر دونوں کا اختیار ہے۔ اور ائمہ سنیہ کا اتفاق ہے کہ جمع تقدیم جائز نہیں اور جمع تاخیر کی صورت میں امام ابو حنیفہ، اور امام مالک کے نزدیک لازم آئیگا۔ باقی چار ائمہ کے نزدیک نہیں انتہی۔

اور آپ نے دو دن میں دمک واپس آنے میں،
انحصار نے ایام تشریق کے تیسروں کی رمی بھی فرمائی اتعجل نہیں کی بلکہ میرے دن تک تاخیر فرمائی،
یہاں تک کہ ایام تشریق کی رمی بھی پوری فرمائی۔ اور ائمہ کا اجماع ہے کہ جو شخص بارہ تاریخ کو متی سے واپس آنا چاہے اسکا ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے تپس جس نے دو دن میں دمک آنے میں تعجل کی اس

و افاض یوم الثلاثاء۔

ترجمہ: اور منگل کے دن منی سے چلے۔

کے ذمہ کچھ گناہ نہیں۔ اور جس نے تیسرے دن (تاخیر کی اس کے ذمہ بھی کچھ گناہ نہیں) الایہ۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ امام جلدی آئے۔ رہے امام کے علاوہ دوسرے لوگ؟ تو آفاقی کیلئے جلدی آجانا جائز ہے اور اہل مکہ کے بارے میں امام مالک کے اقوال مختلف ہیں: ایک قول یہ کہ اس کے لئے مناسب نہیں۔ اور ایک قول یہ کہ وہ آفاقی کی مثل ہے۔ اور اجزہ میں ہے کہ موفق کہتے ہیں: اہل علم کا اجماع ہے کہ جو شخص منی سے نکل کر حرم سے رخصت ہونا چاہے اور اسے مکہ میں نہ رہنا ہو وہ ایام تشریق کے دوسرے دن زوال کے بعد منی سے جاسکتا ہے۔ اور اگر مکہ میں رہنا چاہے تو امام احمد فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ جو شخص منی سے بارہ تاریخ کو آجائے وہ مکہ میں ٹھہرے اور نو وچھ اپنے مناسک میں کہتے ہیں بارہ تاریخ کو منی سے آجانا اگرچہ جائز ہے لیکن تیسرے دن تک تاخیر افضل ہے: ابن حجر کی اس کی شرح میں کہتے ہیں کہ تاخیر افضل ہے الایہ کہ کوئی عذر ہو اور اس میں امام اور غیر امام یکساں ہیں۔ اور احکام سلطانیہ میں ہے کہ امام کے لئے نفراول جائز نہیں۔ کیونکہ وہ متبوع ہو۔ اس کو مناسک پورے کرنے کے بعد ہی آنا ہوگا: اھ اور ہدایہ میں ہے کہ پہلے دن ۱۲ تاریخ کو بھی آسکتا ہے، مگر افضل یہ ہے کہ ۱۳ تک ٹھہرے: نیز اجزہ میں ہے کہ موفق کہتے ہیں: اگر ۱۲ تاریخ کو منی سے نکلنے سے قبل آفتاب غروب ہو جائے تو نہ نکلے، خواہ کوچ کر چکا تھا یا اپنی جگہ میں مقیم تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کے لئے نکلنا جائز نہیں۔ یہی قول امام مالکؒ و امام شافعیؒ کا ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تیسرے دن کی صبح صادق طلوع ہونے سے پہلے جاسکتا ہے:

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیسرے دن کی رسی کر کے

منی سے محصب کی طرف روانگی | منگل کے دن ظہر کے بعد منی سے چلے الہدیٰ میں اسی طرح ہے

اور قطلائی نے مواہب میں اس کی پیروی کی ہے۔ اور مراد اس سے زوال کے بعد اور نماز ظہر سے پہلے چلنا ہے۔ صحیح بخاری کا ترجمہ الباب ہے: باب من صلی العصر یوم النفر بالبطح، امام بخاری نے اس میں عبدالغفر بن ریف کی حدیث نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النفر پر ذی الحجہ کی نماز ظہر کہاں پڑھی؟ فرمایا میں نے پوچھا کہ منی سے واپسی کے

الی النحصب

ترجمہ: اور محصب پہنچے۔

دن عصر کہاں پڑھی تھی؟ فرمایا: بطح میں۔ اور تم وہی کرو جو تمہارے امراء کریں۔ اس کے بعد حضرت انسؓ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر، عصر، مغرب، عشاء محصب میں پڑھیں اور تھوڑا سا سوئے بھی۔ اور البدایہ والنہایہ سے ظاہر ہے کہ ان دونوں روایتوں میں تعارض ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں: منگل کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر منیٰ سے چلے، محصب میں فروکش ہوئے اور وہاں عصر پڑھی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے (بہاں پہلی حدیث ذکر کی)۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ آپؐ نے یوم النفر کی نماز ظہر بطح میں پڑھی۔ وائد اعلم، یہاں دوسری حدیث کو ذکر کیا۔ اور حافظ فرماتے ہیں کہ تراوی کا یہ بیان کہ آپؐ نے ظہر بطح میں پڑھی اس امر کے منافی نہیں کہ آپؐ نے زوال کے بعد رمی کی۔ چنانچہ آپؐ نے رمی کی، پھر کوچ کیا، محصب پہنچے پس یہاں ظہر پڑھی۔ اھ اور محصب پہنچے۔ محصب: بضم میم، فتح حائے مہملہ وصاد مہملہ وٹھنہ و بائے موحده۔ اس کو بطح اور بطحاء بھی کہتے ہیں، کدانی الزرقانی۔ اور محجم البلدان میں ہے کہ اس کو ابطح، بطحا اور خیف بنی کنانہ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اھ اور نووی کہتے ہیں کہ محصب۔ حصار۔ بطح، بطحاء اور خیف بنی کنانہ ایک ہی جگہ کے نام ہیں۔ اھ اور اس میں اختلاف ہے کہ ڈوطوی، بھی محصب ہی کا نام ہے یا کسی جگہ کا؟ جیسا کہ حاشیہ لایع میں ہے، اور اس میں قسطلانی سے نقل کیا ہے کہ یہ ایک وسیع جگہ کا نام ہے جو مکہ اور منیٰ کے درمیان ہے، منیٰ سے زیادہ قریب ہے اور اس کے حدود دونوں پہاڑوں کے مابین مقبرہ تک ہیں۔

اس میں علماء کے دو قول ہیں کہ محصب میں اترنا سنت ہے یا یہ محصب میں اترنا سنت ہے یا نہیں؟ اتفاقاً منزل تھی؟ اور جز میں اس کو خوب بسط سے بیان کیا ہے۔

ائمہ اربعہ اور جمہور نے پہلی شق کو اختیار کیا ہے۔ اگرچہ ان کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ سنت ہے یا استحباب؟ اور امام مالکؒ مقتدی اور غیر مقتدی کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مقتدی کے حق میں ہوگا کہ ہے اور غیر مقتدی کے حق میں غیر ہوگا۔ اور بعض سلف نے قول ثانی کو اختیار کیا ہے،

ان کی دلیل سند احمد میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ اللہ کی قسم! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں صرف میری وجہ سے فروکش ہوئے تھے۔ یعنی حضرت عائشہؓ کے عمرہ کی خاطر۔ اور ایک روایت میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس لئے ٹھہرے کہ یہاں سے مدینہ کی واپسی آپ کے لئے آسان تھی۔ یہ

حدیث بخاری شریف "باب المحصب" میں ہے۔ اور جمہور کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ سے چلنے سے قبل ہی یہاں کے قیام سے آگاہ فرمایا تھا۔ چنانچہ اوجزیں ہے کہ صحاح ستہ میں حضرت اسامہؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کل کہاں قیام ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل انشاء اللہ ہم خیف بنی کنانہ یعنی محصب میں اتریں گے، جہاں کفار نے کفر کا عہد و پیمان کیا تھا: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہاں اترنا قصد تھا، اور پہلے ہی سے اس کی نیت تھی۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ان کے اپنے فہم پر مبنی ہے، علاوہ ازیں اس جگہ کا واپسی کے لئے مناسب ہونا یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمر کی مصلحت اس امر کے منافی نہیں کہ کسی متقل وجہ کی بنا پر آپؐ نے یہاں اترنے کا قصد کیا ہو اسی طرح حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی اس کے منافی نہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دمحصب میں خیمہ لگانے کا حکم نہیں فرمایا تھا، بس میں نے از خود دہاں خیمہ لگا دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ اتر گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد چونکہ یہاں اترنے کا تھا اس لئے یہی امر حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کے قلب پر وارد ہوا، یہ ایک ایسا امر ہے جو اہل حقائق سے مخفی نہیں، نہ اس کا انکار کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ یہ اہل قلوب کے دہاں معروف چیز ہے۔ مزید یہ کہ اگرچہ خیمہ آپؐ کے حکم سے نصب نہیں کیا گیا، مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں نزول فرمایا تو یہاں کا نزول سنت ٹھہرا، بالخصوص جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین کا عمل بھی یہی رہا۔ جیسا کہ حاشیہ لامع میں ہے۔ اور اس میں ہدایہ سے نقل کیا ہے کہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نزول بالقصد تھا۔ یہی صحیح تر ہے لہذا یہاں اترنا سنت ہوگا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا: کل ہم خیف بنی کنانہ میں فروکش ہوں گے اگرچہ میں معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں اس مقصد کے لئے نزول فرمایا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے لطف احسان کا جو معاملہ فرمایا، مشرکین کے سامنے اس کا اظہار کیا جائے۔ اس لئے ریل کی طرح یہ بھی سنت ہوا: اندونوی کہتے ہیں جمہور کا مذہب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کی اقتلا میں یہاں کا نزول مستحب ہے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ اس کے ترک سے کچھ لازم نہیں آتا: احد اور شیخ قدس سرہ کو کب میں فرماتے ہیں: "یہاں کا نزول حج سے متعلق نہیں بلکہ ایک متقل سنت ہے اس لئے جو حضرات فرماتے ہیں کہ محصب میں اترنے کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حج سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اور جہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ سنت ہے دہاں مراد یہ ہے کہ حج سے الگ ایک متقل اور صحیح سنت

فنزل هناك. ثم نهض الى مكة فطاف للوداع

ترجمہ: پس وہاں فروکش ہوئے۔ پھر مکہ کی طرف چلے اور طواف وداع کیا۔

اور کوکب کے حاشیہ میں ہے کہ حافظ لکھتے: "حاصل یہ کہ جن حضرات نے اس کے سنت ہونے کی نفی کی مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباسؓ ان کی مراد یہ ہے کہ یہ مناسک میں سے نہیں۔ لہذا اس کے ترک سے کوئی چیز لازم نہیں۔ اور جن حضرات نے اس کو سنت کہا ہے، جیسے ابن عمر رضی اللہ عنہ "ان کی مراد یہ ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی اقتداء کے عموم میں داخل ہے" اھ

پس وہاں بابوں کے بنے ہوئے خیمے میں فروکش ہوئے جیسا کہ زرقانی میں ہے، یہ خیمہ آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابورافعؓ نے نصب کیا تھا، ان کے نام میں دس قول ہیں ان میں سے "اسلم" زیادہ مشہور ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان کی نگرانی پر مامور تھے۔ یہ فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں خیمہ لگانے کا حکم نہیں فرمایا تھا الخ جیسا کہ امام سلم اور ابو داؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر سے عشاء تک کی نمازیں **مُحَصَّبٌ** میں چار نمازوں کا استحباب | پڑھیں اور قدرے بیند کی، ان کے اربعہ کا اجماع ہے کہ یہاں چار

نمازیں پڑھنا مستحب ہے، جیسا کہ وجہ میں مفصل ذکر کیا ہے لیکن درود پر کہتے ہیں: "چار نمازوں کا یہاں مستحب ہونا جب ہے جبکہ اسے جلدی نہ ہو۔ اور واپسی جمعہ کے دن نہ ہوئی ہو، ورنہ محصب میں اتنا نماز مستحب نہیں۔ اور یہاں ظہر کی نماز کے مندوب ہونے کا موقع اس وقت ہے جب کہ تنگی وقت سے پہلے یہاں پہنچ جائے" اور شرح مناسک نوویؒ میں ہے: "ظہر کی نماز منیٰ میں نہ پڑھے بلکہ محصب کی منزل میں یا کسی دوسری جگہ پڑھے۔ اور اگر منیٰ میں پڑھ لی تب بھی جائز ہے۔ مگر افضل کو ترک کر دیا" اھ اور وجہ میں محل سے نقل کیا ہے کہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: "اور ایک گھڑی کے لئے محصب میں اترے" اھ۔ اور فتح القدیر میں ہے: "اور اس جگہ ظہر سے عشاء تک کی نمازیں پڑھے۔ اور تھوڑی سی بیند کرے، پھر مکہ میں داخل ہو" اھ اس سے ظاہر ہوا کہ ایک گھڑی ٹھہرنے سے اصل سنت ادا ہو جائے گی۔ مگر کمال وہ ہے جو کمال (ابن ہمام) نے ذکر کیا ہے: "اھ۔

پھر مکہ کی طرف چلے اور رات کو سحری کے وقت طواف وداع کیا، زرقانی **حضور کا طواف وداع کرنا** کہتے ہیں کہ وداع بفتح واو اور ان کو طواف صدہ۔ بفتح صاد۔ کا نام بھی دیا

جاتا ہے۔ کہ اس میں بیت اللہ کی طرف واپسی ہوتی ہے اور اوجز میں ہے: الوداع بفتح واو۔ سلام اور کلام کے وزن پر تودیل درخصص کرنے کا نام ہے اور ابن نجیم کہتے ہیں کہ اس کے پانچ نام ہیں۔ طواف صدر۔ طواف وداع۔ طواف افاضہ۔ طواف واجب، طواف آخر عبد البیتؑ۔ اور صدر کے معنی رجوع کے ہیں مگر اس رجوع سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ہمارے نزدیک افعال حج سے رجوع مراد ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک اپنے گھر کی طرف رجوع مراد ہے۔ اس پر یہ مسئلہ مبنی ہے کہ اگر طواف صدر کے بعد کسی ضرورت کے لئے مکہ میں ٹھہر گیا تو ہمارے نزدیک اعافہ لازم نہیں۔ اور ان کے نزدیک لازم ہے۔ اور اس طواف کے حکم میں دو قول ہیں شیعہ قول یہ ہے کہ واجب ہے۔ اور یہی اکثر ثلاثہ کا قول ہے اور دوسرا قول یہ کہ یہ سنت ہے۔ یہ امام مالکؒ اور داؤد ظاہری کا مسلک ہے۔ یہ بحث عنقریب آتی ہے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز صبح مکہ میں پڑھی تھی؟

دقیقاً اور حضرت صفیہؓ نے آپؐ کو بتایا کہ وہ حائضہ تھیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا یہ ہمیں جانے سے روک رکھے گی؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ طواف افاضہ کر چکی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا پھر کوئی مضائقہ نہیں، طواف وداع کے بغیر ہی واپس چلے۔ (احمد رشت) حضرت صفیہؓ مٹی سے واپسی کی رات حائضہ ہوئی تھیں، اس لئے ابن عربیؒ کی المحاضرہ میں اس موقع پر لیلۃ النحر کا لفظ کتابت کی غلطی ہے۔ لیلۃ النحر کے بجائے لیلۃ النفر صحیح ہے۔ کیونکہ خود ابن عربیؒ نے اس سے قبل لکھا ہے کہ حضرت صفیہؓ نے اس دن یعنی یوم نحر کو طواف افاضہ کیا، اور لیلۃ النفر کو حائضہ ہوئیں۔ اور اوجز میں ہے کہ وہ یوم النحر کا طواف کر نیکی بعد حائضہ ہوئیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا، پس ہم نے یوم نحر کو طواف کیا۔ پھر صفیہؓ کو ایام شروع ہوئے۔ الخ اور ان کے حیض کی ابتداء لیلۃ النفر مٹی سے واپسی کی رات تھی، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ لیلۃ النفر کو صفیہؓ حائضہ ہوئیں۔ پس کہنے لگیں کہ میرا خیال ہے میری وجہ سے تمہیں ٹھہرنا پڑ گیا۔ الخ اور اوجز میں اس سلسلہ کی روایات کے اختلاف کو بہت ہی بسط کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: حضرت صفیہؓ کے قصہ میں حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے اشکال ہوتا ہے کہ ہم نے حج کیا پس یوم نحر

رقلت، وطاعت ام سلمۃ رضی اللہ عنہا علیٰ بعیرھا (قال) ورغبت عائشۃ عمرۃ۔
 ترجمہ: اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے اونٹ پر طواف کیا۔ (رق) اور حضرت عائشہ رضی اللہ
 عنہا نے عمرہ کی خواہش ظاہر کی۔

کو طوافِ افاضہ کیا پس صفیہ حائضہ ہو گئیں، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مقاربت کا قصد کیا
 تو میں نے کہا کہ یا رسول اللہ وہ تو حائضہ ہیں! الخ وجہ اشکال یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعد از
 بھٹاکہ یہ طوافِ افاضہ کر چکی میں تو یہ کیسے فرمایا کہ ”کیا یہ ہم کو روک رکھے گی؟“ اور اگر یہ معلوم نہیں تھا کہ
 انہوں نے طوافِ افاضہ کر لیا ہے تو تحلیل ثانی سے قبل مقاربت کا ارادہ کیسے فرمایا؟ جواب یہ ہے کہ ازدواج
 مطہرات آپ سے طوافِ افاضہ کی اجازت حاصل کر چکی تھیں۔ اور آپ انہیں اجازت دے چکے تھے،
 پس اس بنا پر مقاربت کا ارادہ فرمایا کہ وہ حلال ہو چکی ہیں۔ مگر جب آپ کو بتایا گیا کہ وہ حائضہ ہیں تو خیال
 فرمایا کہ شاید یہ قصد طوافِ افاضہ سے قبل نہ پیش آیا ہو۔ اور اس کی وجہ سے وہ طوافِ افاضہ نہ کر سکی
 ہوں، اس لئے اس کے بارے میں دریافت فرمایا۔ حضرت عائشہ نے آپ کو بتایا کہ یہ دیگر ازدواج مطہرات
 کی معیت میں طوافِ افاضہ کر چکی ہیں۔ تو یہ اندیشہ زائل ہو گیا! ۱۴

حیض ونفاس والی عہدت کی طواف وداع سے قبل
 حیض ونفاس والی عورتوں کے طواف وداع کا حکم | گھر کی طرف واپسی کا مسئلہ صحابہ کرام کے زمانہ
 میں مختلف فیہ تھا۔ بعد ازاں حضرت صفیہ کے قصہ کے پیش نظر جمہور امت کا اس پر اجماع ہو گیا ہے کہ
 اس کے لئے واپسی جائز ہے، چنانچہ اوجز میں ہے کہ موقوف لکھتے ہیں: ”جب طواف وداع سے قبل کسی عورت
 کو حیض شروع ہو جائے تو وہ جاسکتی ہے۔ اس کے ذمہ طواف وداع نہیں، نہ کچھ فدیہ لازم ہے۔ یہ عام
 فقہاء ائمہ کا قول ہے اور حضرت عمرؓ اور ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ وہ ایسی عورت کو طواف وداع کے
 لئے ٹھہرنے کا حکم فرماتے تھے، اور حضرت زید بن ثابتؓ بھی اسی کے قائل تھے۔ مگر انہوں نے اس سے
 رجوع کر لیا تھا! الخ۔

رشی، اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے اونٹ پر طواف کیا۔ اس کی تفصیل یہ مخر کے بیان میں گزر
 چکی ہے۔ اور وہ ابن حزم کا وہم بھی گزر چکا ہے، اور صحیح یہ ہے کہ ان کا یہ طواف، طواف وداع
 تھا۔ جو ۴۴ روز ہی الحجہ کی صبح کو کیا۔ (رق) اور اس رات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عمرہ کی خواہش
 حضرت عائشہ کا عمرہ تنعیم | ظاہر کی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھائی عبدالرحمنؓ کو

حکم فرمایا کہ انہیں نعیم سے عمرہ کرائیں۔ اور وہ رات ہی کو عمرہ سے فارغ ہو گئیں۔ ان کے اس عمرہ پر تفصیل بحث موضع سرف میں ان کے حائضہ ہونے کے قصے میں گذر چکی ہے۔ اور دلائل شیخ ابن قیمؒ کا یہ قول بھی گذر چکا ہے کہ ان کے عمرے میں علماء کے چار مسلک ہیں۔ اور یہ بھی گذر چکا ہے کہ ان کا یہ عمرہ اس عمرہ کی قضا تھی جو حیض کی وجہ سے نسخ کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ خفیہ کے نزدیک ان کا حج مفرد تھا۔ بخلاف ائمہ ثلاثہ کے، کہ ان کے نزدیک انہوں نے عمرہ پہنچ کا احرام باندھ کر قرآن کر لیا تھا۔ جیسا کہ پہلے تفصیل سے گذر چکا ہو (رق) پھر وہ عمرہ سے فارغ ہو کر اپنے بھائی کے ساتھ محصب پہنچ گئیں تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم فارغ ہو گئے؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! پس آپؐ نے کوچ کا اعلان فرمایا۔ بخاری میں اسی طرح ہے: ”اھدش“ اس بارے میں روایات بہت ہی مختلف ہیں کہ حضرت عائشہؓ عمرہ سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کس جگہ پہنچیں، راستہ میں؟ یا محصب میں؟ یا کسی اور جگہ؟ اور اس ناکارہ کے نزدیک اوجہ وہی ہے جو شیخ ابن قیمؒ نے ذکر کیا کہ حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محصب ہی میں جا کر ملی تھیں۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: میں تم دونوں کا انتظار کرتا ہوں: ”اور واپسی پر فرمایا: کیا تم فارغ ہو گئے؟“ اور جب حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ وہ فارغ ہو چکے ہیں تو آپؐ نے کوچ کا اعلان کیا: اس کے علاوہ اور روایات بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ پس اوجہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محصب میں ان کا انتظار فرمایا۔ تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ مگر ابھی تک محصب کی حدود سے نہیں نکلے تھے۔ پس جن حضرات نے یہ کہا کہ وہ آپؐ کی منزل ہی میں آپؐ سے آکر ملی تھیں اس سے ان کی مراد خیمہ نہیں۔ بلکہ محصب ہے۔ کیونکہ آپؐ خیمہ سے نکل کر مکہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ اور جن حضرات نے یہ کہا کہ وہ راستہ میں ملیں، ان کا قول اپنے ظاہر پر ہے۔ یعنی خیمہ سے نکل کر مکہ کی طرف کوچ کرنے کے راستہ میں۔ پھر جب حضرت عائشہؓ اور ان کے بھائی پہنچ گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوچ کا اعلان فرمایا تاکہ لوگ سامان وغیرہ باندھ کر تیار ہو جائیں۔ کہ یہ افعال کافی وقت اور کئی گفتگوں میں ہو سکتے ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیز وہ حضرات جنہوں نے طواف وداع نہیں کیا تھا مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

(رق) اگر کہا جائے کہ اس حدیث کے درمیان اور حدیث اسود کے درمیان تطبیق کی کیا صورت

موکی۔ جو صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ملے در آنجا ایک آپ چڑھ رہے تھے۔ اور میں اتر رہی تھی، یا میں چڑھ رہی تھی اور آپ اتر رہے تھے۔ چنانچہ اس حدیث میں ہے کہ ملاقات راستہ میں ہوئی۔ شیخ ابن قیمؒ نے ان دونوں کے درمیان تطبیق کی دو صورتیں ذکر کر دی ہیں اور ایک تیسری صورت شیخ ابو محمد بن حزمؒ سے نقل کی ہے، جیسا کہ حاشیہ لایم میں بسط کے ساتھ مذکور ہے۔ اور اس ناکارہ کے نزدیک ادوجہ یہ ہے کہ اس شک میں صحیح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طوافِ وداع کے لئے محصب سے مکہ کی طرف اتر رہے تھے۔ اور حضرت عائشہؓ عمر سے فارغ ہو کر مکہ سے محصب کی طرف چڑھ رہی تھیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات محصب میں اس وقت ہوئی جب کہ آپؐ خیمہ سے باہر تشریف لے چکے تھے، جیسا کہ ابھی اوپر گزرا، اور یہ توجیہ ناگزیر ہے۔ اور اس کا عکس میرے نزدیک واضح طور پر غلط ہے، اس کی متعدد وجوہ حاشیہ لایم میں مذکور ہیں۔ من جملہ ان کے ایک یہ کہ یہ توجیہ ان تمام اعتراضات سے سالم ہے جو قاضی عیاضؒ اور حافظؒ وغیرہ نے اس قصہ کی روایات پر کئے ہیں۔ جن کی تفصیل حاشیہ لایم میں ہے۔ من جملہ ان کے ایک یہ کہ امام بخاریؒ نے ”باب الادلاج من المحصب“ کا عنوان قائم کیا ہے۔ اور ”الاج لسکون دال اول حصہ شب میں چلنے کو کہتے ہیں۔ اور تشدید دال رات کے آخری حصہ میں چلنے کو۔ اور امام بخاریؒ نے اس باب میں حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث ذکر کی ہے اور شارحین نے اس حدیث سے دونوں ترجمے ثابت کئے ہیں۔ سکون دال کا حضرت عائشہؓ کے فعل سے، اور تشدید دال کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے۔ من جملہ ان کے ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کو صبح کی نماز مکہ میں پڑھی اور اس میں سورۃ طہ کی قراءت کی۔ جیسا کہ بہت سی روایات میں مودف ہے۔ اور اس کا بیان آگے آتا ہے۔ پس یہ صورت بہت ہی بعید ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول شب میں مکہ آئے ہوں، پھر محصب واپس تشریف لے گئے ہوں۔ اور نماز صبح کے لئے پھر مکہ آئے ہوں۔ اور یہ ثابت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس رات دو مرتبہ مکہ گئے، اور کوئی وجہ نہیں کہ طوافِ وداع سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس محصب تشریف لے گئے ہوں۔ اور نہ اس کی کوئی وجہ ہے کہ محصب سے دوبارہ مکہ جائیں جب کہ آپ طوافِ وداع سے فارغ ہو چکے تھے۔ اور منجملہ

وہل دخل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم البیت فی حجتہ ام لا۔

ترجمہ: اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حج میں بیت اللہ شریف کے اندر داخل ہوئے یا نہیں!

ان کے ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے مدینہ کی طرف واپسی بالاتفاق اسفل مکہ سے براستہ کندی ہوئی۔ پس یہ نہایت بعید ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طواف وداع سے فارغ ہو کر محصب چلے جائیں، جو اعلیٰ مکہ میں ہے۔ اور پھر اسفل مکہ سے مدینہ کی طرف واپسی کے لئے دوبارہ مکہ آئیں۔ ان کے علاوہ اور وجوہ ہیں جو حاشیہ لایع میں مفصل مذکور ہیں۔ اور حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ باتیں مسائل ہیں۔

اول یہ کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

حجۃ الوداع میں بیت اللہ کے اندر تشریف لینگئے یا نہیں | اس حج میں بیت اللہ شریف کا تعلق عدل ہوئے

یا نہیں؛ پس بہت سے فقہاء کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں داخل ہوئے اور بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ بیت اللہ میں داخل ہونا سنن حج میں سے ہے، کیونکہ ان کے خیال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حج میں بیت اللہ میں داخل ہوئے تھے۔ اور ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر بیت اللہ میں داخل ہوئے، حج یا عمرے میں نہیں۔ کیوں کہ ان کے خیال میں روایات میں صرف بیت اللہ میں داخل ہونے کا ذکر ہے۔ کذا فی البدیء ثقیلاً مختصراً (رش) حاصل یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمرہ قضا کے موقع پر بیت اللہ میں داخل ہونا متفق

علیہ ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر داخل ہوئے یا نہیں؛ شیخ ابن قیمؒ نے اس کا انکار کیا ہے۔ اسی طرح ان کے شیخ حافظ ابن تیمیہؒ اور شیخ نوویؒ بھی منکر ہیں۔ اور ابن سعدؒ نے

حجۃ الوداع میں آپ کا داخل ہونا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح بیہقی بھی اسی طرف مائل ہیں، چنانچہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کی حدیث کو جو لگے آتی ہے۔ حجۃ الوداع پر محمول کیا ہے۔ اور اس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے نکلے درآئیں ایک آپ بہت ہی خوش تھے۔ پھر واپس تشریف لائے تو غمگین تھے، پھر ارشاد فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میں نے اپنی امت پر مشقت ڈال دی۔“

اس حدیث کو ابو داؤد، ترمذی، ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا

ہے۔ اور ابن حبان بھی اس طرف مائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقع پر بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ اور محب طبری نے عبد اللہ بن ابی اوفیٰ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حج میں اور فتح مکہ کے موقع پر کعبہ شریف میں داخل ہوئے، اور علامہ سیوطیؒ اور ابن ہمامؒ اس طرف گئے ہیں کہ دونوں دفعہ کا داخلہ حجۃ الوداع ہی میں ہوا۔ ایک مرتبہ یوم النحر کو داخل ہوئے مگر نماز نہیں پڑھی۔ اور اس سے اگلے دن پھر داخل ہوئے اور نماز پڑھی، یہ حدیث دائنطنی نے بسند حسن ابن عمر سے روایت کی ہے۔ اور زیلعی نے بھی اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ اور مرقات میں ہے کہ میرک کہتے ہیں: متعدد مرتبہ داخل ہونے کا احتمال مسلک جمہور کے خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں۔ جن حضرات نے حجۃ الوداع میں آپ کے داخل ہونے کا انکار کیا ہے وہ حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا حدیث کو فتح مکہ پر محمول کرتے ہیں۔ اور یہ بہت ہی بعید ہے۔ کیونکہ بیت اللہ شریف میں داخل ہونے کا افسوس اس مرتبہ کا نہیں ہو سکتا کہ فتح مکہ اور دیگر فتوحات سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ میں اپنے گھر تشریف لائے تک باقی رہتا۔ یہاں تک کہ فتح مکہ اور دیگر عظیم الشان فتوحات کی مسرت پر بھی غالب آجاتا۔ اور مدینہ منورہ تشریف لاتے ہی اس غم کا اتنا غلبہ ہوتا کہ حضرت عائشہؓ دیکھتے ہی پہچان جاتیں۔ اور فوراً اس افسوس اور غم کی وجہ دریافت کرتیں جیسا کہ ابن ماجہ کی روایت کے الفاظ اس کی طرف مشیر ہیں۔ کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ جب میرے پاس سے تشریف لے گئے تھے تو خوش و خرم تھے۔ اور واپس تشریف لائے تو غمگین ہیں؟ الخ اس سے واضح تر الفاظ وہ ہیں۔ جو تلامذہ قاری نے نقل کئے ہیں یعنی: آج میں نے ایسا کام کیا کہ اگر مجھے پہلے خیال ہوتا۔ الخ اور یہی لفظ ابن سعد کی روایت کے ہیں۔ پس یہ روایت اس امر میں گویا نص ہے کہ بیت اللہ میں داخل ہونے کے بعد یہ واپسی اسی دن مکہ مکرمہ میں حضرت عائشہؓ کے گھر ہوئی تھی۔ کنانی حاشیہ الامع۔

اور اس مسئلہ پر اوجہ میں خوب بسط سے کلام کیا ہے اور اس کی تلخیص

بیت اللہ میں داخل ہونے کا حکم | حاشیہ الامع میں دو جگہ ذکر کی ہے۔ کتاب الحج میں۔ اور کتاب المغازی میں۔ اس میں کتاب الحج میں ہے: ائمہ اربعہ کی فقہی کتابوں میں بیت اللہ شریف کے داخلے کو منہوبات میں ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ الموفق نے المغنی میں، نوویؒ نے مناسک اور شرح منہب میں اسی طرح شراح لباب، ابن ہمام، صاحب نہر، صاحب درمختار اور ابن عابدین نے اس کی تصریح کی ہے، انہوں نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ بیت اللہ میں داخل ہونا مکہ میں شامل نہیں۔ اور شرح لباب میں ہے کہ داخل ہونے والوں سے اجرت لینا علماء امت کے نزدیک بالاتفاق حرام ہے۔ اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ جس چیز کا لینا حرام ہے بلا ضرورت اس کا دینا بھی حرام ہے۔ اور یہاں کوئی ضرورت نہیں کہ یہ مناسک میں نہیں۔ اھ

وہل وقف صلی اللہ علیہ وسلم فی الملتزم املا۔

ترجمہ: اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملتزم میں کھڑے ہوئے یا نہیں۔

العروة الوثقی | کھائیو جو بعض اہل ضلالت نے "العروة الوثقی" کے نام سے ایجاد کی ہے کہ بیت اللہ کے دروازے سامنے کی دیوار میں جو بلند سی جگہ ہے اس کا نام انہوں نے "العروة الوثقی" رکھ لیا اور خیال کیا کہ جو شخص اس کو پڑے اس نے "العروة الوثقی" کو مضبوط پکڑ لیا۔

"اور دوسری بدعت یہ کہ بیت اللہ کے اندر جو میخ ہے اس کا نام انہوں نے دنیا کی دنیا کی ناف | ناف رکھ لیا اور عوام کو اس پر آمادہ کیا کہ آدمی اپنی ناف نگی کر کے اس پر پیٹ کے بل لیٹ جائے تاکہ وہ اپنی ناف کو دنیا کی ناف پر رکھنے والا ہو" اھ ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں: یہ دونوں باطل امر جو نو دئی نے ذکر کئے ہیں، بحمد اللہ کعبہ شریف سے ہٹا دیئے گئے ہیں: "آھ شیخ ابن ہمام کہتے ہیں: دیوار کعبہ کی بلند سی جگہ کو "العروة الوثقی" کہنا جیسا کہ عوام میں مشہور ہے ایک بے اصل بدعت ہے اور بیت اللہ شریف کے درمیان کی میخ کو "نبال" دنیا کی ناف کہتے ہیں۔ اور اپنی ناف کھول کر اس پر رکھتے ہیں، یہ ایک ایسے شخص کا کام ہو سکتا ہے جو علم کجا عقل سے بھی محروم ہو: اسی طرح ہمارے بہت سے حضرات مثلاً صاحب نور الابصار، اور صاحب درمختار نے اس بدعت کا ذکر کیا ہے۔

مسئلہ دوم: اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملتزم میں کھڑے ہوئے ملتزم پر کھڑے ہونا | یا نہیں؟ صریح روایت دلالت کرتی ہے کہ آپ کا ملتزم میں کھڑا ہونا فتح

مکہ کا واقعہ ہے، چنانچہ ابو داؤد میں عبد الرحمن بن ابی صفوان سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا، تو میں گیا، پس میں نے دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہ بیت اللہ سے نکلے، اور دروازہ شریف سے حطیم تک سلام کیا۔ اور اپنے رخسار بیت اللہ پر رکھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان میں تھے: نیز ابو داؤد نے عمرو بن شعیب سے اباعن جابر روایت کی ہے کہ میں نے حضرت عبد اللہ کے ساتھ طواف کیا، جب ختم طواف کے بعد حجر اسود کا سلام کیا تو حجر اسود اور دروازہ بیت اللہ کے درمیان کھڑے ہوئے، اور اپنا سینہ، چہرہ، کلائیوں اور پھیلیاں (دیوار پر) رکھیں، اور ان کو خوب پھیلا یا۔ اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے

دیکھا ہے: اس میں احتمال ہے کہ یہ عمل طواف وداع کے موقعہ لاہور یا کسی دوسرے موقعہ کا لیکن حضرت مجاہدؒ اور ان کے بعد امام شافعیؒ وغیرہ اس کے قائل ہیں کہ طواف وداع کے بعد ملتزم پر کھڑا ہونا مستحب ہے: اتہمی۔ اور امام مالکؒ نے بلا غار روایت کیا ہے کہ ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ رکن و مقام کے مابین حصہ ملتزم ہے: اور جن میں اس روایت پر مفصل کلام کیا ہے۔ نیز اس میں مستند الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی روایت سے ملتزم کے پاس قبولیت دعا کی حدیث مسلسل ذکر کی ہے۔ اور موفق کہتے ہیں: حدیث ابو داؤد کی بنا پر طواف وداع کرنے والے کے لئے ملتزم میں کھڑا ہونا مستحب ہے، منصور کہتے ہیں کہ میں نے حضرت مجاہد سے دریافت کیا کہ جب ریت اللہ سے وداع کا ارادہ کروں تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ طواف بیت اللہ کے سات پھیرے کرو، مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھو، پھر چارہ رزم پر جا کر کھڑے ہو کر پانی پیو، پھر ملتزم پر آکر اس کا استلام کرو، پھر دعا کرو، اور جو حجاج تہیں اللہ تعالیٰ سے مانگنی ہوں مانگو، پھر حجر اسود کا استلام کر کے واپس آ جاؤ، اھ اور نو دویؒ نے اپنے مناسک میں طواف وداع کے بعد ملتزم کی دعا کو مستحب کہا ہے، اور ملا علی قاریؒ شرح لباب میں فرماتے ہیں: اور وداع کا طریقہ یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہو کر سب سے پہلے حجر اسود کا استلام کرے، پھر طواف کے سات پھیرے کرے، پھر دو گانہ طواف ادا کرے، پھر رزم پر آکر پانی پیے، اور دہو سکے تو خود پانی نکالے، پھر ملتزم پر حاضر ہو، اور باب کعبہ پر حاضر ہو کر اس کی دہلیز کو چومے اور دعا کرے۔ یہ ترتیب جو ذکر کی ہے روایات میں بھی مشہور ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ دو گانہ طواف کے بعد ملتزم پر جائے، وہاں سے فارغ ہو کر رزم پر آئے، اور وہاں سے واپس ہو اور پہلی ترتیب زیادہ صحیح ہے۔ جیسا کہ زیلعی اور کرمانی نے اس کی تصریح کی ہے: اور ہمایہ میں ہے: پھر مکہ میں داخل ہوا اور طواف بیت اللہ کے سات پھیرے کرے۔ ان میں سئل نہ کرے۔ یہ طواف صد ہے۔ جسے طواف وداع کہتے ہیں۔ اور طواف کی دو رکعتیں پڑھے، پھر رزم پر جا کر پانی پیے، کیونکہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس پانی نکال کر نوش فرمایا، پھر باقی ٹول کنوئیں میں ڈال دیا۔ اور مستحب ہے کہ بیت اللہ شریف کے دروازے پر حاضر ہو۔ اس کی دہلیز کو بوسہ دے، پھر ملتزم پر آئے۔ پس اپنا سینہ اور چہرہ اس پر رکھے اور کچھ دیر تک بردہ کعبہ کو پکڑے رہے، پھر اپنے گھر کی طرف لوٹ آئے، اسی طرح روایت کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملتزم پر سے عمل کیا تھا:

دھل صلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ الصبح صبیحۃ لیلۃ الوداع بمکۃ اواخرہا ترجمہ: اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ الوداع کی صبح کو فجر کی نماز مکہ میں پڑھی یا بیرون مکہ؟۔

اور ابن ہمام فرماتے ہیں، ملتزم ان مقامات میں ہے جہاں دعا قبول ہوتی ہے، یہ بات حضرت ابن عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔

اور حسن بصریؒ نے جو خط اہل مکہ کو لکھا تھا اس میں تحریر فرمایا تھا کہ وہاں پندرہ مقامات پر دعا قبول ہوتی ہے۔ طواف میں، ملتزم پر، میزاب رحمت کے نیچے، بیت اللہ کے اندر زمزم کے پاس۔ مقام ابراہیمؑ کے پیچھے، صفا پر، مروہ پر، ستمی میں۔ عرفات میں، مزدلفہ میں۔ منی میں۔ اور منیوں جبلت کے پاس، اور حسن بصری کے علاوہ دوسرے حضرات نے ذکر کیا ہے کہ بیت اللہ کو دیکھتے وقت اور حطیم میں بھی دعا قبول ہوتی ہے لیکن دوسرے مقامات تحت المیزاب ہے، اہل اور علامہ جزریؒ نے ”حسن حصین“ میں حضرت حسن بصری کا خط نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ”اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس، یعنی وہ شریف کے پاس۔ دعا قبول نہ ہو تو اور کہاں ہوگی؟“ اور مولانا عبدالحی کھنوی نے حسن حصین کے حاشیہ میں حرز ثقیں سے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ: ”اسی طرح مسجد نبوی کے تمام مواضع میں دعا قبول ہوتی ہے۔ جیسے ممبر شریف اور ستون ہائے شریفہ اور دینہ منورہ کے باقی مشاہد اور ان کنوؤں کے پاس جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے۔ اور بقیع و احد میں صحابہ کرامؓ کے مقابر کے پاس۔ اسی طرح مسجد قبا، اور تمام مساجد ماثورہ میں۔ انتہی۔“

مسئلہ سوم: اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ الوداع صبح کی نماز مکہ میں پڑھی یا بیرون مکہ؟ اس کی صبح کو فجر کی نماز مکہ میں پڑھی یا بیرون مکہ؟ صحیحین میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ ”انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درمض کی شکایت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا کہ سوار ہو کر لوگوں کے اوپر اوپر سے طواف کر لیجیو، چنانچہ انہوں نے طواف کیا اور لٹالیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سورۃ طور پڑھ رہے تھے۔“ اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ”جب صبح کی جماعت کھڑی ہو تو طواف کر لینا،“ اس حدیث سے بظاہر اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپؐ نے فجر کی نماز مکہ میں پڑھی، اور جن لوگوں نے کہا کہ یہ یوم النحر کی نماز فجر تھی یہ ان کا وہم ہے۔ کذا فی الہدیٰ تبغیہ و اختصار دیش، اور یہ کہنا بھی وہم ہے کہ عشاء کی نماز تھی، جیسا کہ ابن خزیمہ کی روایت میں ہے اور یہ روایت شاذ ہے، جیسا کہ لا وجز میں ہے۔ اور ابن اثیر نے اس کو نماز نفل پر محمول کیا ہے، جیسا کہ فتح میں ہے،

(قلت) ثم خرج من مكة من طريق كُدَيْ
(رش) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براستہ کُدئی مکہ سے نکلے

اور بخاری کی روایت میں "نماز صبح" کا لفظ دوسرے تمام احتمالات کی تردید کرتا ہے۔

(رش) حجة الوداع کے سلسلہ کی دو حدیثیں باقی رہ گئیں جن کے محل کی تحقیق مجھے ابھی تک نہیں ہو سکی، انکی تفقیض کر لی جائے۔ ایک تو ابو واقد الليثی کی روایت اپنے باپ سے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ حجة الوداع میں اپنی ازواج مطہرات سے فرما رہے تھے، "هذه ثم ظهور الحصر" یعنی پس تمہارا یہ حج ہو لیا، پھر جثالی کی پشت سے چٹے رہنا ملے حدیث امام ابو داؤد نے کتاب حج کے آغاز میں ذکر کی ہے اور شیخ قدس سرہ نے بذل میں اس حدیث کی تشریح اور رد افص کی تردید خوب شرح و بسط سے کی ہے، اسی طرح حافظ ابن حجرؒ اور حافظ عینی نے بھی اس حدیث پر کلام کیا ہے، مگر مجھے ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجة الوداع میں کس جگہ یہ ارشاد فرمایا تھا۔

دوسری حدیث اس کو بھی ابو داؤد ہی نے "باب من لعطى الصدقة وحدا الفنى" میں عبد اللہ بن خیبار بن عدی کی روایت سے ذکر کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ مجھے دو شخصوں نے بتایا کہ وہ دونوں حجة الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ صدقات تقسیم فرما رہے تھے۔ انہوں نے بھی صدقہ کا سوال کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر محسوس کیا کہ ہم قومی اور مضبوط ہیں، پس ارشاد فرمایا "اتم چاہو تو تمہیں بھی دے دیتا ہوں مگر ان صدقات میں نہ غنی کا حق ہے نہ ایسے طاقتور کا جو کسب معاش پر قادر ہو" یہ حدیث امام احمد، بیہقی اور دارقطنی نے بھی روایت کی ہے۔ اس میں حجة الوداع کی تصریح ہے، نیز امام طحاوی، نسائی، اور ابن ابی خبیبہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے مگر ان میں سے کسی کتاب میں تصریح نہیں ملی کہ یہ دونوں صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حجة الوداع میں کس جگہ حاضر ہوئے تھے۔ اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جگہ صدقات تقسیم فرمائے تھے۔

اس کی تفقیض کر لی جائے۔ — (رش) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براستہ کُدئی مکہ سے نکلے۔ کُدئی۔
کُدئی کے راستے سے واپسی | بضم کاف والفاء مقصورہ اسفل مکہ کا نام ہے۔ کُدئی سے نکلتا مواہب

اور البدایہ والنہایہ میں ذکر کیا گیا ہے اور صحیحین وغیرہ کی روایات میں معروف ہے

حافظ کہتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس حکمت کی بنا پر کُدئی
راستہ بدلنے کی حکمت | کا راستہ تبدیل فرمایا؟ اس میں مختلف قول ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ اس میں

واستصحب معه من ماء زمزم شینگ
توجہ: اور کسی قدر ماز زمزم بھی اپنے ساتھ لیا۔

حکمت یہ تھی کہ وہ سارے لوگ جو آپ کے راستہ میں آئیں، اس سے برکت حاصل کرتیں پس یہاں بھی کچھ وہی باتیں ذکر کی گئی ہیں جو عید کے بیان میں ذکر ہو چکی ہیں۔ اور عید کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے میں اسے بالاستیعاب دہاں ذکر کر چکا ہوں، ان میں بعض امور یہاں اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں حکمت یہ تھی کہ داخلہ کے لئے بلندی کی جانب مناسب تھی کہ اس میں مکان کی تنظیم ہے۔ اور نکلنے کیلئے نشیب کی جانب مناسب تھی کہ اس میں فراق کی طرف اشارہ ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ ابراہیم علیہ السلام مکہ میں اسی جانب سے داخل ہوئے تھے اس لئے یہ جانب اختیار کی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع پر مکہ سے خفیہ نکلے تھے اس لئے ارادہ فرمایا کہ بلندی کی جانب سے بکمال ظہور داخل ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ جو شخص اعلیٰ مکہ سے داخل ہو اس کو بیت اللہ کا استقبال حاصل ہوتا ہے اس لئے اس جہت کو اختیار فرمایا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ میں اس جانب سے داخل ہوئے تھے۔ اس لئے وہی معمول برقرار رہا، الخ پوری تفصیل دہاں دیکھ لی جائے۔

اور ابدا یہ والنبایہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
آب زمزم ساتھ لے جاتا | نے واپسی پر کسی قدر آب زمزم بھی اپنے ساتھ لیا۔ چنانچہ ترمذی نے اپنی سند سے حضرت عائشہؓ کا یہ معمول نقل کیا ہے کہ وہ اپنے ساتھ آب زمزم لے جاتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسے لے جاتے تھے، شیخ قدس سرہ کو کتب میں فرماتے ہیں: اس میں آب زمزم لیجانے کے حواذ کی دلیل ہے، مگر دوسری چیزوں کو، جو لے جانے سے کم ہو جاتی ہیں اور اس میں مکہ کا نقصان ہے۔ اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً مٹی کہ مٹی لے جانے میں دہاں کے منقعات میں نقص واقع ہوگا۔ اور گڑھ بن جائیں گے، آنحضرت قدس سرہ نے جو فرمایا ہے وہ بالکل واضح ہے کہ آب زمزم لے جانے سے کم نہیں ہوتا۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ لاکھوں انسان اسے رات دن پیتے ہیں اور ہزاروں ڈرم ساتھ لے جاتے ہیں مگر وہ ذرا بھی کم نہیں ہوتا۔ اور درویر نے آب زمزم بکثرت پینے اور اپنے ساتھ وطن لے جانے کو مندوبات میں ذکر کیا ہے۔ اور شرح لباب میں ہے کہ آب زمزم

قال، ثم ارتحل رسول الله صلى الله عليه وسلم راجعاً إلى المدينة، فقلت، فلما وصل غدیر خم خطب صلى الله عليه وسلم وذكر فيها فضل علي رضي الله عنه توجیه: (رق) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی طرف واپسی کے لئے روانہ ہوئے (رش) پس جب غدیر خم پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اس میں حضرت علیؑ کی فضیلت بیان فرمائی۔

کا وطن لے جانا مستحب ہے، تاکہ بندگان خدا اس سے برکت حاصل کریں۔ اس پر ترمذی کی مذکورہ بالا روایت دلیل میں پیش کی ہے، اور غیر ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ساتھ لے جاتے تھے، مریضوں کو پلاتے اور ان پر چھڑکتے تھے اور حسن و حسین کی تحنیک بھی اسی کے ساتھ فرمائی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ روایات میں یہ بھی آتا ہے، جیسا کہ کنز العمال میں ہے، کہ مازنزم کا ہدیہ مانگنے کا حکم فرمایا۔ اور یہ بحث طواف زیارۃ کے بیان میں گزر چکی ہے، کہ مازنزم تمام پانیوں سے افضل ہے۔

خطبہ غدیر خم (رق) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۴۴ ہجری چار شنبہ بدھ کی صبح کو مدینہ کی طرف واپسی کے لئے روانہ ہوئے (رش) پس جب غدیر خم پہنچے، حموی کہتے ہیں:

غدیر بفتح اول و کسر ثانی۔ اور غدیر خم مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے، اس کے اوڑھنے کے درمیان دو میل کا فاصلہ ہے۔ اور خم کے بیان میں کہتے ہیں: زخشری کا قول ہے کہ "خم" دراصل ایک رنگریز آدمی کا نام تھا اس کی طرف یہ تالاب منسوب ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ جحفہ سے تین میل پر ہے، اور صاحب مشارق کہتے ہیں: "اور خم ایک جگہ ہے جہاں چشمہ بہتا ہے۔ تالاب اور خم کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہے۔ اور حازمی کہتے ہیں: خم مکہ اور مدینہ کے مابین جحفہ کے پاس ایک وادی کا نام ہے، جہاں ایک تالاب ہے۔ اس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا تھا اور حموی نے غدیر اور خم کی وجہ تسمیہ میں اقوال بسط سے ذکر کئے ہیں، اول شیخ احمد بن عبد الحمید عباسی نے عمدة الاخبار میں ذکر کیا ہے کہ اسدی کہتے ہیں: "جحفہ سے تین میل پر راستے کی بائیں جانب چشمے کے برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہے۔ اور اس کے پاس ہی ایک بن ہے، یہی غدیر خم ہے اور یہ جحفہ سے چار میل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی خم ہے جس کے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منزل کی اور وہاں درخت کے نیچے ظہر کی نماز پڑھی اور حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اے اللہ! جس کا میں دوست ہوں علیؑ بھی اس کے دوست ہیں۔ الخ۔ اھ۔

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اس میں حضرت علیؑ کی فضیلت بیان فرمائی۔ صاحب الہدایہ

والنہایہ کہتے ہیں: "فصل: اس حدیث کے ذکر میں جو حضرت علیؑ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپسی پر مکہ اور مدینہ کے درمیان محفہ کے قریب ایک جگہ میں جو غدیر خم کہلاتی ہے خطبہ دیا۔ اس میں حضرت علیؑ کی فضیلت بیان فرمائی اور بعض اہل یمن جو آپ کے ساتھ تھے ان کے اعتراضات سے ان کی برأت ظاہر فرمائی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ حضرت علیؑ نے ان سے عدل و انصاف کا معاملہ کیا تھا۔ جس کو ان میں بعض نے ظلم، تنگی اور بخل سمجھا، حالانکہ اس معاملہ میں علیؑ حق بجانب تھے، اس لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیان مناسک سے فارغ اور مدینہ کی طرف واپس ہوئے تو راستہ میں اس کو بیان فرمایا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بروز اتوار ۸ ارذی الحجۃ ۱۰ کو غدیر خم میں ایک درخت کے نیچے ایک عظیم الشان خطبہ دیا، جس میں بہت سی چیزیں ذکر فرمائیں۔ اور حضرت علیؑ کے فضل و کمال، عدل و انصاف اور آپ سے ان کی قرابت کو بیان فرمایا۔ جس سے بہت سے لوگوں کے دل میں جو شکوک و شبہات تھے وہ زائل ہو گئے، ہم یہاں ان منتخب احادیث کو ذکر کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں وارد ہوئیں۔ اور یہ بھی بیان کریں گے کہ ان میں کون سی صحیح ہے اور کون سی ضعیف۔ نیز یہ بتائیں گے کہ شیعہ کے لئے ان میں کوئی حصہ نہیں۔ نہ ان کے باطل مدعا پر کوئی دلیل و حجت ہے۔ اس کے بعد صاحب البدایہ والنہایہ نے ان روایات کو ذکر کیا ہے۔ اور ان میں سے بیشتر روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے: "من کنت مولاً فاعلیٰ مولاً" (جس کا میں دوست ہوں علیؑ بھی اس کے دوست ہیں) اور مشکوٰۃ میں بروایت احمد برادر بن عازب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غدیر خم میں آئے تو حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: کیا تمہیں علم نہیں کہ مجھے اہل ایمان سے ان کی جانوں سے بھی زیادہ قرب و تعلق ہے؛ صحابہ نے عرض کیا: بے شک۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اے اللہ! جس کا میں دوست ہوں، علیؑ بھی اس کے دوست ہیں۔ اے اللہ! جو شخص علیؑ کو دوست رکھے تو اس کو دوست رکھ، اور جو شخص اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی کر۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت علیؑ سے ملاقات ہوئی تو ان سے فرمایا اے ابن ابی طالب! تمہیں مبارک ہو کہ تم صبح و شام یعنی ہر وقت و ہر حال ہر مومن مرد و عورت کے محبوب اور دوست ہو گئے۔" ۱۷

لما علی تارمی کہتے ہیں: "شیعہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ یہ حدیث حضرت علیؑ کی خلافت پر نص صریح ہے، چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ یہاں مولیٰ کے معنی اولیٰ بالامانت یعنی خلافت کا سب سے زیادہ مستحق، کے ہیں۔

درد لوگوں کو اس طرح جمع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور یہ دان کے خیال میں، ان کا سب سے قوی استدلال ہے۔ علماء اہلسنت نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مولیٰ بمعنی محبوب ہے، بلاشبہ حضرت علیؑ ہمارے آقا اور محبوب ہیں، اور مولیٰ کے کئی معنی ہیں، انراں جملہ ناصر و غیرہ ہیں۔ لہذا یہ حدیث دان کے مدعی پر نص بھی نہیں۔ چہ جائیکہ اسے "نص صریح" کہا جائے۔ اگر بالفرض اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہاں مولیٰ کے معنی اولیٰ بالامنت ہیں تو اس سے مراد وہی الحال نہیں بلکہ فی المال ہے، ورنہ لازم آئے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوجوگی میں بھی امام وہی ہوں۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ حدیث سے مقصود یہ ہے کہ جب ان کی خلافت کے لئے عقد بیعت ہوگا اس وقت وہ سب سے اہق ہوں گے۔ لہذا یہ خلفائے ثلاثہ کی تقدیم کے منافی نہیں۔ کہ ان کی تقدیم پر تمام قابل ذکر لوگوں کا۔ حتیٰ کہ خود حضرت علیؑ کا بھی۔ اجماع ہے۔ مزید براں یہ کہ حضرت علیؑ نے اپنے دور خلافت تک کبھی اس حدیث سے استدلال نہیں فرمایا۔ آپ کی خاموشی معمولی علم و عقل کے آدمی کے نزدیک بھی اس امر میں فیصلہ کن ہے۔ کہ حضرت علیؑ کے نزدیک یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی خلافت بلافصل میں نص نہیں جیسا کہ خود حضرت علیؑ تصریح فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ان کی خلافت کی تصریح فرمائی نہ کسی دوسرے کی۔ علاوہ ازیں یہ کہ یہ حدیث خبر واحد ہے اور پھر اس کی صحت بھی مختلف فیہ ہے، پس جب شیعہ کا اس اصول پر اتفاق ہے کہ احادیث امامت میں تواثر شرط ہے تو انہیں اپنے اصول کے خلاف اس حدیث سے استدلال کی جرأت کیسے ہوئی؟ اس کو ناقض صریح اور تعارض قبیح کے سوا اور کیا نام دیا جائے؟ - اھ۔

اور صبح الاغشیٰ میں مسلمانوں کی عیادہ کے میان میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: اور شیعہ نے ایک تیسری عید اختراع کر رکھی ہے، جس کو وہ عید القدر کا نام دیتے ہیں، جس کا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غدیر خم میں حضرت علیؑ سے مواخات قائم کرنا ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجتہ الوداع سے واپس ہوئے تو غدیر خم میں اترے، اور صحابہ کرام کے درمیان مواخات قائم کی، مگر حضرت علیؑ کے ساتھ کسی صحابی کی مواخات قائم نہیں کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ ان میں اس کی وجہ سے شکستگی پائی جاتی ہے۔ تو انہیں اپنے ساتھ لایا، اور فرمایا کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تمہارا تعلق مجھ سے وہی ہو جو ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام سے تھا۔ مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور آپؑ نے صحابہؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا، جس کا میں دوست ہوں، اس کا علیؑ دوست ہے، یہ واقعہ اذیٰ الحجۃ کا ہے شیعہ اس عید کو ساری ملت نماز پڑھتے، اور اس کی صبح کو زوال سے قبل دو رکعتیں پڑھتے ہیں۔ اور اس عید میں کپڑے

پہننا غلام آزاد کرنا۔ بکریاں ذبح کرنا اور اپنے پرانے سبک الفت و اکرام سے پیش آنا ان کا شعار ہے۔
اور شعر اور غیر ان کے بڑوں کو عید کی مبارک باد دیتے ہیں: ”اھ۔“

میں کہتا ہوں کہ صاحب ”صبح الاعشٰی“ نے اس خطبہ کا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کے درمیان
مواخات قائم کرنا جو ذکر کیا ہے میں اس کے سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیونکہ مواخات کا واقعہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے زمانہ میں دو مرتبہ پیش آیا۔ اول مکہ میں، جب کہ صرف مہاجرین کے درمیان حق و غم خواری
کے لئے مواخات قائم فرمائی۔ چنانچہ حضرت ابو بکر و عمرؓ کے درمیان اور حضرت علیؓ اور خود اپنی ذات کے
درمیان مواخات فرمائی، اسی طرح قسطلانی نے کچھ اور مہاجرین کے نام بھی ذکر کئے ہیں۔ جن کے درمیان
مواخات فرمائی۔ دوم: ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں قسطلانی کہتے ہیں: ”جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ
میں تشریف لائے تو حضرت انس بن مالکؓ کے گھر میں مہاجرین و انصار کے درمیان ہمدردی و غم خواری
کے لئے مواخات قائم کی۔ اور وہ دستور شروع میں، اس مواخات کی بنا پر ایک دوسرے کے وارث ہوتے
تھے۔“ جیسا کہ حاشیہ بخاری میں قسطلانی سے نقل کیا ہے۔ میرے نزدیک اس خطبہ کا سبب یہ ہے کہ بعض
صحابہ خصوصاً اہل یمن نے حضرت علیؓ سے بے التفاتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ چنانچہ امام بخاری نے ”بعث علیؓ الی
الیمین قبل حجة الوداع“ کے ذیل میں حضرت بریدہؓ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ: ”میں حضرت علیؓ سے
بعض رکعتا تھا۔ ایک بار انہوں نے غسل کیا تو میں نے دازراہ اعتراض حضرت خالدؓ سے کہا: ان کو دیکھتے ہو؟
پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو میں نے آپؐ سے اس کا تذکرہ کیا۔ الحدیث۔ اور البہابیہ
والنہابیہ میں حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ میں حضرت علیؓ کے ساتھ جہاد کے لئے یمن گیا، پس میں نے ان سے کچھ
بے وفائی و جفوا محسوس کی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو تنقیص کے انداز میں حضرت
علیؓ کا ذکر کیا، میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور متغیر ہو گیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا اے
بریدہ! کیا مجھے تمام مومنوں سے ان کی جان سے بھی زیادہ تعلق نہیں؟ میں نے عرض کیا: بے شک۔ آپؐ
نے فرمایا: جس کا میں دوست اور محبوب ہوں علیؓ بھی اس کے دوست اور محبوب ہیں۔ یہ حدیث
نسائی نے ابوداؤد حسانی سے اسی طرح روایت کی ہے۔ اور شیخ ابن حجرؒ نے ”الصواعق المحرقة“ میں
شیعہ کے استدلال پر جو انہوں نے امام المشرق و المغرب امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ
کی خلافت بلا فصل پر اس حدیث سے کیا ہے، خوب رد کیا ہے اور اس کا کچھ حصہ مشکوٰۃ کے اردو ترجمہ کے

مظاہر حق میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ نیز صبح الاغشی میں ”اما رضی ان تکون منی بمنزلہ ہارون من من موسیٰ“ کا اس وقت پر ذکر کرنا خلافت معروف ہے، کیونکہ روایات میں معروف یہ ہے کہ یہ ارشاد غزوہ تبوک کو جاتے ہوئے فرمایا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کے لئے تشریف لے گئے، اور حضرت علیؑ کو مدینہ میں اپنا جانشین بنایا تو انہوں نے عرض کیا کہ کیا آپ مجھے خود توں اور بچوں میں چھوڑے جاتے ہیں، اس پر آپؐ نے فرمایا: کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تمہاری نسبت مجھ سے وہی ہو جو ہارون علیہ السلام کی موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔“ اور علامہ قاری نے مرقات میں اس مضمون کی متعدد روایات ذکر کی ہیں۔ اور انہوں نے تو بدیہی سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا تھا جب کہ آپؐ غزوہ تبوک کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، اور حضرت علیؑ کو اپنے اہل پر خلیفہ مقرر کیا تھا۔ منافقوں نے اس کو خوب اڑایا۔ اور کہا کہ ان کو گرانی اور بے قدری کی بنا پر چھوڑے جا رہے ہیں۔ جب حضرت علیؑ نے یہ باتیں سنیں تو اپنے ہتھیار اٹھا کر نکلے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپؐ اس وقت مقام حرف میں فروکش تھے، پس عرض کیا کہ یا رسول اللہ! منافق مجھے یوں طعنے دیتے ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: وہ جھوٹ کہتے ہیں، میں تجھے ان لوگوں کی خاطر چھوڑ کر جا رہا ہوں جو میرے پیچھے رہ جائیں گے۔ جا! میرے اور اپنے اہل و عیال میں میرا جانشین ہوا ہے علیؑ کیا تو راضی نہیں کہ تیری نسبت ”الحدیث“ اور اس حدیث سے حضرت علیؑ کی خلافت بلا فصل پر استدلال کرنا راہ صواب سے بعید ہے۔ پوری بحث مرقات میں ہے۔ (دش) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطبہ میں ارشاد فرمایا: ”صدقہ مجھ کو حلال ہے نہ میرے اہل بیت کو۔ اللہ کی لعنت ہو اس پر جو اپنے باپ کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف اپنی نسبت کرے، یا اپنے آقاؤں کے علاوہ کسی اور سے موالات قائم کرے، بچہ اس کا ہے جس کے فراش پر پیدا ہوا اور زانی کے لئے پتھر ہے۔ وارث کیلئے وصیت نہیں۔“ زلیحی: تخریج ہدایہ میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث ابن عدی نے زید بن القثم اور براۓ سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم درخت کی شاخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک سے اٹھا ہے تھے، پس آپؐ نے فرمایا: ”صدقہ... الحدیث۔“ اور اس حدیث میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصہ کا ذکر نہیں۔

رقال) فلما كان بالروحاء لقي ركباً فسلم عليهم
 ترجمہ: پس جب کہ آپ مقام روحادیں پہنچے تو سواروں کی ایک جماعت سے ملاقات ہوئی، پس آپ
 نے ان کو سلام کہا۔

دق! پس جب آپ مقام روحادیں پہنچے، یہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے دوسری منزل ہے اس کے
 ضبط اور مسافت کا بیان آنحضرت صلی اللہ علیہ کی مدینہ سے روانگی کے بیان میں گذر چکا ہے۔ تو سواروں
 کی ایک جماعت سے ملاقات ہوئی۔ ركب: راکب کی جمع ہے، یعنی سواروں کی جماعت۔ اور اجز میں
 ہے کہ: میرے والد قدس سرہ نے اپنے شیخ حضرت قطب گنگوہی قدس سرہ سے درس نسائی کے افادات
 میں نقل کیا ہے کہ: ”ملاحظہ روایات سے جو بات منقح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ سوال بیت اللہ کو جانے وقت
 موافقہ اس لئے یہاں صدر سے مراد مدینہ سے روانگی ہے“ اور حضرت گنگوہی کے کلام میں لفظ ”یہاں“
 سے مراد نسائی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: ”صدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما كان بالروحاء الخ“ یعنی
 ”لوٹے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تک کہ جب روحادیں پہنچے“ شیخ ابن قیم نے الہدیٰ میں اور مبارک
 شیخ نے بدل میں یہ نہ ائے اختیار کی ہے کہ یہ قصہ مکہ سے واپسی کا ہے، اس کی تائید ایک ”نسائی کی مذکورہ
 روایت کے لفظ صدر سے ہوتی ہے“ دوسرے سند شافعی اور سیقی میں بطریق شافعی عن ابن عیینہ عن
 ابراہیم اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: ”ان النبي صلى الله عليه وسلم قفل فلما كان بالروحاء الخ“
 یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے۔ یہاں تک کہ جب روحادیں پہنچے۔ اور جز کی عبارت ختم ہوئی۔
 اور شیخ گنگوہی کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ امام ابو داؤد اور امام نسائی نے اس حدیث کو کتاب الحج کے
 آغاز میں ذکر کیا ہے۔ پس آپ نے ان کو سلام کہا اور دریافت فرمایا کہ کون لوگ ہیں؟ اس حدیث میں ایک
 اشکال ہے اور وہ یہ کہ آگے حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ ان حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
 بارے میں سوال کیا کہ آپ کون ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ سے واپسی
 تک نہیں پہچانا؟ نہ طواف میں نہ عرفات میں نہ منیٰ کے خطبات میں؟ اس کا جواب نو دہائی نے اور ان کی پیروی
 میں زرقانی نے شرح مواہب میں یہ دیا ہے کہ ”عیاض کہتے ہیں کہ احتمال ہے کہ یہ ملاقات رات کے وقت
 ہوئی ہو۔ اس لئے انہوں نے آپ کو نہ پہچانا ہو، اور احتمال ہے کہ دن کا وقت ہو مگر انہوں نے اس سے قبل
 آپ کی زیارت نہ کی ہو کہ اپنے علاقے میں اسلام لائے اور اس سے قبل رحلت نہیں کی الخ“ مگر یہ جواب نہایت

فأخرج امرأة من محفلتها صبياً لها فقالت الهذا حج فقال نعم ولك أجره
مترجمہ: پس ایک عورت نے اپنے بروج سے اپنا بچہ نکالا اور عرض کیا کہ کیا اس کا بھی حج ہو
سکتا ہے؟ فرمایا: ہاں! اور ثواب تجھے ہوگا۔

بعید ہے۔ کیونکہ بظاہر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں شرکت کے بعد واپس آرہے ہوں گے
الایہ کیرہ کیا جائے کہ انہوں نے اس سال حج بھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حج سے
واپسی پر آپ سے ملے تھے۔ پس ایک عورت نے اپنے بروج سے اپنا بچہ نکالا اور عرض کیا کہ کیا اس کا
بھی حج ہو سکتا ہے؟ فرمایا: ہاں! اور ثواب تجھ کو ہوگا۔ خففہ، بالکسر عورتوں کا مرکب جو بروج کی طرح
ہوتا ہے مگر اس پر قوت نہیں ہوتا۔ کنانی البذل۔

پچھے کے حج کے مسائل: ادترج میں اس حدیث کے ذیل میں پچھے کے حج کے مسائل بڑی تفصیل سے ذکر
کے ہیں اس کا خلاصہ حاشیہ لایم میں ان الفاظ میں مذکور ہے: ”اس میں چند فصول میں کلام ہے۔ اقل: بچوں کے
ساتھ حج کرنا مشروع ہے۔ اثر الراجہ اور جمہور اسی کے قائل ہیں۔ ماضی عیاض کہتے ہیں علماء کے درمیان اس کے جواز
میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس کو صرف اہل بدعت کے ایک ناقابل التفات گروہ نے ممنوع کہا ہے۔ ان کا یہ قول
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل، صحابہ کے عمل اور اجماع اُمت سے مردود ہے۔“

دوئم: اس کا حج منعقد ہوتا ہے یا نہیں؟ اور کیا اس پر احکام حج جاری ہوتے ہیں یا نہیں؟ جمہور
کا قول ہے بچہ کے ذمہ ندیہ اور دم جبر لازم ہے۔ اور اس پر بالغ کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں۔
اس میں امام ابوحنیفہ کا اختلاف ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ممنوعات احرام میں کوئی چیز اس پر لازم نہیں آتی۔
اور اسی سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ خفیہ کے نزدیک بچے کا حج منعقد ہی نہیں ہوتا۔ صحیح یہ
ہے کہ ان کے نزدیک اس کا حج نفل منعقد ہوتا ہے۔

سوم: کیا اس کے ذمہ جزا اور کفارات لازم ہیں؟ رفتانی کہتے ہیں کہ اس کے ذمہ جزا، ندیہ اور
کفارات لازم ہیں، یہ ائمہ ثلاثہ اور جمہور کا قول ہے۔ اور خفیہ کو اس سے اختلاف ہے، میں کہتا ہوں صحیح
یہ ہے کہ کفارات کے ساقط کرنے میں خفیہ متفرد نہیں، بلکہ بعض حالات میں ائمہ ثلاثہ اور ابن جزم بھی
اپنی ظاہریت کے باوصف ان سے موافقت کرتے ہیں۔

رقلت، واناخ راحلتہ بالبطحاء فبات بہا و صلی بہا۔

ترجمہ: (رشد) اور آپ نے بطحا میں اپنی اونٹنی بٹھائی، پس وہاں رات رہے اور نماز پڑھی۔

چہاں: ائمہ اربعہ کے نزدیک بچے کو اسکے چچ اور دیگر حسنت پر ثواب ہوتا ہے۔ اس میں کسی ایسے شخص کا اختلاف نہیں جس کا قول لائق اتباع ہو، البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ اس کی حسنت صرف اسی کے لئے ہوتی ہیں۔ ماں باپ کو ان میں سے کچھ نہیں ملتا؟ یا یہ کہ ماں باپ کو پورا ثواب ملتا ہے۔ اور بچے کے اجر میں بھی کمی نہیں کی جاتی۔

پہنچم: کیا اس کا چچ، حج فرض کی جگہ کفایت کرے گا؟ ائمہ اربعہ کا اجماع ہے کہ کفایت نہیں کرے گا۔ بلکہ بالغ ہونے کے بعد اسے حج کرنا ہوگا، ظاہر یہ کا قول ہے کہ بس یہی کافی ہے۔

ششم: بچے کی طرف سے کونسا ولی احرام باندھے؟ اس میں وسیع اختلاف ہے۔

ہفتم: اگر بچہ دوران حج بالغ ہو جائے تو کیا کرے؟ اور کیا اس کا حج فرض ادا ہو جائے گا؟

اس میں بھی طویل کلام ہے۔ جو اجز میں مفصل مذکور ہے۔ حاشیہ لایع کا خلاصہ ختم ہوا۔

(رشد) اور آپ نے بطحا (ذی الحلیفہ میں) اپنی اونٹنی بٹھائی، پس وہاں رات

بطحا میں رات گزارنا رہے اور نماز پڑھی۔ اور مؤطا میں ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے بطحا (ذی الحلیفہ میں) پڑاؤ کیا، پس وہاں نماز پڑھی، امام مالک فرماتے ہیں کہ حج سے واپسی میں کسی کے لئے مناسب نہیں کہ اس منزل میں نماز پڑھے بغیر یہاں سے تجاوز کرے، البتہ "اور اجزہ" میں ہے کہ راوی کا قول: "پس نماز پڑھی" یعنی جب اپنے چچ سے واپس ہوئے، باجی کہتے ہیں کہ واپسی کی تخصیص اس بنا پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف واپسی میں یہاں پڑاؤ کیا تھا۔ آہ۔

میں کہتا ہوں کہ بخاری میں حدیث المساجد میں ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عمرہ کے لئے تشریف لے جاتے تو ذی الحلیفہ میں فروکش ہوتے۔ اور جب حج کیا تب بھی ذی الحلیفہ میں ٹھہر کر گئے، اور جب کسی غزوہ سے واپس آتے، اور ذی الحلیفہ راستے میں واقع ہوتا، یا حج و عمرہ سے واپس آتے تو وہاں بطن وادی میں اترتے، اور جب وادی کے نشیب سے اوپر چڑھتے تو اس بطحا میں جو وادی کے مشرقی کنارے پر واقع ہے، رات کو پڑاؤ کرتے، اور صبح تک وہاں قیام کرتے، الی آخر الحدیث۔ اور بخاری شریف میں کتاب الحج کے آخر میں ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ کی طرف

(قال) ودخل صلى الله عليه وسلم المدينة من طريق المعرس (قلت) فلما طلع له احد فقال هذا جبل يحبنا ونحبه

ترجمہ (رق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں براہ معرس داخل ہوئے، (ش) پس جب جبل احد آپ کے لئے نمودار ہوا تو فرمایا: یہ وہ پہاڑ ہے جسے ہم سے محبت ہے اور ہمیں اس کی محبت ہے۔

تشریف لے جاتے تو مسجد شجرہ میں نماز پڑھتے اور جب واپس آتے تو ذوالحلیفہ میں بطن وادی میں نماز پڑھتے۔ اور وہاں صبح تک رات رہتے۔ اور اجز میں ہے کہ ”قاضی کہتے ہیں کہ حج سے واپسی میں بطحا ذوالحلیفہ میں اتنا مناسک حج میں سے نہیں، اہل مدینہ میں سے جو حضرات اس پر حامل تھے ان کا مقصد محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہتمام سے برکت حاصل کرنا تھا۔ اور اس لئے بھی کہ یہ بطحا دبا برکت ہے۔ اور امام مالکؒ نے یہاں اترنے اور نماز پڑھنے کو مستحب قرار دیا ہے کہ بغیر نماز پڑھے آگے نہ بڑھے۔ اور اگر نماز کا وقت نہ ہو تو یہاں ٹھہرے یہاں تک کہ نماز کا وقت داخل ہو جائے۔ اور کہا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں اس لئے منزل کی تھی تاکہ لوگ اپنے گھروں میں رات کو اچانک نہ جائیں، جیسا کہ احادیث مشہورہ میں اس سے صراحتہ ممانعت آئی ہے۔ یہ نووی نے کہا ہے: ”آحد اور امام نسائی کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ قصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ جانے کا ہے، واپسی کا نہیں کیونکہ انہوں نے یہ حدیث مبدا احرام میں ذکر کی ہے۔“

(رق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں براہ معرس دن کے وقت مدینہ میں براہ معرس داخل ہوئے۔ معرس نفقہ راہ مشدودہ و مہلتین۔ یہ مکہ سے مدینہ آتے ہوئے راستہ پر ایک معروف جگہ ہے۔ جو ذی الحلیفہ سے نیچے اور اس کی نسبت مدینہ سے قریب تر ہے۔ کذانی الزرقانی۔

(ش) پس جب جبل احد آپ کے سامنے نمودار ہوا تو فرمایا: یہ وہ پہاڑ ہے جبل احد سے محبت جو ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں۔ اور اجز میں ہے کہ زرقانی کہتے ہیں: ”یعنی جب خیر سے نکلے (تو یہ ارشاد فرمایا)۔“ میں کہتا ہوں کہ روایات میں یہی معروف ہے جو زرقانی نے کہا، اور حافظ کہتے ہیں کہ بخاری کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا تھا جب کہ حج سے واپسی میں اس پر نظر پڑی۔ اور ابو حنیفہؒ کی روایت

رقال، فدخل صلى الله عليه وسلم قافلاً أثيون، تأثيون، عابدون، ساجدون لربنا

..... حامدون صدق الله وعده ونصر عبده وهزم الأحزاب وحده

ترجمہ: (رق) پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پڑھتے ہوئے داخل ہوئے: أثيون، تأثيون، عابدون،

ساجدون، لربنا حامدون صدق اللہ وعده ^{وعدہ} ونصر عبده وهزم الأحزاب وحده

میں ہے کہ آپ نے یہ ارشاد غزوہ تبوک سے واپسی پر فرمایا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارشاد کسی بار فرمایا۔ یہ حدیث امام مالک نے موطا میں تحریم المدینہ میں ذکر کی ہے۔ اور زکافی کہتے ہیں: ارشاد نبوی: اس کو ہم سے محبت ہے۔ حقیقت پر محمول ہے جیسا کہ ایک جماعت نے اس کو راجح کہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسی طرح خطاب فرمایا جس طرح ذی عقل سے کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: اے اُحد! ٹھہر جا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس میں محبت و ولایت فرمائی جس طرح داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں میں تسبیح پیدا فرمائی۔ اور جس طرح ان پتھروں میں خشیت پیدا فرمائی جن کے بارے میں ارشاد ہے: اور بے شک بعض پتھر گر جاتے ہیں اللہ کے خوف سے اور جس طرح اسطوانہ میں بچے کی طرح رونے کی تخلیق فرمائی، وغیر ذالک، اور ارشاد نبوی: ہم اس سے محبت رکھتے ہیں، بھی حقیقت پر محمول ہے۔ کیونکہ جو محبت کرے اس کی جزا یہی ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ نیز اس لئے کہ وہ جنت کے پہاڑوں میں سے ہے، جیسا کہ مسند احمد کی روایت میں ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہاں مضاف مخدوف ہے یعنی اہل اُحد انصار ہم سے محبت کرتے ہیں۔ اور وہ جبل اُحد کے ہمایہ تھے۔ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی۔ اور آپ کو ان سے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لاتے تو چونکہ جبل اُحد بزبان حال آپ کو قرب اہل کی بشارت دیتا تھا، پس آپ اس کو دیکھتے ہی سفر سے واپسی اور اہل کے قرب سے مسرور ہو جاتے، اسی کو محبت سے تعبیر فرمایا، پھر اوجنہ میں جبل اُحد، جبل رحمت و جود میں ہے (جبل ابی قیس اور جبل طور جس پر موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔

کے مابین فضیلت پر مختصر سا کلام کیا ہے) پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پڑھتے ہوئے مدینہ

مدینہ میں داخل ہوئی دعا طیبہ میں داخل ہوئے!

اُثيون، تأثيون، عابدون، ساجدون، ہم رجوع کر نوالے تو بر کر نوالے عبادت کر نوالے بھج کر نوالے

لربنا حامدون، صدق اللہ وعده، اور اپنے رب کی حمد کر نوالے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ

ونصر عبده، وهزم الأحزاب وحده، سچا کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد فرمائی۔ اور تمام رطاعتوں کی

شکروں کو تنہا شکست دے دی۔

قلت) وقال صلى الله عليه وسلم لام سنان وام معقل وغيرهما بعد الرجوع الى المدينة
توجم: دوش) اور مدینہ کی واپسی کے بعد ام سنان اور ام معقل وغیرہ سے فرمایا۔

زر قانی کہتے ہیں کہ ارشاد نبوی: اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا: یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ سے
اخبار دین وغیرہ کے جو وعدے کئے تھے وہ پورے کر دیئے۔ یہ دعا سفر جہاد کی ہے۔ اور حج و عمرہ کے
ساتھ اس کی مناسبت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا: لئن دخلن المسجد الحرام - جب یہ وعدہ
پورا ہو گیا: اھ اور ام بخاری نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے: باب ما يقول اذا جمع من الحج والعمرة
او الغزوة اور اس کے تحت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم جب جہاد یا حج یا عمرہ سے واپس تشریف لاتے تو زمین کی ہر بلندی پر تین مرتبہ تکبیر کہتے۔ پھر یہ دعا
پڑھتے۔ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، اللہ الماک ولہ الحمد، وهو علی کل شیء قدید البصون
تائبون الخ نیز ام بخاری نے ایک باب کا عنوان قائم کیا ہے: باب من اسرع ناقته اذا بلغ
المدينة اور اس کے ذیل میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب
سفر سے واپس تشریف لاتے اور مدینہ کے بلند راستوں پر نظر پڑتی تو حُب مدینہ کی بنا پر ناکہ کو تیز کر دیتے
یا کوئی سواری ہوتی تو اسے تحریک فرماتے۔

دش) اور مدینہ کی واپسی کے بعد ام سنان اور ام معقل

ام معقل کے قصہ میں روایات کا اضطراب

وغیرہ سے فرمایا کہ رمضان کا عمرہ میرے ساتھ حج کے برابر

ہے۔ اور اس شخص کا وہم ہے جس نے یہ کہا کہ یہ ارشاد مدینہ سے تشریف لے جانے سے قبل فرمایا تھا۔
جیسا کہ مدینہ سے تشریف لے جانے کے بیان میں اس پر تنبیہ گذر چکی ہے۔ جس خاتون کو یہ ارشاد فرمایا
تھا اس کے نام کی تعیین میں روایات مختلف ہیں۔ بخاریؒ باب حج النساء میں ہے کہ یہ ارشاد ام سنان
کو فرمایا تھا۔ اوشیح قدس سرہ لامع میں باب عمرۃ فی رمضان میں فرماتے ہیں: یہ حدیث جو اس باب میں
مصنف نے ذکر کی ہے اس باب کی صحیح تر روایت ہے، پس ابو داؤد میں اس عورت کا جو قصہ مروی ہے
اسے یا تو بخاری کی روایت کی طرف راجع کیا جائے یا غلطی کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ اھ اور لامع کے
حاشیہ میں ہے کہ شیخ کا قول یا غلطی کی طرف منسوب کیا جائیگا۔ اس قول پر مبنی ہے کہ ام سنان اور ام معقل
دونوں ایک ہی خاتون کے نام میں جیسا کہ عینیؒ نے نقل کیا ہے، اور ابو داؤد کی روایت کو خطا کی طرف منسوب

ان عمرۃ فی رمضان تعدل حجة معی۔

ترجمہ: کہ رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے مساوی ہے۔

کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کی روایت میں اضطراب ہے اور اس کا لفظ کے نزدیک یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ متعدد واقعات ہیں: ”آھر۔

میں کہتا ہوں کہ ابو داؤد نے ام معقل کا قصہ مختلف طرق و روایات سے ذکر کیا ہے، اوشیخ نے بدل میں اس موقع پر لکھا ہے کہ ”اس حدیث میں بہت ہی اضطراب ہے“ اور اضطراب کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے اس اشکال کو رفع کرنے سے تعرض کیا ہو۔ بجز اس کے جو مولانا محمد یحییٰ مرحوم نے اپنے شیخ کے افادات سے نقل کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ”قصہ امی معقل کی روایات متعارض ہیں۔ ان روایات میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ ابو معقل کے پاس ایک اونٹ سواری کے لئے تھا اور ایک زراعت کے لئے۔“ ”الح“ پوری تفصیل بدل میں دیکھی جائے۔ اور حافظ ام سنان کا قصہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ”اسی نوعیت کا قصہ ام معقل کا بھی ہے، جو نسائی اور ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ دو قصے الگ الگ ہیں۔ جو دو عورتوں کو پیش آئے۔ اور اسی قسم کا ایک قصہ ام طلیق کا ہے جو ابن السکن اور ابن مندہ نے نقل کیا ہے۔ ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ ام معقل اور ام طلیق ایک ہی عورت کے دو نام ہیں۔ مگر ان کا خیال محل نظر ہے۔ کیونکہ امی معقل کا انتقال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوا اور ابو طلیق آپ کے بعد مدت تک زندہ رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں عورتیں جدا جدا ہیں۔ نیز دونوں روایتوں کے سیاق کا مختلف ہونا بھی ان کے تغایر پر دلالت کرتا ہے۔ اور بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں انصار کی ایک عورت کا جو لفظ مبہم واقع ہوا ہے اس کی تفسیر ام سنان یا ام سلیم ہی کے ساتھ کرنا ناگزیر ہے۔ کیونکہ حدیث ابن عباسؓ کا قصہ دوسری احادیث کے قصہ سے مختلف ہے نیز ابن عباسؓ کی حدیث میں اس عورت کو ”انصاریہ“ کہا گیا ہے۔ جب کہ ام معقل کا تعلق بنو اسد سے ہے۔ اور یہی واقعہ ہمیشہ کو بھی پیش آیا۔ واللہ اعلم۔“ انتہی۔

(ارشاد نبوی) کہ ”رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے

رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے“ مساوی ہے۔ ”معنی“ ”میرے ساتھ“ کا لفظ بعض روایات میں نہیں۔

مگر ابو داؤد کی روایت میں موجود ہے۔ اور امام بخاری نے بھی باب حج انسادیں یہ لفظ ذکر کئے ہیں! ...

”تقفی حجتاً او حجتہ معی“ یعنی بدل ہے حج کا، یا فرمایا میرے ساتھ کے حج کا، اور ابن حجرؒ کی شرح مناسک نووی میں رمضان کے عمرہ کی تفصیلت میں ابن حبان وغیرہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔ ”آحد احد حاشیہ لامع میں ہے کہ کرمانی کہتے ہیں: اگر تم کہو کہ حدیث کا تقاضا بظاہر یہ ہے کہ جو عمرہ رمضان میں ادا کیا جائے وہ حجتہ الاسلام (حج فرض) کے قائم مقام ہے۔ تو کیا واقعی رمضان کے عمرہ سے حج فرض ادا ہو جاتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ ثواب میں حجتہ الاسلام کی مثل ہے اور قائم مقام نہ ہونے کا قرینہ اجماع ہے۔ اور ترمذی نے اسحاق بن راہویہؒ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کا مضمون اس حدیث کی نظیر ہے جس میں آتا ہے کہ قل هو اللہ احد یعنی سورہ اخلاص آیت قرآن کے برابر ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں: ”تقفی حجتاً او حجتہ معی“ کا مفہوم انعام ہے۔ پس عمرہ کے ساتھ رمضان مبارک مل جائے تو وہ حج کا اثر حاصل کر لیتا ہے۔ ابن جوزیؒ کہتے ہیں: یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ عمل میں شرف وقت کے شامل ہونے سے اس کے ثواب میں اضافہ ہو جاتا ہے، جس طرح حضور قلب اور خلوص نیت سے اضافہ ہوتا ہے، ابن التین کہتے ہیں کہ عمرہ کے حج کی مثل ہونے میں احتمال ہے کہ وہ اپنے باب پر ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ رمضان کی برکت سے ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ شرف صرف اس عورت کے ساتھ مخصوص ہو، جیسا کہ بعض سلف سے منقول ہے، چنانچہ سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا ہم تو اس تفصیلت کو صرف اسی خاتون کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں۔“ اور سنن ابوداؤد میں ام معقل سے روایت ہے کہ: ”حج حج ہے، عمرہ عمرہ ہے، پس میں نہیں جانتی کہ یہ صرف میرے لئے ہے یا سب لوگوں کے لئے“ مگر ظاہر یہی ہے کہ اسے عموم پر محمول کیا جائے۔ اور علامہ عینیؒ نے تفصیل سے ان حضرات صحابہؓ کے اسماء گرامی ذکر کئے ہیں جن سے یہ حدیث مروی ہے۔ چنانچہ اس حدیث کو بروایت ترمذی شریف ام معقل سے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں اور اس باب میں ابن عباسؓ، جابرؓ، ابو ہریرہؓ، انسؓ اور وہب بن خنیس سے احادیث مروی ہیں یہ نام تو امام ترمذی نے ذکر کئے ہیں، اور علامہ عینیؒ نے اس پر یوسف بن عبد اللہ، ابوطیلق اور ام طلیق کے ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ اور عینیؒ نے ان روایات کی تخریج خوب بسط سے کی ہے۔ اور ان میں سے بہت سی روایات میں کسی مخصوص عورت کا ذکر کئے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ رمضان کا عمرہ

حج کے برابر ہے۔ حافظ کہتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے عمرے کئے اشہر حج میں کئے، اور حدیث الباب سے رمضان کے عمرہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے پس ان دونوں میں سے افضل کونسا ہوا؟ را شہر حج کا عمرہ یا رمضان کا؟ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے لئے تو رمضان ہی کا عمرہ افضل ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وہی افضل تھا جو آپ نے کیا۔ کیونکہ اہل جاہلیت کے نزدیک اشہر حج میں عمرہ ممنوع تھا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً و عملاً ان کی تردید کا قصد کیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اس کے بیان جواز کے لئے تھا۔ لہذا یہ اگر دوسروں کیلئے مکروہ بھی ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہی افضل تھا، حاشیہ لامع کا مضمون ختم ہوا۔

میں نے ان چند اوراق میں جن مضامین کے ذکر کرنے کا ارادہ کیا

خاتمہ رسالہ

تھا یہاں ان کا اختتام ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حمد و توفیق سے

بروز ہفتہ ۲۴ مارچ مبارک ربیع الاول کی صبح کو اسی سال اس سے فراغت ہوئی، جو آغاز رسالہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی رشد و صواب کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔ پس اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی حمد اور حسن توفیق سے ایک دن رات اور نصف رات میں یہ رسالہ مکمل ہوا۔ البتہ حواشی کا اضافہ متفرق اوقات میں ہوتا رہا۔ اس رسالہ کی تالیف جیسا کہ آغاز رسالہ میں ذکر کیا جا چکا ہے، ۱۳۷۲ھ میں ہوئی تھی، پس جب کبھی ناخذ و مراجع کی ضرورت پیش آتی تو متقدمین کی شروح حدیث اور کتب مشہورہ مثلاً فتح اور عینی وغیرہ کا حوالہ دے دیتا تھا۔ اور طویل عبارتوں کو نقل کرنے کی بجائے صرف حوالہ پر کفایت کرتا، پھر جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اجز المسالک، الکوکب الدرری اور لامع الدراری کی تالیف کی توفیق عطا فرمائی اور ان میں یہ عبارات اور نقول سب جمع ہو گئیں تو اس رسالہ میں صرف ان کے حوالے اور اقتباس پر اکتفا کیا، تاکہ مراجعت میں سہولت ہو، اور جب بعض احباب کے اصرار پر اس

رسالہ کی طباعت کا ارادہ ہوا تو چونکہ ضعف بصر کی بنا پر خود مراجعت سے مفذور تھا۔ اس لئے عزیز داماد مولوی محمد عاقل استاذ حدیث مظاہر العلوم سہارن پور اور عزیز داماد مولوی محمد سلمان مدرس مدرسہ مظاہر العلوم نے اس کو پڑھا، رسالہ کے بین السطور اور حاشیہ میں جن احادیث و عبارات کی طرف اشارات تھے۔ میں نے ان دونوں عزیزوں سے ان کے نقل کرنے کی فرمائش کی چنانچہ ایک پڑھتا رہا اور دوسرا نقل کرتا رہا۔ اور میں منتظر رہا۔ پس میں نے تنقیح اور اختصار کے ساتھ ان عبارات کو لیا، اور جہاں یہ اشارات

اس رسالہ میں مختصر تھے اور وہ مباحث کتابوں میں مبسوط اور بہت سے فقہی نوامد پر مشتمل تھے۔ وہاں بقدر ضرورت ان اشارات کی وضاحت کر دی اور ناظرین کے لئے اوجز اور لامع وغیرہ کتابوں کا حوالہ دے دیا۔

اور عزیز مولوی محمد یوسف جو پوری سلمہ استاذ حدیث مدرسہ مظاہر علوم نے اس رسالہ کو گہری نظر سے دیکھا اور بعض مقامات میں کچھ اضافے بھی کئے، اللہ تعالیٰ ان تینوں عزیزوں کی مساعی کو قبول فرمائے، اور جن لوگوں نے اس رسالہ میں اور میری دوسری تالیفات میں اعانت کی اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے:

والحمد لله اولاً و آخراً، والصلوة والسلام

الاتمنان الاكملان علی سید الانس

والجنان صلوةً وسلاماً دائماً

متلازمین الیوم

الدین ۵

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَالْعِزَّةَ

عمر الشبلی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حادثہ مصلیا و مسکاً، و بعد، جب میں جز جہ الوداع کے سننے سے فارغ ہوا اور اس کی تبیین و بیع الاخر کی
 آخری جمعرات کی صبح کو پوری ہوئی تو میں نے جمادی الاولیٰ کی پہلی بدھ کو دوپہر کے قیلولے میں یہ خواب دیکھا کہ ایک شخص
 مجھے حکم دیتا ہے کہ میں جز جہ الوداع کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عروں کے بیان سے کروں اور اس نے کہا کہ جز
 جہ الوداع کی تکمیل کے لئے آپ کے عروں کی تفصیل ضروری ہے، پس خواب ہی میں میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی،
 اور کاغذ قلم لے کر اپنے قلم سے لکھنے لگا، اس وقت گویا مجھے نہ آنکھ کی تکلیف ہے، نہ کوئی اور عارضہ ہے۔ اور میں نے
 خواب ہی میں ”حدیث جواز“ کے دو جملوں کی شرح لکھ دی۔ پہلا جملہ جامع الطریق طریق المدنیۃ۔ اور دوسرا
 جملہ فاصحہ بمکتب کبانت۔ اس کے بعد میں (خواب ہی میں) ایک تبلیغی اجتماع کے لئے گیا۔ آگے بڑا طویل خواب
 ہے جو اس دن دیکھا تھا خواب سے بیدار ہوا تو مجھے اس خواب پر بہت ہی حیرت ہوئی، کیوں کہ ان بہت سے امراض
 کے علاوہ جو اس زمانہ میں مجھے عارض ہیں ایک جیسے سے تو آنکھ کی بھی شدید تکلیف ہے چنانچہ دو ہفتے تک اس سلسلہ
 میں ستیجہ اور متاعل رہا، کبھی اس کام کا ارادہ کر لیتا اور کبھی توڑ دیتا، مگر اس دور کے مشائخ، مثلاً مولانا الحاج انعام الحسن
 کاندھلوی امیر تبلیغ دہلی، مولانا الحاج ابوالحسن علی ندوی شیخ التفسیر و انظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا الحاج مفتی محمود
 حسن گنگوہی رئیس الافکار دار العلوم دیوبند وغیرہ نے اس خواب کی تعمیل پر بہت ہی اصرار فرمایا، پس بہت ہی پس و پیش کے بعد

اللہ عز و جل اس سے مدد مانگتے ہوئے اور اس کی رحمت کی امید کرتے ہوئے، جمادی الاول ۱۲۹۰ھ کو بروز چار شنبہ اس کا آغاز کر دیا اور اس رسالہ میں پانچ تفصیلی لکھنے کا ارادہ کیا،

فصل اول = عمرہ کی تعریف، اس کے حکم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کی تعداد کے بیان میں۔

فصل دوم = عمرہ حدیبیہ میں ————— فصل سوم = عمرہ القضاء میں

فصل چہارم = عمرہ جبرائیل میں — اور جو عمرہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے ساتھ ادا کیا تھا۔ اس کا بیان جزیرہ حجة الوداع میں گزر چکا ہے۔

فصل پنجم = متفرق مسائل میں۔ مثلاً ان سقیم روایات پر بحث جو ابواب عمروں میں وارد ہیں اور دیگر مباحث — اور میں نے اس رسالہ کی بنیاد ”مواہب لدنیہ“ اور ”تاریخ مخیس“ پر رکھی، جیسا کہ جزیرہ حجة الوداع کی بنیاد حافظ ابن قیم کی کتاب ”مکرم المصابیح“ پر رکھی کیوں کہ حجة الوداع کے بیان میں وہ ان تمام کتابوں کی بر نسبت جو میرے پاس موجود تھیں، سب سے زیادہ جامع تھی، اسی طرح عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں میں نے ان دونوں کتابوں کو، میرے پاس موجود کتب کی بر نسبت، زیادہ جامع پایا۔ واللہ سبحانہ العزیز صلی علیہ وسلم۔

فصل اول

اس میں چند فوائد ہیں —

پہلا فائدہ = عمرہ کے لغوی و اصطلاحی معنی میں — زرقانی کہتے ہیں کہ عمرہ (میں کے ضمیر اور محترم اور سکون کے ساتھ، نیز میں کے فتح اور ہم کے سکون کے ساتھ) کہا گیا ہے کہ لغت میں اس کے معنی ہیں کسی آباد جگہ کا قصد کرنا۔ اور اجازت میں ہے کہ لغت میں عمرہ زیارت کو اور بقول بعض قصد کہتے ہیں، اور امام راغب فرماتے ہیں کہ عمارۃ، نقیض ہے ویرانی کی، اور اعتماد عمرہ ایسی زیارت کا نام ہے جس میں محبت کی تعمیر ہو اور شرعی اصطلاح میں قصد مخصوص کا نام عمرہ ہے۔ آہ اور فتح الباری میں ہے کہ کہا گیا ہے کہ عمارۃ المسجد الحرام سے مشتق ہے۔ آہ اور شریعت میں عمرہ نام ہے بیت اللہ شریف کی زیارت کا، خاص کیفیت اور خاص شرائط کے ساتھ۔ اور جامع کے حاشیہ میں امام راغب کے کلام میں یہ اضافہ کیا ہے کہ ”حق تعالیٰ کا ارشاد تھا یصبر مساجداً، یا تو عمارۃ سے ہے، جس کے معنی ہیں اس کی عمارت کی حفاظت کرنا، یا یہ عمرہ ہے جس کے معنی ہیں زیارت کے، یا یہ ان کے قول: عَمَرْتُ بِمَكَانٍ كَذَا سے ماخوذ ہے،

یعنی میں نے فلاں جگہ اقامت اختیار کی۔ اعداد و مختار میں ہے کہ ”عموماً ہے احرام، طواف، سعی، حلق یا قصر کرانے کے پس احرام شرط ہے، اور طواف کا بیشتر حصہ رکن ہے اور باقی چیزیں واجب ہیں“ اعداد یہی قول مذہب میں رائج ہے جیسا کہ ماضی قادی نے شرح باب میں تفصیل سے لکھا ہے اور ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ سعی رکن ہے اور کہا ہے کہ قول مذہب میں غیر مشہور ہے۔ اور علامہ درودیر (مالکی) کہتے ہیں: ”اور ان دونوں یعنی حج اور عمرہ کے رکن تین ہیں:۔ (۱) احرام ۲ طواف ۳ سعی، اور حج ایک چوتھے رکن کے ساتھ مختص ہے اور وہ ہے ”وقوف عرفہ“۔ اہ مختصراً۔

دوسرا غائدہ: عمرہ کے حکم میں: لامع کے حاشیے میں ہے کہ ائمہ کا مسلک نقل کرنے میں ناقیلین مذاہب نے اختلاف کیا ہے، اور غالباً یہ اختلاف اس بنا پر رونما ہوا کہ ائمہ سے روایات مختلف ہوں گی۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ ”ایک قوم نے کہا ہے کہ عمرہ واجب ہے۔ امام شافعی، امام احمد، امام ثوری، اور امام اوزاعی اسی کے قائل ہیں اور صحابہ رضی سے حضرت ابن عباسؓ کا اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ امام مالکؒ اور ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ سنت ہے اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ نقل ہے۔ ابو ثور اور داؤد بھی اسی کے قائل ہیں۔ اہ اور ابن قدامہ کہتے ہیں: جس شخص پر حج واجب ہے اس پر عمرہ بھی واجب ہے۔ یہ امام احمدؒ کی ایک روایت ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ واجب نہیں۔ اہ اور فقہ حنبلی کی کتابوں نیل المآرب اور الروض المربع وغیرہ میں پہلی روایت کو مختار قرار دیا ہے اور نہ کہی کہتے ہیں کہ جمہور اصحاب (حنابلہ) نے اسی پر جزم کیا ہے اور ان سے یعنی امام احمدؒ سے ایک نواہ یہ ہے کہ وہ سنت ہے۔ ہاشافیہ کا مسلک؟ تو ان کی عام کتابوں میں یہ ہے کہ ائمہ روایت میں فرض ہے اور امام ترمذیؒ نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ سنت ہے اور شافعیؒ نے اس قول کی تاویل یہ کی ہے کہ سنت سے وجوب مراد ہے۔ رہا مالکیہ کا مسلک؟ تو درودیر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ عمرہ کو ناہر شخص کے لئے سنت ہے۔ اور نہ قادی کہتے ہیں کہ یہ سنت مؤکدہ ہے اور یہی قول مذہب (مالکی) میں مشہور ہے۔ رہا ہمارے حنفیہ کا مسلک؟ تو شرح کتاب میں ہے کہ عمرہ مختار قول کے مطابق سنت مؤکدہ ہے اور ایک قول یہ ہے کہ واجب ہے، ماضی نے اسی کو صحیح کہا ہے اور صاحب بدائع نے اسی پر جزم کیا ہے اور ہمارے بعض اصحاب سے مروی ہے کہ وہ فرض کفایہ ہے۔ اہ مختصر من الاوجز اور اوجز میں ائمہ کے مذاہب و دلائل کو خوب تفصیل سے لکھا ہے۔ اور حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ عمرہ کے وجوب میں علماء کے دو مشہور قول ہیں اور یہ دونوں امام شافعیؒ کے قول اور امام احمدؒ کی دو روایتیں ہیں اور ان دونوں کے اصحاب مذہب کے یہاں وجوب

کا قول مشہور ہے۔ لیکن عدم وجوب کا قول اکثر علماء مثلاً امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے اور یہ دونوں قول بعض صحابہ سے منقول ہیں اور یہ اظہر ہے کہ عمرہ واجب نہیں۔ بعد ازاں انہوں نے استدلال میں طویل کلام کیا ہے۔ ایک مقام پر حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ”یہ (عدم وجوب کا) قول زیادہ راجح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: وَلِلّٰهِ حُلٰی النَّاسِ حج البیت میں حج کو واجب کیا ہے، عمرہ کو واجب نہیں ٹھہرایا، البتہ جو شخص حج و عمرہ شروع کر لے اس کے ذمہ ان کے پورا کرنے کو واجب ٹھہرایا ہے اور ابتداء میں صرف حج کو واجب کیا ہے، اسی طرح تمام احادیث صحیحہ میں صرف وجوب حج کا ذکر آیا ہے۔“

تیسرا فائدہ: تکرار عمرہ کے مکمل میں، عینی کہتے ہیں ”جانتا چاہیے کہ امام شافعیؒ اس طرف گئے ہیں کہ ایک ہی سال میں کئی مرتبہ عمرہ کا تکرار مستحب ہے۔ اور امام مالکؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ ایک سال میں ایک سے زیادہ عمرے کرنا مکروہ ہے اور ابن قدامہؒ کہتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کا قول ہے کہ ایک مہینے میں ایک سے زیادہ عمرے نہ کرے، اور امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ پانچ دنوں میں عمرہ مکروہ ہے، یوم عرفہ، یوم النحر اور ایام تشریق۔ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ یوم عرفہ اور ایام تشریق ان چار دنوں میں مکروہ ہے۔ اھ اور موفقؒ کہتے ہیں کہ کوئی مضائقہ نہیں کہ آدمی سال میں کئی مرتبہ عمرہ کرے لیکن زیادہ عمرے کرنا سلف کے ظاہر قول میں مستحب نہیں اور ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ زیادہ عمرے کرنا مستحب ہے۔“ اھ اور موطا میں ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا: میں کسی کے لئے مناسب نہیں سمجھتا کہ سال میں کئی مرتبہ عمرہ کرے۔“ اھ اور آج نہیں بنے کہ یہاں جمع کا اطلاق مافوق الواحد پر ہوا ہے پس دوسری مرتبہ یا اس سے زیادہ عمرہ کرنا مکروہ ہوگا، کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کل چار عمرے کئے، ہر سال میں ایک عمرہ کیا، باوجودیکہ آپؐ ایک سال میں کئی کئی عمرے کر سکتے تھے، ہاں اگر اس مکروہ عمل کو شروع کر لیا تو اس کا پورا کرنا واجب ہوگا کیوں کہ وہ جائز کی قسم سے ہے اور جمہور علماء اور بہت سے مالکیہ نے تکرار عمرہ کو بلا کر اہمیت جائز رکھا ہے، کیوں کہ حدیث میں ہے کہ ”ایک عمرہ، دوسرے عمرہ تک دونوں کے مابین کے گناہوں کے لئے کفارہ ہے۔“ یہاں تک کہ ابن عبد البرؒ نے مبالغہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ جو شخص اس کو مکروہ کہتا ہے اس کے پاس کتاب و سنت میں سے کون سی دلیل ہے جس کا تسلیم کرنا واجب ہو۔ یہ بات ذرا قافیٰ نے کہی ہے اور پوری تفصیل آج نہیں ہے۔ اور شرح مہذب میں ہے کہ ”ہمارا مذہب یہ ہے کہ سال میں کئی بار عمرہ کرنا مکروہ نہیں، بلکہ سنت ہے۔“ امام ابو حنیفہؒ امام احمدؒ اور سلف و خلف کے جمہور علماء اسی کے قائل ہیں۔ البتہ حن بصریؒ، ابن سیرینؒ اور مالکؒ فرماتے ہیں کہ سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ عمرہ کرنا مکروہ ہے۔“ اھ اور شرح تہذیب میں ہے کہ پورے سال میں کثرت سے عمرے کرنا مکروہ

نہیں بلکہ جمہور کے قول کے مطابق مستحب ہے البتہ امام مالکؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔ اھ

چوتھا فائدہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عروں کی تعداد کے بیان میں: اس سلسلہ میں روایات میں بہت ہی اختلاف ہے۔ معروف، معتمد اور مرتجح طہار کے نزدیک وہ ہے جو سنن ابی داؤد میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے، عمرہ حدیبیہ، دو سر اجب کہ کفار نے آئندہ سال آپ کے عمرہ کرنے پر اتفاق کیا۔ تیسرا جعرانہ سے ادرچ تھا جو آپ نے اپنے حج کے ساتھ کیا۔“ یہ روایت امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے بالفاظ مختلف نقل کی ہے اور زرقانی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے چنانچہ صحیحین، سنن ترمذی اور ابی داؤد میں حضرت قتادہ (تابعی) سے روایت ہے کہ میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے حج کئے؟ فرمایا: ایک۔ اور آپ نے عمرے چار کئے۔“

الحدیث۔ اھ۔ اور حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد چار عمرے کئے جو سب کے سب ذیقعدہ میں ہوئے۔ پہلا عمرہ حدیبیہ۔ یہ سب سے پہلا عمرہ تھا جو حبشہ میں ہوا مگر مشرکین نے آپ کو مقام حدیبیہ میں آگے جانے سے روک دیا۔ اس لئے آپ نے اسی مقام پر قربانی کے اونٹ (بدن) نحر کئے دوم عمرہ القضیہ، جو اگلے سال ہوا، چنانچہ آپ مکہ میں داخل ہوئے وہاں تین دن قیام فرمایا۔ اور عمرہ پورا کر کے واپس لوٹ آئے۔ سوم وہ عمرہ جو آپ نے حج کے ساتھ ادا کیا کیوں کہ آپ قان تھے، چہارم وہ عمرہ جو جعرانہ سے ادا فرمایا جب کہ آپ حبشہ میں تشریف لے گئے تھے چنانچہ آپ وہاں سے مکہ کی جانب واپس آئے، پس جعرانہ سے عمرہ کیا چنانچہ صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے جو سب کے سب ذیقعدہ میں ہوئے، سوائے اس عمرہ کے جو آپ نے حج کے ساتھ ادا فرمایا۔“ الخ اور اس روایت کے وہ روایت مناقض نہیں جو صحیحین میں حضرت برابر بن عازبؓ سے مروی ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجے قبل ذیقعدہ میں دو عمرے کئے۔“ کیونکہ حضرت برابر بن عازبؓ کی مراد یہ ہے کہ ایسے دو مستقل عمرے کئے جو پورے بھی ہوئے اور کوئی شک نہیں کہ وہ دہری تھے، کیونکہ عمرہ قرآن مستعمل نہیں تھا، اور عمرہ حدیبیہ پورا نہیں ہو سکا، بلکہ آپ کو اس سے روک دیا گیا تھا اور ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے۔“ الحدیث۔ یہ حدیث امام احمدؒ نے روایت کی ہے اور حضرت انسؓ کے اس قول کے درمیان کہ ”سب عمرے ذیقعدہ میں ہوئے سوائے عمرہ قرآن کے“ اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کے درمیان کہ ”رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے کوئی عمرہ نہیں کیا مگر ذیقعدہ میں۔“ کوئی تناقض نہیں کیوں کہ عمرہ قرآن کی ابتداء ذیقعدہ میں ہوئی تھی اور انتہا ذوالحجہ میں اس وقت ہوئی جب کہ آپ کا حج پورا ہوا، پس حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے ابتداء کی خبر دی اور حضرت انسؓ نے انتہائی۔ لیکن ابن عمرؓ کا یہ قول کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کیے، ان میں سے ایک رجب میں ہوا۔ پس یہ ان کا وہم ہے (رضی اللہ عنہ) حضرت عائشہؓ کو جب ابن عمرؓ کے اس قول کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ ابو عبد الرحمن پر رحم کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمرہ بھی کیا وہ (ابن عمرؓ) اس موقع پر موجود تھے۔ مگر آپؐ نے کبھی رجب میں عمرہ نہیں کیا۔“ باقی ربی وہ روایت جو دارقطنی نے حضرت عائشہؓ سے نقل کی ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان میں عمرہ کے لئے نکلی، پس میں نے روزہ رکھا اور آپؐ نے افطار کیا، آپؐ نے نماز قصر کی اور میں نے پوری پڑھی، پس میں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ قربان ہوں، آپؐ نے انتظار کیا اور میں نے روزہ رکھا، آپؐ نے قصر کیا اور میں نے نماز پوری پڑھی۔ آپؐ نے فرمایا: عائشہ! تو نے اچھا کیا۔ پس یہ حدیث غلط ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی رمضان میں عمرہ نہیں کیا، اور آپؐ کے عمروں کی تعداد اور ان کا وقت دونوں طے شدہ چیز ہیں۔ اور حدیث کے جواب میں ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُم المؤمنینؓ پر رحم فرمائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں کبھی عمرہ نہیں کیا اور خود عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپؐ نے صرف ذیقعدہ ہی میں عمرہ کیا ہے، ان کا یہ قول ابن ماجہ وغیرہ نے نقل کیا ہے اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ آپؐ کے عمرے چار سے زائد نہیں تھے۔ اب اگر جب کا عمرہ بھی ہو تو پانچ اور اگر رمضان المبارک میں بھی کیا تو چھ ہونگے اور یہ کہنا کہ بعض عمرے رجب اور بعض رمضان میں اور بعض ذیقعدہ میں ہوئے و خلاف واقع ہو گا جب کہ واقعہ یہی ہے کہ آپؐ کے عمرے ذیقعدہ ہی میں ہوئے جیسا کہ حضرت انسؓ، ابن عباسؓ اور عائشہؓ نے بیان فرمایا۔ امام مالکؒ موطائیں نقل فرماتے ہیں کہ انہیں یہ بات پہنچی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین عمرے کئے ہیں۔ حدیبیہ والے سال، قضاہ والے سال، جعراندہ والے سال، علامہ باجی کہتے کہ ان کا تین عمرے بتانا ان کے اپنے مذہب کے موافق ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج قرآن ادا فرمایا تھا وہ چار عمرے شمار کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ امام مالکؒ نے حج والا عمرہ اس لئے ذکر نہیں کیا کہ وہ حج ہی میں داخل ہے، حاصل یہ کہ جو حضرات چار عمروں کے قائل ہیں وہ حدیبیہ والا عمرہ بھی شمار کرتے ہیں، کیوں کہ اس میں عمرہ کے بہت سے احکام مثلاً احرام، شکار، خوشبو، میتات، لباس، احصار، فدیہ، ذبی، حلق، قصر اور خمر وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ علامہ باجی کہتے ہیں کہ اسے عمرہ کہنا اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ عمرہ امام مالکؒ کے نزدیک تمام سمجھا جائے، اگرچہ اس میں میت اللہ شریف سے روک نہ ہو یا گیا اور ایسے شخص پر قضا نہیں ہوتی جسے میت اللہ شریف

سے روک دیا گیا ہو۔ حافظ کہتے ہیں کہ ابن اسبن فرماتے ہیں کہ لوگوں کا عمرہ حیدریہ کو شمار کرنا جس میں کہ بیت اللہ شریف سے روک دیا گیا تھا اس کے کامل عمرہ ہونے کی دلیل ہے اور اس میں جہور کے اس قول کی صحت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جو شخص بیت اللہ شریف سے روک دیا گیا ہو اس پر قضا واجب نہیں اور یہ قول احناف کے خلاف ہے۔ تب میں کہتا ہوں کہ اس بحث کی تفصیل عمرہ القضا کے بیان میں آئے گی اور اسی طرح حضرات علماء نے عمروں کی نہرست میں آپ کا وہ عمرہ بھی شامل کر لیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ج مبارک کے ساتھ تھا اس لئے کہ تارن وہی ہوتا ہے جو حج و عمرہ مکے ادا کرتا ہے اور جو حضرات آپ کے تین عمرے بتلاتے ہیں، لیکن ہے کہ وہ حج والے عمرے کو اسی میں داخل اور تابع بھی کر شمار نہ کرتے ہوں یا جہرانہ والے عمرے کو شمار نہ کرتے ہوں کیونکہ وہ رات میں ہونے کی وجہ سے معنی رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہرانہ میں بوقت صبح ایسے ہی موجود تھے گویا رات دیں گزار رہی تھی، یا پھر حیدریہ والے عمرے کو شمار نہ کرتے ہوں گے کہ وہ پورا والا نہ ہو سکا تھا اور جو حضرات کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دوبارہ عمرہ کیا تو انہوں نے عمرہ الحج کو (داخل حج) اور عمرہ الحیدریہ کو اتمام سمجھتے ہوئے شمار نہیں کیا بلکہ صرف ان دو عمروں کو شمار کیا جو مستقل اور کامل واقع ہوئے جیسا کہ حافظ ابن قیم کے کلام میں گزرا اور ممکن ہے کہ انہوں نے حیدریہ اور قضا والے عمروں کو شمار کیا ہو اور جہرانہ والا ان پر مخفی رہا ہو۔ البتہ یہ تو ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث میں درست نہ ہوگی کہ آپ نے صرف دوبارہ عمرہ کیا۔ کیوں کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ابو عبد الرحمن پر رحم فرمائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمرہ بھی کیا ان کی موجودگی میں کیا اور یہ کہ آپ نے چار عمرے کئے۔ الخ جیسا کہ لایع کے حاشیے میں امام احمد و ابو داؤد رحمہما اللہ کی روایت سے منقول ہے۔ پس ظاہر یہی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث میں صرف ان دو عمروں کو شمار کیا ہے جو مستقل طور پر پورے ادا کئے گئے یعنی عمرہ القضا اور عمرہ جہرانہ۔

فصل دوم، عمرہ حیدریہ کے بیان میں

حیدریہ کا کچھ حصہ حرم میں شامل ہے : یہ عمرہ مقام حیدریہ کی جانب منسوب ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی جگہ بیت اللہ شریف سے روک دیا گیا تھا اور اسی جگہ صلح، بیعت رضوان، حلق اور تحریغ و غیر بہت سے اہم واقعات پذیر ہوئے، حیدریہ؛ حامیہ کے منہ وال کے فتح یا نے تھانیہ کے سکون اور بام کے کسر کے ساتھ۔ اہل عراق اسے تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اہل حجاز بغیر تشدید کے یہ دراصل ایک کنوئیں کا نام تھا جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت براہ سے منقول ہے، اسی کنوئیں کے نام پر اس جگہ کو حیدریہ کہا گیا اور ایک قول یہ ہے کہ یہ درخت کا نام تھا۔

محبِ بڑی کہتے ہیں: ”یہ ایک بستی ہے جو زیادہ بڑی نہیں۔ مگر کمرہ سے ایک مرحلہ پر واقع ہے اس کا بیشتر حصہ حرم میں ہے اور باقی جل میں۔ اور یہ مگر کمرہ سے زمیل کے فاصلے پر واقع ہے۔“ نزقانی۔ پوری تفضیل اور تجزیہ ہے اور انھیں ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک یہ سب حرم میں داخل ہے۔ نیز اس میں اور ہدایہ میں ہے کہ حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں داخل ہے۔

کشف میں زعفرانی نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے اور کتاب الام میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ”حدیبیہ کا کچھ حصہ حل میں ہے اور کچھ حرم میں“ اور صحیح بخاری میں ہے کہ ”حدیبیہ حرم سے خارج ہے۔“ یعنی کہتے ہیں: ”اس کا حرم سے خارج ہونا جامع علیہ نہیں چنانچہ امام طحاویؒ نے حضرت مسروقؒ سے نقل کیا ہے کہ حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر حل میں تھا اور آپ کی نماز گاہ حرم میں تھی۔ اور ابن ماجہ میں ہے کہ ابن ابی شیبہؒ نے امام عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ۔ ”حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فودگاہ حرم میں تھی۔“ اور ابن قیمؒ حدیث کے فوائد میں لکھتے ہیں ”اور اس میں ایک طرح کی دلالت ہے اس امر پر کہ مگر کمرہ میں نماز کے مضاعف ہونے (ایک نماز پر ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملنے) کا مسئلہ تمام حرم سے متعلق ہے۔ صرف مسجد حرام کے ساتھ، جو کہ طواف کی جگہ ہے۔ خاص نہیں۔ اور خیمہ میں ہے کہ وہاں مسجد شجرہ ہے“ اور حدیبیہ اور مدینہ منورہ کے درمیان نو مرحلوں کا فاصلہ ہے اور حدیبیہ اور مگر کمرہ کے درمیان ایک مرحلہ کا ایک قول یہ ہے کہ یہ حرم میں داخل ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا بعض حصہ حرم میں شامل ہے۔ اور شفا الغرام میں ہے کہ ”مسجد شجرہ“ حدیبیہ میں ہے اور جس شجرہ کی طرف یہ منسوب ہے یہ وہی شجرہ ہے جس کے نیچے بیعت رضوان ہوئی تھی، یہ لیکر کا درخت تھا۔ جو لوگوں میں معروف تھا۔ یہ مسجد جدہ کے راستہ میں دہنی جانب واقع ہے اور یہ وہی مسجد ہے جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہاں نمازیں پڑھی تھیں اور وہاں ایک اور مسجد ہے مگر یہ دونوں مسجدیں اور خود چاہ حدیبیہ آج کل معروف نہیں“ اہ۔ حموی نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ ”صحیح اور درست یہ ہے کہ حدیبیہ کو تشدید سے اور جعرانہ کو بغیر تشدید کے پڑھا جائے۔“

عمرہ حدیبیہ کا سبب: صاحب فہم کہتے ہیں: ”اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس غزوہ کے لئے یعنی اس عمرہ کے لئے جس کی انتہا غزوہ پر ہوئی۔ نکلنے کا سبب یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کی طرف نکلنے سے پہلے مدینہ میں یہ خواب دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہ مسجد حرام میں داخل ہوئے اور آپ نے بیت اللہ شریف کی گنبن اپنے دست مبارک میں لی اور سب نے طواف و عمرہ کیا۔ پھر بعض نے حلق کرایا اور بعض نے

قصر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب صحابہ کرامؓ سے بیان فرمایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور یہ سمجھ کر وہ بس اسی سال کہ میں داخل ہوں گے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے عمرے کے ارادے کا اظہار فرمایا، اس پر انہوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے قبائل اور گروہوں کی تیسریاں کے اغراب کو ساتھ چلنے کے لئے فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ و قتال کا ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن آپؐ کو قریش کی جانب سے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ وہ آپؐ سے لڑائی کے لئے آمادہ ہوں گے یا آپؐ کو بیت اللہ شریف روکنے کی کوشش کریں گے اور بہت سے بددیوے نے آپؐ کے حکم کی تعمیل میں تاخیر کی۔

تفسیر جلالین میں آیت کریمہ: **لَقَدْ هَمَّ بِكَ اللَّهُ مَرْسُولَ الْوَحْيِ الْاٰیۃ** کے تحت لکھا ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سال کو حج سے پہلے خواب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ مکہ مکرمہ میں بے خوف خطر داخل ہو رہے ہیں اور طوق اور قصر کرا رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواب صحابہ کرامؓ سے ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نکلے تو کفار نے انہیں حدیبیہ میں روک دیا اور انہیں عمرو کے بغیر آنا پڑا تو انہیں نہایت شاق گذرا اور بعض منافقوں نے شکوک و شبہات پھیلانے شروع کئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔“

زرقانی کہتے ہیں فرمائی، عبد بن حمید اور بیہقی نے دلائل میں حضرت عطاءؓ نقل کیا ہے کہ ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہ آپ حدیبیہ میں فروکش تھے، یہ خواب دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہؓ بے خوف و خطر مکہ میں داخل ہو رہے ہیں اور سروں کا حلق اور قصر کرا رہے ہیں۔ لیکن جب حدیبیہ ہی میں حدیبی کے جانور ذبح کرنے پڑے تو صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ آپ کا خواب کیا ہوا؟ اس پر آیت: **لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الْوَحْيِ الْاٰیۃ** نازل ہوئی۔ اس روایت میں جس خواب کا ذکر ہے، یہ دوسرا خواب ہے جو آپؐ نے حدیبیہ میں دیکھا تھا ادب جس میں حق تعالیٰ کی جانب سے دوبارہ بشارت دی گئی تھی، اس کو آپؐ کے مدینہ سے چلے جانے کا سبب قرار دینا صحیح نہیں ہوگا۔“

میں کہتا ہوں اول کی تائید فتح کی اس عبارت سے ہوتی ہے جو حضرت عمرؓ کے اس قول: ”ادیس کنت متحدینا“ (کیا آپ ہم سے یہ نہیں فرماتے تھے الخ) کے ذیل میں ذکر کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ — ”واقعی کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ (کے لیے چلنے) سے پہلے یہ خواب دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہؓ بیت اللہ میں داخل ہوئے پھر جب ابن حنفیہ نے اس امر میں تاخیر دیکھی تو انہیں

نہایت شائق گزارا۔

مدینہ طیبہ سے روانگی: صاحب غیس کہتے ہیں پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل فرمایا۔ لباس زیب تن کیا۔ اور اپنی اڈٹنی تقوا پر سوار ہوئے اور مدینہ میں امی ام کلثوم کو اپنی جگہ قائم مقام فرمایا، غیس اور زرقانی میں اسی طرح ہے اور زرقانی نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ بعض لوگوں نے ابرہہ کلثوم بن حصین کا نام بھی ذکر کیا ہے۔ بلاذری نے یہ دونوں قول نقل کئے ہیں اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان دونوں کو مقرر فرمایا تھا اور ابن ام کلثوم نماز پر مامور تھے۔ ابن ہشام اور ان کے متبعین نے کہا ہے کہ خلیل بن عبد اللہ یثی کو مقرر کیا تھا اس لئے ممکن ہے کہ خلیل اور کلثوم دونوں کو امور عامہ پر مقرر فرمایا ہو اور ابن ام کلثوم کو امام مقرر کیا ہو۔

اور آپ حکم ذیقعدہ ۳۷ کو کہ یہی حدیبیہ کا سال کہلاتا ہے پیر کے دن مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے، زرقانی کہتے ہیں کہ ”جمہور علمائے سیر مشلاً امام نہیری، قتادہ، موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق، ابن سعد وغیرہ نے اسی طرح نقل کیا ہے اور فتح میں کہا ہے کہ ہشام بن عروہ نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رضل میں سفر کے لئے نکلے اور شوال میں عمو کیا، مگر یہ قول شاذ ہے اور ابوالاسود نے عروہ سے جمہور کے موافق روایت نقل کی ہے۔“ اور البیہقی والناہیہ میں — شوال میں عمو — کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے: ”یہ عروہ سے بہت غریب روایت ہے“ اور ابن قیمؒ کہتے ہیں ”یہ روایت دہم ہے اور عروہ کا قول صحیح روایت کے مطابق یہی ہے کہ عروہ ذی قعدہ میں ہوا، چنانچہ صحیحین میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار ٹرے کئے جو سب کے سب ذیقعدہ میں ہوئے، ان ہی میں عروہ حدیبیہ کا بھی ذکر ہے۔“ اور آپ نے اپنی زوجہ محترمہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو بھی ساتھ لیا۔

شکرہ حدیبیہ کی تعداد: اور سب کے ساتھ چودہ سو حضرات تھے جیسا کہ صحیحین میں حضرت براہؓ کی حدیث میں بروایت برائیل بن ابی اسحاق — مروی ہے اور کہا جاتا ہے کہ آپ کے ساتھ پندرہ سو افراد تھے۔ یہ روایت بھی صحیحین ہی میں سعید بن مسیب کی سند سے حضرت جابرؓ سے مروی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی تعداد تیرہ سو تھی۔ یہ روایت بھی صحیحین ہی میں حضرت عبداللہ بن ابی ادنیٰ سے مروی ہے اور ان مختلف روایات میں تطبیق۔ جیسا کہ فتح میں کہلے۔ یہ ہے کہ چودہ سو سے زائد تھے، پس جس نے زائد کا اعتبار کیا پندرہ سو کہا اور جس نے شمار نہیں کیا اس نے چودہ سو کہا، اس کی تائید بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ حضرت براہؓ فرماتے ہیں کہ وہ چودہ سو یا اس سے زیادہ تھے، یہاں ”یا“ سے مراد یہ ہے کہ چودہ سو کہہ

اس سے زیادہ تھے۔ اس سے وجہ تطبیق واضح ہو جاتی ہے اور نوویؒ نے اسی تطبیق پر اعتماد کیا ہے کیوں کہ روایات سب صحیح ہیں، اور یہی کامیلان ترجیح کی طرف ہے وہ کہتے ہیں کہ چودہ سو کی روایت زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ حضرت براءؓ، جابرؓ، سلمہ بن اکوعؓ، معقل بن یسارؓ اور مسیب بن حزنؓ اس پر متفق ہیں۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ اپنا قلبی رجحان زیادہ تر اسی طرف ہے، رہی تیرہ سو والی روایت! سو وہ راوی کی اطلاع پر محمول ہے۔ دوسرے حضرات کو دو سو زائد کی اطلاع ہوئی جن پر پہلے راوی کو نہ ہوئی اور زیادتی ثقہ کی مقبول ہوئی ہے۔ لہذا کم نقل کرنے والے کی روایت اس کے معارض نہیں اور حافظ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ”یہ کہا جائے کہ جو تعداد اس نے (تیرہ سو کے راوی نے) ذکر کی ہے یہ تو مدینہ سے روانگی کے وقت تھی اور زائد وہ تھے جو وہ بعد میں شامل ہوتے گئے یا یہ کہ اس نے صرف مقتاتین کی تعداد ذکر کی ہے اور زائد حشم و خدم، نابالغ بچے اور عورتیں تھیں اور ابن اسحقؒ کا یہ قول کہ سات سو تھے کسی نے اس کی تائید و موافقت نہیں کی۔ دراصل موصوف نے یہ بات حضرت جابرؓ کے اس قول سے استنباط کی ہے کہ ہم نے ایک ایک اونٹ دس دس آدمیوں کی جانب سے ذبح کیا تھا اور اونٹوں کی تعداد ستر تھی“

حالات کہ یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ انہوں نے اونٹوں کے علاوہ گائے، بکری ذبح نہیں کئے تھے مزید براءؓ یہ کہ بعض حضرات نے سرے سے احرام ہی نہیں باندھا تھا موسیٰ بن عقبہؒ نے اس پر جزم کیا ہے کہ ان کی تعداد سولہ سو تھی۔ ابن ابی شیبہؒ کی روایت میں حضرت سلمہ بن اکوعؒ کی حدیث میں۔ سترہ سو کی تعداد مذکور ہے اور ابن سعدؒ کی روایت میں ہے کہ وہ ایک ہزار پانچ صد پچیس نفر تھے۔ حافظ کہتے ہیں: ”ابن سعدؒ کی روایت اگر ثابت ہو تو اس میں تحریر بالغ سے کام لیا گیا ہے (یعنی ٹھیک ٹھیک پوری تعداد بیان کی گئی ہے، بعد ازاں ابی رزیدہؒ کی تخریج سے یہ تعداد مجھے بروایت ابن عباسؒ موصلاً بھی دستیاب ہوئی ہے۔ اہ مختصراً“

الہدیٰ میں بروایت صحیحین حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؒ سے نقل کیا ہے کہ ہم تیرہ سو تھے۔ قتادہؒ کہتے ہیں کہ ”میں نے سید بن مسیبؒ سے دریافت کیا کہ بیعت رضوان میں شریک ہونے والوں کی تعداد کتنی تھی؟ فرمایا پندرہ سو۔ میں نے کہا کہ حضرت جابرؓ تو چودہ سو بتاتے ہیں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے، انہیں سہو ہوا، خود انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پندرہ سو تھے۔“ ۱۰۰ اور حنفیہ کے

پندرہ سو کی تعداد ہی راجح ہے، جیسا کہ ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب من اسہم لہ سهم میں اس کی تصریح موجود ہے، چنانچہ اس میں حضرت مجمع بن جابر انصاریؓ سے جہان قادیوں میں سے ایک تھے جنہوں نے قرآن کریم یاد کیا، روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: ”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ میں حاضر ہوئے جب وہاں سے واپس لوٹے تو لوگ اونٹ دوڑانے لگے، آگے حدیث میں سورۃ فتح کے نزول کا قصہ مذکور ہے اور اس روایت کے آخر میں ہے کہ حذیفہ بن یمان غنیمت، اہل حدیبیہ پر تقسیم کیا گیا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اٹھارہ حصے کئے، پندرہ سو کا لشکر تھا، ان میں سے تین سو شہسوار تھے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہسوار کو دو ہرا اور پیادہ کو اکبر حصہ دیا۔ اس کی تائید زرقانی کے گذشتہ بالا کلام سے بھی ہوتی ہے کہ یہی (پندرہ سو کی تعداد) صحیحین میں بروایت سعید بن مسیبؓ، حضرت جابرؓ سے منقول ہے اور حضرت مجمعؓ کی یہ حدیث اس بنا پر بھی راجح ہے کہ اس میں سواروں اور پیادوں کی الگ الگ تفصیل بھی دی گئی ہے۔ امام بخاری، قتادہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا، میں نے سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ خود سو تھے۔ سعیدؓ نے — کہا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے خود مجھ سے فرمایا کہ جن حضرات نے حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ان کی تعداد پندرہ سو تھی۔“ شیخ بذلؒ میں فرماتے ہیں: ”حضرت جابرؓ سے جو تعداد سالم اور سعید بن مسیبؓ نے نقل کی ہے وہ باقی روایات کی نسبت اقرب الی التحقيق ہے۔ کیوں کہ اس کو جن حضرات نے حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی“ کے مضمون کے ساتھ موافق کیا ہے، پھر یہ روایت حضرت مجمعؓ کی روایت سے مرید ہے۔“ اور سیوطیؒ نے درمختار میں ”قد رضی اللہ عنہما“ کے تحت بروایت عبد بن حمید و ابن جریر حضرت قتادہؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ لکیر کا درخت تھا، جس کے نیچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے بیعت لی تھی۔ اور ان کی تعداد اس دن پندرہ سو تھی۔“ انھم الوجہل کے اونٹ کا قصہ: اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ ہدی کے ستر اونٹ لے گئے تھے جن میں الوجہل کا وہ اونٹ بھی شامل تھا جو جنگ بدر کی غنیمت میں ہاتھ آیا تھا۔ میں کہتا ہوں یہی صحیح ہے اور ترمذی شریف میں جو مروی ہے کہ وہ حجرہ الوداع کے اونٹوں میں شامل تھا یہ دہم ہے جیسا کہ اس کی تفصیل جزرہ الوداع میں گذر چکی ہے اور اس اونٹ کی ناک میں کڑا تھا، ابو داؤد میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر اپنی قربانیوں میں الوجہل کا وہ اونٹ بھی قربان کیا جس کے

مصر میں یعنی ناک میں چاندی کا کڑا (حلقہ) تھا۔ ابن منہال کہتے ہیں کہ کڑا سونے کا تھا۔ بغلیں کہتے ہیں کہ اس سے مشرکین کو چڑانا منظور تھا۔ حضرت شیخ بذل فرماتے ہیں کہ ”راوی کا قول، اس کے میں“ اور ملاحظہ فرمائیے ہیں: ”راوی کا قول: کہ سونے کا کڑا تھا (اور دوسری روایت میں ہے کہ چاندی کا کڑا تھا) ممکن ہے کہ دو شخصوں کے لئے دو کڑے ہوں۔“ ادجنہ میں ہے کہ ابو داؤد کی اس حدیث کو کئی طرح سے ترجیح حاصل ہے ایک یہ ہے کہ، روایات میں ہے کہ کفار کو چڑانا اور غصہ دلانا مقصود تھا اور یہ بات حجۃ الوداع کے ساتھ جوڑ نہیں رکھتی اس لئے کہ اس وقت مکہ میں کوئی کافر ہی نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ کتب سیر کے موافق ہے، تیسرے یہ کہ ترمذی کی روایت میں ضعف ہے پچانچہ خود امام ترمذی فرماتے ہیں کہ ”یہ حدیث غریب ہے۔ سفیان کی یہ حدیث صرف زید بن جباب کے ذریعہ ہمیں ملی ہے۔“ پوری تفصیل ادجنہ میں ہے، اور جزہ حجۃ الوداع میں حدیث کے ہدایا ابو جہل کے اونٹ کے بھاگ جانے کا قصہ گزر چکا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھاگنا بھی اسی چڑانے کی تکمیل کے لئے تھا کہ اگر وہ اونٹ یوں ہی ذبح کر دیا جاتا تو مکہ کے عام کافروں کو اس کا علم نہ ہوتا اور اس کے بھاگ جانے کی وجہ سے اس کا معاملہ ایسا مشہور ہوا کہ قریب و بعید کے تمام لوگوں کو معلوم ہو گیا۔ رہا یہ سوال کہ اونٹ تو بے عقل جانور ہے، کفار کو چڑانے والے مقصد کی تکمیل کے لئے اس کا بھاگ نکلنا کیوں کہ ہوا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بطور معجزہ کے ہے اور اس قسم کے بہت سے معجزات ہیں جن کا انکار ممکن نہیں۔ منجملہ ان کے ابو داؤد کی حدیث کا یہ واقعہ ہے کہ قربانی کے اونٹ آپ کی طرف پکٹتے تھے کہ دیکھئے کس سے ذبح کی ابتداء ہو۔ اسی طرح آپ کی ناقہ قصواء کے بیٹھے کا قصہ، اور لوگوں کا کہنا کہ قصواء رک گئی عنقریب آ رہا ہے وغیرہ اور آپ نے ہدی کے اونٹوں پر ناجیہ بن حنفیہ بن حنفیہ کو مقرر فرمایا اور معالم التنزیل میں ان کا نام ناجیہ بن عمیر نقل کیا ہے، اور نحیث میں بھی اسی طرح ہے، اور ان دونوں باتوں کوئی اختلاف نہیں اس لئے کہ ان کے والد کا نام جناب اور داد کا نام عمیر ہے۔ البتہ یہاں ایک اختلاف ہے کہ آیا وہ اسلی ہے یا خزاعی؟ اور یہ کہ کیا ناجیہ اسلی اور ناجیہ خزاعی دو شخص ہیں یا ایک ہی شخص ہے بذل میں اس پر مفصل کلام کیا ہے اور آپ کے ساتھ مالدار صحابہؓ نے بھی ہدی کے جانور نہ کائے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحر میان میں بند تلواریں کے جو مسافر کا ہتھیار ہے اور کوئی ہتھیار اپنے ساتھ نہیں لیا۔ (میں کہتا ہوں) کہ آپ کے ساتھ تین شکر شہسوار تھے، جیسا کہ ابو داؤد کی روایت اور پر گندہ چکی ہے اور زرقانیؒ ہے کہ آپ کے ساتھ دو شکر شہسوار تھے مگر ابو داؤد کی روایت راجح ہے۔

پس آپ نے نماز ظہر ذی الحلیفہ میں ادا فرمائی اور قربانی کے جانوروں کو تلوے پہنائے اور ان کا اشعار کیا۔ بعض جانوروں کو خود بنفس نفیس تلوے پہنائے اور باقیوں کے لئے ناجیہ کو حکم فرمایا۔ خیس میں اسی طرح ہے۔ زرقانی فرماتے ہیں کہ ”ایک روایت کے مطابق آپ نے دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد ذوالحلیفہ سے احرام باندھا اور ذوالحلیفہ کی مسجد کے دروازے سے سوار ہوئے اور آپ کی ساری جب آپ کو لے کر قبلہ کی طرف چلنے لگی تو آپ نے عمرہ کا احرام باندھا یعنی اس کا اظہار فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپ لڑائی کے لئے تشریف نہیں لے جا رہے“ اور خیس میں ہے کہ ”پھر آپ نے ذوالحلیفہ سے احرام باندھا اور تبلیہ پڑھا اور آپ کی اقلہ میں جہور صحابہؓ نے بھی وہیں سے احرام باندھا اور بعض نے تحفہ سے احرام باندھا۔

میں کہتا ہوں کہ تقلید اور اشعار کی بحت جزاء الحج میں گذر چکی ہے اور اس ناکارہ کے نزدیک اذبحہ یہ ہے کہ مراقبت کی مشروعیت کی ابتداء عمرہ الحدید سے ہوئی اور عام شراح اس کی ابتداء حجۃ الوداع سے ذکر فرماتے ہیں؛ جیسا کہ امام احمدؒ نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے، مگر اس پر اشکال ہوگا کہ یہ تمام حضرات حدیثیہ والے سال حضرت البرقادہؓ کے میقات سے بغیر احرام گذر جانے کی تاویلات کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ میقات کی تعیین ہی حجۃ الوداع میں ہوئی تو ان ترجیحات قریبہ وبعیدہ کی حاجت ہی کیوں پڑی؛ اذبحہ میں اسی طرح ہے اور جو رائے میں نے اختیار کی ہے اس کی تائید حافظ ابن قیمؒ کے اس کلام سے ہوتی ہے جو موصوف نے حدیثیہ کے فوائد میں ذکر کیا ہے کہ ”عمرہ کا احرام میقات سے باندھنا افضل ہے جیسا کہ حج کا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج و عمرہ دونوں کا احرام ذوالحلیفہ سے باندھا تھا۔“

ذوالحلیفہ سے جاسوس بھیجا : اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالحلیفہ ایک خراعی بلطہ جاسوس بھیجا۔ صحیح قول کے مطابق اس کا نام بُسر تھا۔ (بار موحده کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ) جیسا کہ حافظ نے کہا ہے اور ابن اسحاق اور ابن عبد البر نے بھی اسی پر جزم کیا ہے۔ البتہ ابن اسحاق کی روایت میں ”بد بشر“ (باند کے کسرہ اور شین منقطہ کے ساتھ) واقع ہوا ہے اور ابن ہشام نے اس کی تردید کی ہے، اور ابن شیبہ کی تصانیف میں جاسوس کا نام ”ناجیہ“ ذکر کیا ہے۔ حافظؒ کہتے ہیں کہ ”مثنویہ بے ک“ ناجیہ اس شخص کا نام ہے جس کے ساتھ بدی کے جانور بھیجے تھے جیسا کہ ابن اسحاق وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔“ اور آپ نے اس بُسر بن سفیان بن عمرو کو بلطہ جاسوس بھیجنے کے لئے اس لئے منتخب فرمایا کیوں کہ یہ تازہ نازہ اسلام لائے تھے۔ چنانچہ وہ شوال میں اسلام لائے تھے (چونکہ ان کا اسلام لازماً زیادہ مشہور نہیں تھا، اس لئے انہیں دیکھنے والا جاسوس سمجھ کر ایذا کے درپے

نہیں ہوگا۔ زرقانی میں اسی طرح ہے۔ حافظ ابن قیمؒ آغاز قصہ میں فرماتے ہیں کہ ”آپؐ نے ذوالحلیفہ سے اپنے آگے آگے ایک خزاہی کو بحیثیت جاسوس کے بھیجا اور حدیث کے فرائض میں فرماتے ہیں کہ جہاد میں قابل اعتماد مشترک سے بوقت ضرورت خدمت لینا جائز ہے۔ اس لئے اس خزاہی کو جب جاسوس مقرر کیا گیا وہ کافر تھا اور اس میں مصیبت یہ تھی کہ اس کے لئے دشمن میں گھل مل کر ان کی خبریں معلوم کر لیا آسان تھا۔ نیز فرماتے ہیں کہ ”امیر لشکر کو چاہیے کہ اپنے آگے دشمن کی جانب جاسوس بھیجے۔“ اھ اور آپؐ کا یہ جاسوس ”ندیر الاشطاہ“ نامی جگہ والی آیا جیسا کہ آگے آتا ہے۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں: ”پس جب آپؐ ذوالحلیفہ پہنچے تو قبیلہ خزاعہ کے ایک جاسوس کو اپنے آگے بھیجا تاکہ وہ قریش کی خبریں آپؐ کو لا کر دے، یہاں تک کہ جب وادی حصفان کے قریب پہنچے تو آپؐ کا یہ جاسوس ٹپس آیا اور اس نے بتایا کہ میں کعب بن لوی (یعنی قریش) کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ انہوں نے آپؐ کے مقابلہ کے لئے احابیش یعنی مختلف قبائل کو جمع کر رکھا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا اور فرمایا کہ تم میرے دیتے ہو کہ ہم ان لوگوں کو اہل عیال کا رخ کریں؟“ اھ مختصر اور مشورہ کا تذکرہ اپنے موقع پر آئے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناجیہ اسلامی کو ہدی کے جانوروں کے ساتھ آگے بھیجا اور خود ان کے پیچھے روانہ ہوئے اور عباد بن بشر کو مہاجرین و انصار کے میں سواروں کی مصیبت میں مقدمۃ الجیش پر مقرر فرمایا۔

حضرت البرقنادہؓ کی آمد اور جاسوس کی واپسی: اور حضرت البرقنادہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس وقت پہنچے جب کہ آپؐ موضع ”سقیہ“ میں قیلولہ کر رہے تھے۔ حافظ کہتے ہیں: ”السقیہ“ سین مہلہ کے ساتھ ضمہ اوراق کے سکون کے ساتھ اس کے ساتھ یائے مقصورہ۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک بڑی بستی ہے۔“ اھ۔ اور معجم میں ہے کہ ”فرع“ کے مضافات میں ایک قصبہ ہے۔ اس کے اور ”فرع“ کے درمیان حقیقہ کی جانب انیس^{۱۹} میل کا فاصلہ ہے۔“ اھ۔

بخاری و مسلم میں عبداللہ بن ابی قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے والد (حضرت البرقنادہؓ) بھی حدیبیہ کے سال گئے تھے۔ پس ان کے رفقاء نے احرام باندھ لیا، مگر انہوں نے نہیں باندھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ ”حقیقہ“ نامی جگہ میں دشمن جمع ہیں، وہ آپؐ سے لڑیں گے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چلے۔ پس دریں اثناء کہ میرے والد اپنے رفقاء کے ساتھ تھے، وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے، (میرے والد فرماتے ہیں کہ) میں نے دیکھا کہ ایک نیل گائے ہے، میں نے نیزے سے اس پر حملہ کیا پس اس کو دیوں ڈھیر کر دیا، میں نے اپنے رفقاء سے مدد چاہی، مگر انہوں نے میری مدد کرنے سے انکار کر

دیا، بہر حال میں نے خود ہی اس کا گوشت تیار کیا) پس ہم نے اس کا گوشت کھایا، اور میں اندیشہ ہوا کہ کہیں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء سے کٹ کر پیچھے نہ رہ جائیں، اس لئے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کیا، میں کبھی گھوڑا تیر دوڑاتا اور کبھی عام رفتار سے چلتا، اُدھی رات کو مجھے بنو غفار کا ایک شخص ملا، میں نے اس دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں چھوڑا تھا؟ اس نے بتایا کہ میں نے آپ کو مد تعین، نامی جگہ چھوڑا ہے، اور آپ دو پہر کو ”سقیّا“ پہنچیں گے، چنانچہ (میں ”سقیّا“ میں آپ سے آٹا، اور) میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کے خدام آپ کو سلام عرض کرتے ہیں اور انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں آپ سے کٹ کر پیچھے نہ رہ جائیں، پس ان کا انتظار کر لیجئے۔ پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے نیل گائے کا شکار کیا تھا اور اس کا کچھ بقیہ میرے پاس ہے۔ آپ نے رفقاء سے فرمایا: کھاؤ، یہ حضرات احرام میں تھے۔

اس قصہ میں بہت سی فقہی بحثیں ہیں، مثلاً ابرقائدہ کے خردوج کا سبب کیا تھا؟ انہوں نے میقات سے احرام کیوں باندھا؟ اور ان کے میقات سے بلا احرام گزرنے کے وجہ و اسباب کیا تھے؟ شرودج بخاری وغیرہ موطا میں ان سب پر تفصیل سے کلام کیا ہے اور اس کا خلاصہ اور حاشیہ لامع میں مذکور ہے اور محرم کے شمار کے — سائل پر بحث ”حجۃ الوداع“ میں گذر چکی ہے۔

آپ کے رد کرنے کے بارے میں مشرکین مکہ کا مشورہ: اور جب مشرکین مکہ کو یہ خبر پہنچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ تشریف لا رہے ہیں تو انہوں نے اس بارے میں مشورہ کیا، صلاح مشورہ کے بعد یہ قرار پایا کہ آپ کو بیت اللہ تشریف آنے سے روکا جائے، اہل مکہ نے عرب قبائل اور جماعت احابیش سے بھی مدد طلب کی احابیش (حامہملہ، بار موحده اور شین معجمہ کے ساتھ) اجوش (بضم ہمزہ و ہاء) کی جمع ہے، یہ بنو الہون بن خزیمہ بنو حارث بن عبد مناة اور بنو المصطلق، جو خزاعہ کی ایک شاخ ہے، کا لقب ہے، کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے قریش کے ساتھ حبشی نامی پہاڑ کے نیچے، جو اسفل مکہ میں واقع ہے، عہد و پیمان کیا تھا، اس بنا پر ان کا نام ”احابیش“ ہوا اور بعض نے کہا کہ تحبش کے معنی اجتماع کے ہیں، ان کے تحبش یعنی اجتماع کی وجہ سے ان کا یہ لقب پڑا۔

جاسوسی کے لئے خالد کے لشکر کی آمد، بہر حال احابیش نے قریش کی دعوت کو لیک لبا اودینہ سب کو تیار ہو کر مکہ سے نکلے اور ”بلوچ“ نامی جگہ میں ان کا لشکر جمع ہوا اور خالد بن ولید اور عکر بن ابی جہل کو دو صد افراد کی معیت میں خبر سانی کے لئے مقرر کیا۔ میں کہتا ہوں کہ بخاری کی حدیث میں ہے کہ: — جب آپ

راستہ کی کسی جگہ میں تھے۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق یہ جگہ عسفاں تھی، جیسا کہ زرقانی میں ہے۔ تو انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خالد بن ولید موضع غنیم میں۔ حافظ کہتے ہیں کہ غنیم (لفح غنیم) سے مراد بظاہر کراۃ الغنیم ہے جو مکہ و مدینہ کے درمیان جگہ کا نام ہے، سیاق حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جگہ حیدر کے قریب تھی اور ابن حبیب کہتے ہیں کہ یہ اس مقام کے قریب ہے جو رابیع اور جحفہ کے درمیان ہے، ”اللہ اور غنیم میں ہے کہ ابن شباب نے کہا ہے کہ غنیم عسفاں اور ضحان کے باہر واقع ہے اور عیاض نے کہا ہے کہ وہ عسفاں کے بعد آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک وادی ہے۔ قریش کے ایک لشکر کے ساتھ بطور مقدمہ الجیش کے آیا ہوا ہے، اس لئے تم داہنی جانب اختیار کرو، پس لشکر کی قسماً خالد کو ان کی آمد کی خبر تک نہ ہوئی یہاں تک کہ انہیں لشکر کا سیاہ عباد اٹھنا نظر آیا، یہ دیکھ کر خالد فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر قریش کو اطلاع دینے کے لئے بھاگا۔“ احمدیث۔

لے عزیز خرم الحاج مولوی محمد رابعہ مدنی نے ان مقامات کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ: ”بظاہر غنیم یہاں غن کے فتح اور غنیم کے کمرہ کے ساتھ ہے، اور یہ وہی جگہ ہے جس کو ہمدانی نے اپنی کتاب ”صفة جزيرة العرب“ میں باس الفاظ ذکر کیا ہے کہ وہ ”متر اور عسفاں کے درمیان ایک جگہ ہے۔“ اور مروی جگہ ہے جو زمانہ قدیم میں ”مراظہان کہلاتی تھی اور آجکل ”وادی فاطمہ کے نام سے معروف ہے اور مکہ سے شمال مغربی جانب، ہمدانی کی کتاب ”صفة جزيرة العرب“ کے مطابق، مکہ سے ۳۳ میل پر اور جدہ کی پائنت کے مطابق ۱۴ میل ہے۔

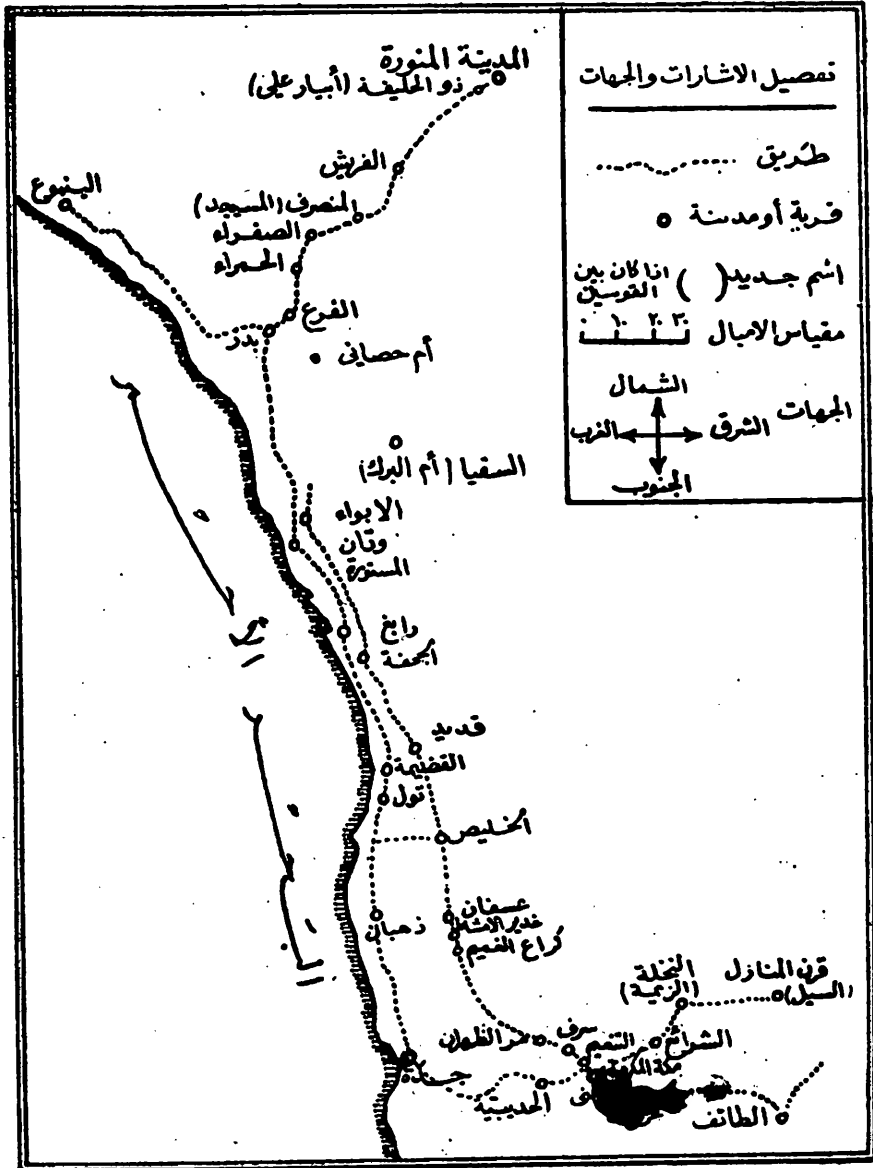
عسفاں، مکہ اور جحفہ کے درمیان راستہ کا ایک منزل کا نام ہے جو مکہ سے دو مرحلے یعنی چھتیس میل پر واقع ہے اور یہ تہانہ کی آخری مرحلہ ہے، جیسا کہ یاقوت حموی نے ”معجم البلدان“ میں اور ہمدانی نے ”صفة جزيرة العرب“ میں ذکر کیا ہے اور یہ جگہ آج تک اسی نام سے اسی موقع پر معروف ہے جو یاقوت حموی اور ہمدانی نے بیان کیا ہے۔ اور غنیم نامی ایک اور جگہ بھی معروف ہے جو غن کے قمرہ ایدم کے کمرہ کے ساتھ ہے اور یاقوت حموی نے اپنی کتاب میں اس کا محل وقوع رابع اور جحفہ کے درمیان ذکر کیا ہے اور یہ دونوں مقام عسفاں سے تقریباً ۲۵ میل دور، جانب شمال واقع ہیں۔ نابریں حدیث حدیث میں اس غنیم کا ذکر غیر موزوں ہے، کیونکہ اس حدیث میں غنیم کا ذکر عسفاں کے ذکر کے پہلو میں آیا ہے، نیز غدیر الاشطاہ کے پہلو میں جو عسفاں کے قریب جنوبی جانب واقع ہے۔ اور بعض محققین کی رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ غنیم کو کراۃ الغنیم بھی کہا جاتا تھا، یاقوت حموی نے کراۃ الغنیم کے بیان میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اس کا مؤید ہے اور ابن بشام نے اپنی کتاب میں اس حدیث کا ذکر کرتے ہوئے غنیم کے بجائے کراۃ الغنیم کا لفظ درج کیا ہے اور وہ یاقوت حموی کی تحقیق کے مطابق عسفاں سے آٹھ میل دور جنوب میں واقع ہے اور جزائری پائنت کے مطابق ”غدیر الاشطاہ“ ان دونوں کے درمیان واقع ہے۔

— (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صلوۃ خوف کا نزول : زرقانی کہتے ہیں کہ اس حدیث سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ وہ غبار دیکھتے ہی قریش کو اللہ تعالیٰ دینے کے لئے مجھاگا اور ابن سعد وغیرہ کی روایت ہے کہ خالد اپنے لشکر سمیت قریب آیا، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کو دیکھا اور اس کے لشکر نے ان کے اور قبلہ کے مابین صف بندی کی، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عباد بن بشر اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھے اور یہ حضرات ان کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے اور نماز ظہر کا وقت آگیا، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو نماز پڑھائی، خالد نے کہا کہ یہ لوگ (نماز میں) مشغول ہونے کی وجہ سے غفلت کی حالت میں تھے اگر ہم ان پر حملہ آور ہوتے تو انہیں صدمہ پہنچا سکتے تھے، اخیر یہ موقع تو ہاتھ سے گیا اب ایک اور نماز آئے گی جواہیں اپنی جان اور مال و اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہے، پس جبریل علیہ السلام ظہر اور عصر کے مابین یہ آیت لے کر نازل ہوئے **وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ أَلَا تَكُنْ مَعَهُمْ** (جس میں نماز خوف کا حکم ہے) چنانچہ آپؐ نے صلوۃ خوف ادا فرمائی۔ اب اگر دونوں باتوں کا ایک کو ترجیح دینا چاہو تو ”صحیح“ کی روایت زیادہ صحیح ہے اور اگر دونوں کے درمیان تطبیق دینا چاہو تو وہ اس طرح ممکن ہے کہ اس کا جانا اس وقت مانا جائے جب کہ وہ اور اس کے ساتھی عصر تک صف آرائی کئے ہوئے اور مشرکین کے حملہ سے مایوس ہو گئے۔ میں کہتا ہوں کہ میرے خیال میں یہی بہتر ہے اس لئے کہ کتب سنن میں یہی مشہور ہے کہ صلوۃ خوف کا نزول ظہر و عصر کے درمیان میں ہوا۔ چنانچہ ابو داؤد میں حضرت ابو عیاش زرقی سے روایت ہے کہ ”ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عسکان میں تھے اور مشرکین کے لشکر پر خالد بن ولید امیر مقرر تھا۔ ہم نے ظہر کے وقت کی نماز پڑھی تو مشرکین کہنے لگے، کہ ہم نے انہیں بے خبری اور غفلت میں تو پایا ہی تھا، کیا اچھا تھا کہ ہم ان پر نماز کی حالت میں حملہ کر دیتے۔ اس پر آیت **قُصِرَ ظَهْرُ** اور عصر کے درمیان نازل ہوئی، چنانچہ عصر کا وقت ہوا تو آپؐ قبلہ رخ کھڑے ہوئے۔ الخ اور حضرت شیخ بخل میں فرماتے ہیں کہ ”مجھے یہ معلوم نہیں ہر سکا کہ یہ قصہ کس غزوہ میں پیش آیا۔ اس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عسکان میں پڑاؤ غزوہ بنی لیحان میں فرمایا اور اس وقت قتال نہیں ہوا۔ بعض اہل تاریخ کہتے ہیں

ان تمام امور کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راستہ میں کسی جگہ تھے غالباً عسکان یا غزیرہ الاشلاطین میں گئے یا ان کے قریب کسی اور جگہ جہاں سیاق و سباق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ کو بتایا کہ غزیرہ میں ہے اور انہیں حکم دیا کہ وہ اپنی جانب لیں اور یہ راستہ مغربی جانب تھی تاکہ آپؐ صحابہؓ کو نماز اور خالد کے جگہ سے جوں کے قرب ہی راستہ پر واقع تھے جہاں بنی لیحان کا رخ جدید حیدر کی طرف ہو گیا جہاں کے کچھ بنی حنیہ اور مکہ مغربی جانب واقع تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے چل کر حیدر چاہینے اور خالد نے لشکر کا بغیر ترکہ کر دیا قریش کو خبر ہوئی ان قتلا کی تعمیل کے لئے غلغلہ نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔

نقشة متعلقة حاشية صفحته ٢٣٤



اس غزوہ میں کسی سے مقابلہ نہیں ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ واپس تشریف لائے اور کوئی قصہ پیش نہیں آیا اور نہ کتب تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اس وقت خالد بن ولید شیرین کے امیر تھے، واللہ اعلم۔ انتہی، اور تلخیص البذل میں ہے کہ مجھے بعد ازاں فتح الباری میں یہ تصریح ملی ہے کہ وادعی نے خالد بن ولید کی حدیث نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کی طرف نکلے تو عصفان میں میرا آپ سے سامنا ہوا چنانچہ میں آپ کے مقابلہ میں صف آر ہوا۔ آپ نے اپنے اصحاب کو نماز ظہر پڑھائی، ہمارا ارادہ ہوا کہ اچانک حملہ کر دیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے وقت نماز خوف پڑھائی۔ الخ اس روایت سے صراحتہً پتہ چلتا ہے کہ وہ حدیث قصہ حدیبیہ سے ہی متعلق ہے اور ابن قیمؒ ابی عیاش زرقانی کی روایت کی بنا پر آیت کا منزل عصفان ہی میں ملنے میں مگر یہ تفصیل نہیں بتاتے کہ یہ غزوہ حدیبیہ تھا یا کوئی اور غزوہ۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ کون شخص ہے جو ہمیں ان کی راہ سے ہٹ کر کسی اور راہ سے لے چلے؟ قبیلہ اسلام کا ایک آدمی، جس کا نام حمزہ بن عمرو اسلمی تھا، کہنے لگا کہ میں لے جاسکتا ہوں۔ چنانچہ وہ انہیں گھاٹیوں کے بیچ میں سے ایک دشوار گزار اور کٹھن راستہ سے لے چلا، اور جب مشکل تمام اسے عبور کر کے وادی کے آخر میں ہموار زمین پر پہنچے تو آپؐ نے صحابہ کرام کو فرمایا کہ استغفر اللہ و متوب الیہ کہو (یعنی ہم اللہ تعالیٰ سے بخش مانگتے ہیں اور اس کے سامنے توبہ کرتے ہیں) چنانچہ سب نے یہ کلمہ کہا، تو آپؐ نے فرمایا: بخدا! یہ وہی خطہ ہے جس کا بنی اسرائیل کو حکم ہوا مگر انہوں نے نہیں کہا تھا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ موضع مخض (حاضر مہلہ کے فتح میم کے سکون اور خاد و مجموعہ کے ساتھ ایک جگہ کا نام ہے۔ (زندقانی) کے آگے دائیں جانب کے راستہ چلو۔ جو اسفل مکہ میں حدیبیہ کی طرف اترنے کی جگہ ”مئۃ المراء“ پر نکلتا ہے۔ چنانچہ لشکر اس راستے پر چلا اور قریش کے متعلقہ پیشوا شاہسواروں نے لشکر کا جو ان کے راستہ سے ہٹ کر جا رہا تھا، غبار اٹھتا ہوا دیکھا، تو فوراً گھوڑے دوڑاتے ہوئے قریش کے پاس واپس پہنچ گئے۔

خزاعی جاسوس کی واپسی: یہاں تک کہ جب غدیر الاشطاط (بفتح غین معرہ کسر وال مہملہ و شین معرہ و دو طاء کے ساتھ ”شط“ کی جمع ہے۔ یہ جگہ حدیبیہ کی جانب عصفان سے تین میل دوڑ بجانب مکہ وادی کے کنارے ہے) پہنچے تو آپؐ کے پاس آپؐ کا خزاعی جاسوس آپؐ سے واپس آیا جس نے ذوالحلیفہ سے اہل مکہ کی جانب قریش کی خبر لینے کے لئے بھیجا تھا۔ چنانچہ اس نے بتایا کہ قریش نے آپؐ کے مقابلہ کے لئے بہت سی جماعتوں اور ”احابیش“ کو جمع کر رکھا ہے۔ جو آپؐ سے لڑنے، بیت اللہ سے روکنے اور مکہ میں داخلہ سے ہٹانے کو تیار ہیں۔ اور ابن اسحقؒ روایت ہے کہ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تو آپؐ کو موضع عصفان میں بوسر ملا اور

کہنے لگا کہ قریشیوں کو آپ کے سفر کی اطلاع مل چکی ہے اور وہ اپنی عورتوں، بچوں یا دودھ دینے والے جانوروں (العوذ المطافیل) کو ساتھ لے کر نکل آئے ہیں (لامع کے حاشیہ میں ہے: "العوذ المطافیل، عین کی پیش اور واؤ کے سکون کے ساتھ اس کے بعد دال معجر۔ دودھ پالی اونٹنی۔ وہ بایں جن کے ساتھ ان کے بچوں بھی ہوں۔ مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ اپنے ساتھ دودھ کے جانور لے کر نکلے ہیں تاکہ ان سے غذا حاصل کرتے رہیں، اور جب تک آپ کو روک نہ دیں، واپس نہ جائیں یا بچوں سمیت عورتیں مراد ہو سکتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے ساتھ عورتیں اور بچے لے کر نکلے ہیں کیوں کہ ان کا طویل قیام کا ارادہ ہے نیز اس لئے کہ یہ امر عدم فزار کے لئے زیادہ مفید ہے، اور کافی کہتے ہیں کہ، المطافیل: الطفل کی جمع ہے۔ ان ماؤں کو کہتے ہیں جن کے بچے ساتھ ہوں، یعنی یہ قبائل آپ کے ساتھ جگہ کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور اپنے ساتھ اموال بھی لے آئے ہیں۔" انتہی) انہوں نے جیتوں کی کھالیں پہن رکھی ہیں اور وہ طومانی میں فروکش ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر رہے ہیں کہ آپ بزور قوت ان پر غلبہ حاصل کر کے مکہ میں داخل نہیں ہو پائیں گے۔ اور ابن سعد کی روایت میں ہے کہ مشرکین کو آپ کے نکلنے کی خبر پہنچی تو انہوں نے آپ کو مکہ سے روکنے پر اتفاق کر کے، بلاتح نامی جگہ میں لشکر جمع کیا اور اکثر اقلی "لہو اقل" میں ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے سال عازم کو مکہ لے کر تشریف لے گئے تو بصر بن رفیان الکعبی آپ کے پاس آئے، آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ اہل مکہ کو ہماری آمد کا علم ہو چکا ہے یا نہیں؟ اس نے کہا کہ اُس نے فلاں رات بیت اللہ کا طواف کیا اور قریش اپنی مجلس میں جمع تھے کہ جبل ابوقیس کی چوٹی سے ایک شخص نے چیخ چیخ کر یہ اشعار اتنی بلند آواز سے پڑھے کہ تمام مکہ میں سنائی دیتے تھے (یہاں زرقانی نے وہ اشعار نقل کئے ہیں) بس بھڑکیا تھا تمام مکہ کانپ اٹھا اور رب نے عہد معاہدہ کیا کہ اس سال تو آپ مکہ میں داخل نہیں ہو پائیں گے۔ آپ نے فریاد کر فرمایا کہ یہ چیخنے والا سلفع، سب سے جوتوں کا شیطان ہے۔ غمگین اے اللہ تعالیٰ قتل کر دیں گے۔ انشاء اللہ! خرائط کی یہ روایت اگر ثابت ہو جائے تو غالباً "بُسر" نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ اطلاع دی تو اس کے بعد آپ نے اُسے جاسوس بنا کر بھیجا ہوگا۔ تاکہ یہ پتہ کرے کہ کیا وہ جمع ہو چکے ہیں؟ چنانچہ اس نے واپس آکر آپ کو ان کے جمع ہونے کی خبر دی۔

جنگ کے بارے میں آپ کا صحابہ سے مشورہ کرنا: اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! مجھے مشورہ دو کیا یہ مناسب ہے کہ ہم ان کافروں کے اہل و عیال کا رخ کریں۔ پس اگر یہ لوگ ہمارے مقابلے میں آئے تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی ایک چیدہ جماعت کو (یعنی) کاٹ دیا ہوگا۔ ورنہ ہم انہیں لٹا کر کھوڑیں گے،

(مخروبین، یعنی جن کے مال اور اہل و عیال چھین لئے گئے ہوں) اور امام احمد کی روایت میں ہے کہ: کیا تم رائے دیتے ہو کہ ہم ان لوگوں کے اہل و عیال کا رخ کریں جو ان قریش کی مدد کے لئے جمع ہیں۔ پس ان پر حملہ کر دیں۔ پس اگر یہ بیٹھے رہے تو لٹے پٹے اہل و عیال سے محروم ہو کر بیٹھیں گے اور اگر وہ نہ آئے تو یہ ایک ایسی جماعت (عنف) ہوگی جسے اللہ تعالیٰ نے کاٹ ڈالا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے: کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ میں ان لوگوں کے اہل و عیال کا رخ کروں جو ان کی مدد کو آئے ہیں پس ہم ان کو کھڑپیں پس اگر وہ بیٹھے رہے تو اہل و عیال گنوا بیٹھیں گے۔ اور اگر وہ پنج نکلے تو وہ لیے لوگ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔ یا تم یہ رائے دیتے ہو کہ ہم بیت اللہ کا رخ کریں پھر جو آٹے آئے اس سے جنگ کریں (اصل کتاب میں) ”وان لم یجیبوا“ کا لفظ ہے جس کا ترجمہ کیا گیا مگر، بظاہر ”لم“ کا لفظ نہیں ہونا چاہیئے اور آگے حافظ کے کلام میں یہی عبارت آ رہی ہے، اس میں ”لم“ کا لفظ نہیں ہے۔ مترجم) میں کہتا ہوں کہ صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں: ”پس فرمایا: اے لوگو! مجھے مشورہ دو، کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ میں ان لوگوں کے اہل و عیال کا رخ کروں جو ہمیں بیت اللہ سے روکنا چاہتے ہیں۔ پس اگر یہ لوگ ہمارے مقابلہ میں آئے تو اللہ تعالیٰ مشیرین کی ایک چیدہ جماعت کو الگ کر دے گا۔ ورنہ ہم انھیں اہل و عیال سے محروم کر دیں گے اور لایع میں ہے کہ: ”ارشاد نبوی! ہم ان لوگوں کے اہل و عیال کا رخ کریں“ اس سے مراد وہ کفار ہیں جو قریش کی مدد کے لئے مکر گئے ہوئے تھے اور ان کے اہل و عیال تنہا رہ گئے تھے۔ اور ارشاد نبوی: ”قطع عناینا“ میں عینا سے جماعت مراد ہے۔ یعنی جب یہ کفار اپنے گھروں کی طرف لوٹ آئیں گے، تو اہل مکہ کے ساتھ ان میں سے کوئی بھی نہیں رہے گا۔ جس سے ان کی جمعیت ٹوٹ جائے گی۔ اور ممکن ہے (کہ عین سے مراد جاسوس لیا جائے اور) یہ مطلب ہو کہ جب یہ لوگ اپنے اپنے گھر لوٹ آئیں گے تو ہمیں مکہ میں جاسوس بھیجنے اور وہاں جمع ہونے والے کفار کے حالات معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی کیوں کہ وہاں قریش کے علاوہ کوئی نہیں رہے گا، اس لئے جاسوس بھیجنے کی ضرورت نہ ہوگی، کیوں کہ وہاں قریش کے سوا کسی کا باقی نہ رہنا معلوم ہو چکا۔“

قد قطع اللہ عناینا کا مطلب : اور لایع کے حاشیہ میں ہے کہ اس حدیث میں جو عینا کا لفظ آیا ہے، شامین نے اس کے چند معنی ذکر کئے ہیں، جو عنقریب ذکر ہوں گے، ان میں سے بعض قریب ہیں اور بعض بعید اور حضرت شیخؒ نے عین کے معنی جماعت جو اختیار کئے ہیں اس ناکامی کے نزدیک یہی راجح بلکہ متین ہے۔ کیوں کہ ”عین“ بمعنی جماعت بھی آتا ہے جیسا کہ فاسوس میں ہے اور اس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بعض روایات میں عینا کے بجائے عفا کا لفظ آیا ہے، چنانچہ حافظ فتح میں فرماتے ہیں کہ امام احمد کی روایت میں ہے کہ ”وان لم یجیبوا“

”یا تمہاری رائے یہ ہے کہ ہم بیت اللہ کا رخ کریں پھر جو شخص آٹے آئے اس کو لٹیں۔“ ورنہ ان اور عینس میں سے کونسا لوگوں کو مجھے مشورہ دو؟

تک عناق قطعہا اللہؑ اگر وہ لوگ اپنے گھروں کو لوٹ آئے تو ایک جماعت عناق ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ نے انگ کر دیا۔ اور مغازی ابن اسحاق کی ایک روایت زہری سے بھی اسی مثل کی ہے، اور اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا کہ جو لوگ قریش کی مدد کے لئے جمع ہیں ان کے گھروں پر حملہ کر کے ان کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا جائے، پھر اگر یہ لوگ اپنے اہل و عیال کی مدد کو آئے تو ان کو قریش سے توجہ ہٹانا پڑے گی۔ اندر میں صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا مقابلہ قریش سے رہ جائے گا، پس یہ مراد ہے آپ کے اس ارشاد سے کہ ”یہ ایک جماعت (عناق) ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ نے انگ کر دیا ہے۔“ آہ اور جمع میں ہے کہ ”حدیث حدیبیہ میں آتا ہے! وان نحو ایکن عقی قطعہا اللہؑ (اور اگر وہ پنج نکلے تو وہ ایک عقی گدغن ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ نے کاٹ دیا ہے) یہاں عقی سے مراد لوگوں کی جماعت ہے اور ایک حدیث میں کہ ”دورخ سے ایک گدغن نکلے گی“ یہاں گدغن سے ایک شخص یا جماعت مراد ہے۔“ اور کما فی میں خطاب سے نقل کیا ہے کہ محفوظ روایت یہ ہے، ”کان اللہ قد قطع عناق“ یعنی اللہ تعالیٰ کفار کی ایک جماعت کو علیحدہ کر دیں گے جس سے ان کی تعداد گھٹ جائے گی اور ان کی قوت میں ضعف پیدا ہو جائے گا۔“ اور ابن قیمؒ نے بھی الھدیٰ میں لفظ عناق ہی اختیار کیا ہے۔ اور عینیؒ نے خطاب کا قول نقل کر کے آگے لکھا ہے: ”خیل کہتے کہ جہار القوم عناق کے معنی ہیں کہ لوگ جماعت در جماعت آئے اور احناق رؤسا کو کہتے ہیں“ آہ ابن قیمؒ اس قصہ کے فوائد میں لکھتے ہیں: ”معملہ ان کے ایک یہ کہ بہتر کین کے اہل و عیال اپنے مردوں سے تنہا ہوں تو انہیں لڑاکا مردوں سے قبل قید کرنا جائز ہے۔“

اس پر حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ تو اس میت اللہ کا قصد لے کر نکلے تھے۔ اس سفر میں کسی کو قتل کرنا اور لڑنا آپ کا مقصد نہ تھا۔ اس لئے آپ بیت السنہ کی کاؤخ کریں۔ پھر میں جو روکے گا دیکھا جائے گا اور اس سے ہم نمٹ لیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر اللہ کا نام لے کر چلو۔ یہ بخاری کی تصانیف ہے۔ حضرت شیخ لامعؒ میں تحریر فرماتے ہیں: ”حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس جنگ و قتال کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ کیوں کہ اس صورت میں عہدہ کا ترک کرنا لازم تھا۔ جب کہ یہ حضرات عمرہ کے لئے نکلے تھے اور ان کے درمیان شہرہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سفر عمرہ کے لئے ہے، اب اگر عمرہ چھوڑ کر قتال مصروف ہو جاتے تو اس میں، دھوکے کی سی شکل بن جاتی“ آہ اور زرقانیؒ میں ہے کہ امام احمدؒ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ ”حضرت ابو بکرؓ رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو اپنے رفقاء سے مشورہ کرتے ہوئے نہیں

دیکھا، آپ کا یہ عمل ارشادِ خداوی "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" (اور ان سے معاملات میں مشورہ لیا کیجئے) کے امتثال کی خاطر تھا۔ حافظ نے کہا ہے کہ امام بخاریؒ نے حصہ اس کے مُرسَل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا۔ کیوں کہ زہریؒ کو حضرت ابو ہریرہؓ سے سماع حاصل نہیں۔

اوٹنی کے بیٹھنے کا قصہ : پس بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چلے یہاں تک کہ جب ثنیۃ الرار پہنچے، یہ وہ گھاٹی ہے جس سے اہل مکہ کی طرف راستہ اترتا تھا۔ حافظؒ کہتے ہیں: "الرار" میم کے کسرہ اور راء کی تخفیف کے ساتھ پڑا کا وہ راستہ جو مدینہ جا سہجنا ہے۔ اور داؤدی کا یہ خیال صحیح ہے کہ وہ اسفل مکہ کی گھاٹی کا نام ہے۔ میں کہتا ہوں کہ غیس میں ایک جگہ ارمیاء کا جو لفظ ہے غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔ تو آپؐ کی اوٹنی بیٹھ گئی! پس لوگوں نے کہا: جُلْ جُلْ (دونوں میں جا، کا فخر اور لام کا سکون) اوٹنی جب چلنے سے روک جائے تو اُسے چلانے کے لئے یہ لفظ کہا جاتا ہے۔ مگر وہ بدستور نہ چلنے پر مُصر رہی۔ پس لوگوں نے کہا: خَلَاتِ الْقَصْوَارِ، خَلَاتِ الْقَصْوَارِ (قصوار روک کر بیٹھ گئی) بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قصوار روکی نہیں، نہ اس کی یہ عادت ہے یعنی تھک کر بیٹھ جانا اس کی عادت نہیں جیسا کہ تم سمجھتے ہو، بلکہ اس کو ہاتھوں کو روکنے والے نے روک دیا ہے یعنی اللہ عزوجل نے اہل کو چلنے سے روک دیا ہے۔ اور لایع میں اس کی شرح میں لکھا ہے: "یہ حق تعالیٰ کی جانب سے بیت اللہ کی تعظیم پر تینہ تھی۔ یہاں تک کہ ناقہ بھی باوجود دلائع عقل ہونے کے اس کا سُرخ نہیں کرتی جب تک کہ اُسے یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ اس کا سوار (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) بیت اللہ کی بیحرمتی کا ادا نہ ہو، نیز لفظ اور بیت اللہ کی قابل احترام چیزوں میں سے کسی چیز کی حرمت میں خلل ڈالنا چاہتا ہے، ابو حاتمہ لایع میں ہے کہ حافظ فرماتے ہیں: ہاتھوں کا قصہ مشہور ہے اور یہاں اس کے ذکر کی مناسبت یہ ہے کہ اگر صحابہؓ اسی حالت میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے اور قریش انہیں روکنے کی کوشش کرتے تو جنگ و قتال کی نوبت آتی جو قتل و غارت اور لوٹ مار پر منتج ہوتی۔ نیز اس موقع پر مکہ میں بہت سے کمزور مسلمان مرد، عورتیں اور بچے بھی موجود تھے۔ اب اگر صحابہؓ مکہ پر حملہ آور ہوتے تو اندیشہ تھا کہ غیر شعری طور پر ان ضعفاء مسلمین کا نقصان ہو جاتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے "لَا رَجَالَ يَوْمَئِذٍ" الیہ میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور مہلبؓ نے اللہ تعالیٰ پر جالسِ فیل کے لفظ کے اطلاق کو مستبعد سمجھتے ہوئے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم تھے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم نے روک لیا۔ اور مہلبؓ کا تعقب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اس لفظ کا اطلاق جاتر ہے۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اس اوٹنی کو اسی اللہ نے روک لیا جس نے ہاتھوں کو روک دیا تھا۔ ہاں: اللہ تعالیٰ کا جالسِ فیل۔ (ہاتھوں کو روکنے والا) یا اس قسم کا نام رکھنا صحیح نہیں۔ ابنِ منذر نے یہی جواب دیا ہے اور یہ جواب اس صحیح مذہب

پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں۔ (یعنی قرآن وحدیث میں اللہ جل شانہ کے جو نام آئے ہیں صرف ان ہی کا استعمال صحیح ہے۔ اپنے اجتہاد سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نام کھنسا صحیح نہیں) پوری بحث فتح میں ہے۔ پھر فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ حافظؒ کہتے: اس موقع میں کلام کو قسم کے ساتھ متوکد فرمایا: تاکہ مزید قیولیت کا فائدہ دے۔ ”ابن قیمؒ نے الہدیٰ میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہی سے زیادہ موقع میں قسم کھانا ثابت ہے۔ یہ لوگ مجھ سے کسی ایسی چیز کا جس سے حرمت الہی کی تعظیم مقصود ہو، سوال نہیں کریں گے مگر میں اسے بالضرور قبول کر لوں گا۔ حرمت الہی کی تعظیم سے مراد حرم میں قتال نہ کرنا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حرمت سے حرم، شہر حرام اور احرام کی حرمت مراد ہے۔ حافظؒ کہتے ہیں کہ قیسری چیز یعنی حرمت احرام کا مراد ہونا محل نظر ہے۔ اس لئے کہ اگر مشرکین کو احرام کی حرمت ملحوظ ہوتی تو آپؐ کو بیت اللہ سے کیوں روکتے؟ خطاب نہ کہتے ہیں کہ اس قصہ میں حرمت الہی کی تعظیم سے مراد ہے حرم میں قتال نہ کرنا، صلح کی جانب مائل ہونا اور۔ خوزیری سے ہاتھ روکنا۔ اُھ یہ کہہ کر آپؐ نے اونٹنی کو اٹھایا پس وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی، پس آپؐ نے کفار سے رُخ پھیر لیا۔ ابن سعدؒ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے واپسی کا رخ کیا۔ اور ابن اسحقؒ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ اتر جاؤ (یعنی پڑاؤ کر لو)۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس وادی میں کہیں پانی نہیں چل پڑاؤ کریں۔ اور لامعؒ میں ہے: ”آپؐ نے اُن سے رُخ بدل لیا“ کیوں کہ اگر آپؐ مکہ میں داخل ہو کر چانک کافری تک پہنچ جاتے تو اس کے نتیجے میں جنگ و قتال یا کسی اور مفسدہ کی نوبت آسکتی تھی۔ اس لئے کہ حج غیر حرج شہر میں داخل ہوتا تو مقابلہ اور ٹکراؤ لازمی تھا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے راستے سے رُخ بدل لیا۔ اور ان سے پہلو ہتی کر کے پڑاؤ کیا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ آپؐ ان سے اُلجھنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ورنہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ طواف کا نہ ہوتا تو ان کی غفلت کی حالت میں آپؐ ان پر لشکر چڑھا لاتے۔ اور لامعؒ کے حاشیہ میں عینیؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ داؤدی کہتے ہیں: ”جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ناقہ قصوائیٹھ گئی ہے تو آپؐ نے جان لیا کہ ارادہ خداوندی انہیں لڑائی سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اس امر کا فیصلہ فرمائے جو ہو کر رہنے والا تھا۔ اھ

پانی میں برکت کا معجزہ: یہاں تک کہ آپؐ حدیبیہ کے آخری کنارے پر ایسی جگہ اترے جہاں پانی بہت کم تھا۔ محمدؐ، ثناء اور میم مہملہ کے ساتھ فتح اور دال مہملہ کے ساتھ۔ کم پانی والی جگہ صاحب مواہب نے دیگر حضرات کی طرح اس کی تفسیر کی ہے کہ ”وہ گڑھا جس میں بہت کم پانی ہو۔“ کہا جائے کہ ”ماہ مغشود“ یعنی نہ پانی۔ اس سے معلوم

ہوا کہ بخاری شریف کی روایت میں "ثم" کے بعد "قلیل الماء" کے لفظ کا اضافہ تاکید کے لئے ہے، کیوں کہ بعض لوگوں کی زبان میں "ثم" کا لفظ زیادہ پانی کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اس لئے اس تاکید سے اس لغت کے مراد ہونے کے وہم کو رفع کرنا مقصود ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ "ثم" اس پانی کو کہتے ہیں جو موسم سرما میں دریا بہاؤ اور موسم گرما میں خشک ہو جائے۔ مگر اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ تو جہد جب صحیح ہے جب کہ از روئے لغت ثابت ہو جائے کہ لفظ "ثم" کثیر پانی پر بھی بولا جاتا ہے۔ پوری بحث زرقانی میں ہے:

_____ کہ لوگ اس کو چلوں سے تھوڑا تھوڑا اٹھاتے تھے (اصل عبارت یہ ہے
یتبرضہ: پہلے پھر تا پھر را مشد پھر مشد و معہ الناس تبرضا) قطلانی کہتے ہیں تبرضا باب تفعیل سے مفعول مطلق ہے
جو یہاں اظہار تکلف کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی لوگ اسے تھوڑا تھوڑا لیتے ہیں۔ حافظ کہتے ہیں: "برض فتح اور کن
کے ساتھ معمولی عطیر کو کہا جاتا ہے۔ صاحب عین کہتے ہیں کہ تبرض کے معنی ہیں چلوں سے پانی جمع کرنا۔ عروہ کا بیان
ہے کہ قریش پانی پر پہلے پیچ کر قبر چاٹتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شدید گرمی کے موسم میں حدیبیہ تشریف لائے
تھے اور وہاں ایک ہی کنواں تھا۔ پس وہ پانی جلد ہی ختم ہو گیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیاس کی
شکایت کی گئی۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک رکھ (برتن) میں رکھا تو انگشتان مبارک کے درمیان
سے پانی چشموں کی طرح پھٹنے لگا میں کہتا ہوں کہ یہ تھوڑے کنوئیں میں تیر ڈالنے کے قصہ سے پہلے پیش آیا تھا۔ اور یہ قصہ امام بخاری
نے معاذی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "حدیبیہ کے دن لوگوں کو پیاس نے ستایا
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پانی کا ڈنکا تھا۔ آپ نے اس سے وضو فرمایا۔ پھر لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوئے
دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے پاس نہ وضو کے لئے پانی ہے نہ پینے کے
_____ بس یہی پانی ہے جو آپ کے برتن میں ہے۔ یمن کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس
برتن میں رکھا تو پانی انگشتان مبارک کے درمیان سے چشموں کی طرح اُبلنے لگا۔ پس ہم نے پیا اور وضو کیا۔ حضرت جابر سے
دریافت کیا گیا کہ اس دن آپ کی تعداد کتنی تھی؟ فرمایا: اگر اُس دن ہم ایک لاکھ بھی ہوتے تو پانی کافی ہو جاتا، مگر ہم
صرف پندرہ تھے۔" میں کہتا ہوں کہ اس کے بعد کنوئیں کا وہ قصہ پیش آیا جو زرقانی اور صاحب خیس نے ذکر کیا ہے۔
کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیاس کی شکایت کی تو آپ نے اپنی ترکش سے ایک تیر نکالا، پھر انہیں حکم
فرمایا کہ اس کو پانی کے کنوئیں میں رکھ دیں۔ حافظ مقدمین کہتے ہیں کہ ابن سعد نے چودہ انفصاری صحابہ سے روایت
کیا ہے کہ جو صاحب کنوئیں میں اترے تھے اُن نام ناجیہ بن الاعجم تھا، بعض نے ناجیہ بن جندب کا جوہمی کے طوؤں

پر مامور تھے۔ اور بعض نے براہ بن عازب کا اور بعض نے عباد بن خالد کا نام ذکر کیا ہے اور الاستیعاب میں خالد بن عبادہ مذکور ہے۔ اور فتح میں فرماتے ہیں: تطبیق یوں ممکن ہے کہ کنواں کھودنے وغیرہ میں ان سب حضرات نے حصہ لیا۔ حافظ کہتے ہیں کہ ”مغازی میں قصہ حدیبیہ کے سلسلہ میں حضرت براہ بن عازب کی حدیث آئے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کنوئیں پر بیٹھے پھر ایک برتن طلب فرمایا۔ اس میں گلی کی۔ پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ پھر اسے کنوئیں میں ڈال دیا، پھر فرمایا کچھ دیر انتظار کرو، بعد ازاں صحابہؓ نے اس سے پانی لگالا اور خوب سیراب ہوئے اور تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ یہ دونوں قصے پیش آئے ہوں اور واقعہ کسی نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈول میں وضو کیا پھر اسے کنوئیں میں الٹ دیا اور ایک تیز نکال کر کنوئیں میں رکھ دیا۔ اور ابوالاسود نے عروہ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈول میں گلی کی پھر اسے کنوئیں میں ڈال دیا اور اپنے ترکش سے ایک تیز نکال کر اس میں ڈالا، اور دعا فرمائی، پس کنواں جوش مارنے لگا۔ پس یہ قصہ اس قصہ سے علاوہ ہے جو مغازی میں آئے گا، کہ لوگ پیاسے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک برتن رکھا تھا، آپؐ نے اپنا دست مبارک اس میں رکھا تو پانی انگشتان مبارک کے درمیان سے چشموں کی طرح اُبٹنے لگا، الحدیث: اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتان مبارک کے درمیان سے پانی پھوٹ نکلنے کا واقعہ اس کے علاوہ بھی کئی موقعوں پر پیش آیا اور غزوہ حدیبیہ کے آغاز میں آئے گا کہ حدیبیہ میں بارش بھی ہوئی تھی، بالحدیث: اور بارش ہونے کا مذکورہ واقعہ، مذکورہ بالا دونوں قصوں کے بعد ہوا تھا۔ فتح الباری کی عبارت ختم ہوئی۔

پس بخدا وہ اُن کے لئے برابر جوش مالتا رہا یہاں تک کہ وہ اس سے واپس ہوئے یعنی سیراب ہو کر لوٹے اور ابن سعدؒ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ ”میں تک کہ انہوں نے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر برتن بھرے۔“ فتح میں اسی طرح ہے نیز حافظ مغازی میں حضرت جابرؓ کی حدیث جس میں برتن میں ہاتھ رکھنے کا قصہ آتا ہے، کے ذیل میں فرماتے ہیں ”یہ حدیث حضرت جابرؓ کی حدیث کے مخالف ہے جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کا پانی کنوئیں میں ڈال دیا۔“ افداب جان نے ان دونوں کے درمیان یہ تطبیق دی ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا اور کتاب الاثر میں یہ تفصیل آئے گی کہ حضرت جابرؓ کی حدیث کے پانی پھوٹ نکلنے کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ نماز عصر کے وقت وضو کی ضرورت ہوئی اور حدیث جابرؓ کا قصہ، عام، ضروریات کے لئے پیش آیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ جب آپؐ کی انگشتان مبارک کے درمیان سے برتن میں پانی پھوٹ نکلا اور تمام حضرات صحابہؓ وضو اور پینے سے فارغ ہو گئے تو آپؐ نے برتن کے باقی ماندہ پانی کو کنوئیں میں ڈال دینے کا حکم فرمایا جس سے اس کا پانی بڑھ گیا۔“

اور امام احمدؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص چڑے کا ایک برتن لایا جس میں معمولی پانی تھا اور پوری جماعت میں اس کے علاوہ پانی نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پانی ایک پیالے میں اڈیل دیا پھر آپؐ نے اس سے

خوب اچھی طرح وضو کیا پھر آپ اس پیالے کو یونہی چھڑک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگ اس پیالے پر ٹوٹ پڑے۔ آپ نے یہ منظر دیکھا تو فرمایا: ذرا اٹھ جاؤ، پھر اپنا دست مبارک پیالے میں ڈال کر فرمایا: ہاں، خوب وضو کرو، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: نجد میں نے دیکھا کہ پانی کے چشتے آپ کی انگشتان مبارک کے درمیان سے اُبل رہے تھے۔ حافظؒ کہتے ہیں کہ آپ کی انگشتان مبارک سے پانی نکلنے کا واقعہ سفر اور حضر میں کئی بار پیش آیا۔“ **اھ مختصر**

حدیث میں بارش کا قصہ : میں کہتا ہوں کہ حافظ کے کلام میں ابھی گندہ ہے کہ ابن دوفوں قصوں کے درمیان بارش کا ذکر واقعہ پیش آیا اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا بارشاد نقل فرمایا، کہ صبح ہوئی تو میرے بعض بندے مجھ پر ایمان لائے اور بعض نے کفر کیا، الحدیث: یہ قصہ امام بخاریؒ نے غزوہ حدیبیہ میں حضرت زید بن خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ والے سال نکلے، ایک رات ہم پر بارش ہوئی۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صبح کی نماز پڑھائی، پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: جانتے ہو توہاں سے رب نے کیا فرمایا؟ ہم نے عرض کیا: اللہ ورسول اعلم (اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں) فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صبح ہوئی تو کچھ لوگ مجھ پر ایمان لانے والے تھے اور کچھ کفر کرنے والے، پس جن نے یہ کہا ہمیں اللہ کی رحمت، اللہ تعالیٰ کی رزق رسانی اور اللہ کے فضل و کرم سے بارش نصیب ہوئی وہ مجھ پر ایمان لانے اور ستاروں سے کفر کیا، اور جس نے کہا کہ ہمیں فلاں ستارے کی بدولت بارش ملی وہ ستاروں پر ایمان لانے اور مجھ سے کفر کیا۔“ **اوجز میں اس حدیث کی شرح اور اس کے مختلف الفاظ پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔**

آیت فذریہ کا نزول : نیز حدیبیہ میں کعب بن عجرہ کا قصہ پیش آیا اور فذریہ اذی کی آیت نازل ہوئی۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آکر کھڑے ہوئے ذراں حالیکہ میرے سر سے جوئیں گر رہی تھیں، پس فرمایا اگر کیا تیرے سر کی جوئیں تجھے ایذا دیتی ہیں؟ عرض کیا: جی ہاں، فرمایا: تو پھر بنا سر منڈا ڈالو۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی ”فن کان منکم لیضاً او بر اذی من راسہ“ **الایہ**، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین دن روزے رکھو، اور ایک اور روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعبؓ کو حدیبیہ میں سر منڈانے کا حکم فرمایا اور صحابہؓ کو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ انہیں یہیں احرام کھولنا ہوگا، وہ تو یہ امید لے بیٹھے کہ کہیں داخل ہوں گے، الحدیث: **اوجز میں اس قصہ کی روایت کے مختلف الفاظ تفصیل سے نقل کئے ہیں۔** منجملہ ان کے طبری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں، ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے (یعنی کعب بن عجرہ سے) بڑے اور وہ بجاہت احرام شجرہ کے پاس تھے۔“ اور ایک روایت میں ہے ”میں اپنی ہنڈیا کے نیچے آگ جلا رہا تھا اور جوئیں میرے چہرے پر پھر رہی تھیں۔“ اور ایک اور روایت میں ہے کہ ”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ حدید میں تھے، ہم نے احرام باندھ رکھا تھا اور مشیر کن نے ہمیں روک رکھا تھا۔ ان کے علاوہ اور الفاظ بھی ہیں۔ اس قصہ میں بہت سی فقہی بحثیں ہیں جو اجزائیں — تفصیل سے ذکر کی گئی ہیں، مثلاً فدیۃ آدمی کے روزوں کی تعداد کتنی ہو؟ روزہ کے عمل کی بحث، مسکین کو کتنی مقدار میں کھانا کھلایا جائے یا غلہ دیا جائے؟ کھانا کھلانے کا محل؟ مناسک حج سے متعلقہ مباحث کہ ان کی جگہ کون کون سی چیزیں کفایت کر سکتی ہیں؟ اور یہ بحث کہ جب تک موجب فدیہ کوئی چیز نہ پائی جائے کوئی شخص فدیہ ادا نہیں کر سکتا، ان کے علاوہ بھی مباحث ہیں جو اجزاء اور لامع کے حاشیہ میں ذکر کر چکا ہوں۔

بَدِیْلِ کی آمد : دریں اثناء کہ وہ اسی طرح حدید میں محصور تھے کہ بُدِیْلِ (بامرحومہ اور صغیرہ تصغیر کے ساتھ) حافظؒ نے کہا ہے کہ یہ مشہور صحابی ہیں۔ ابن رقاد، (فتح واو اور سکون را، تاف اور مد کے ساتھ) ابن عمرو بن ربیعہ خزاعی (ضم خاء اور ناس کے ساتھ) بنو خزاعہ کی طرف نسبت ہے، آئے۔ یہ اپنی قوم کے سردار تھے، ابو عمرو کہتے ہیں کہ یہ فتح مکہ کے دن مر الظهران میں اسلام لائے تھے، ابن اسحاق نے کہا کہ بدیل غزوہ حنین، غزوہ طائف اور غزوہ تبوک میں شریک ہوئے اور یہ فتح مکہ میں اسلام لانے والے اکابر میں سے تھے، بعض نے کہا ہے کہ یہ فتح مکہ سے قبل اسلام لائے، ابن مندہ اور ابو نعیم نے کہا ہے کہ یہ راءۃ قدیم سے اسلام لاپچکے تھے۔ زرقانی میں اسی طرح ہے۔ بدیل کے ساتھ ان کی قوم خزاعہ کے چند افراد تھے۔ ان میں عمرو بن سالم، حویش بن امیر، خارج بن کنذہ اور یزید بن امیر کا نام قابل ذکر ہے، اور یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معتقد تھے (اصل عبارت یہ ہے: ”وکان علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ یضربہ بفتح یاء، و سکون یاء اور اس کے بعد باد۔ اس چیز کو کہا جاتا ہے جس میں حفاظت کے لئے کپڑے لکھے جائیں یعنی یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پکے پیروار اور آپ کے رازدار تھے اور امین تھے، گویا سینہ کو جو راز کی امانت گاہ ہوتا ہے، اس صندِ حق کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس میں کپڑے بحفاظت رکھے جاتے ہیں۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ بنو خزاعہ کے تمام لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار تھے، مسلمان بھی اور غیر مسلم بھی۔ مگر میں جو کچھ بتانا چاہتا ہوں اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی نہیں رکھتے اور واقعہ کی روایت میں یہ بھی کہ بُدِیْلِ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ لڑائی کے لئے آئے ہیں مگر آپ کے پاس اسلحہ تو ہے نہیں؟ آپ نے فرمایا: ہم جنگ و قتال کے لئے نہیں آئے۔ زرقانی نے حافظؒ کی پیروی میں کہا ہے کہ بنو خزاعہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستی کی بنیاد یہ ہے کہ بنو ہاشم نے جاہلیت میں بنو خزاعہ سے معاہدہ کیا تھا اس لئے زمانہ اسلام میں بھی وہ اس پر قائم رہے۔ پس بُدِیْلِ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں کعب بن لوی اور عامر بن لوی کو ان دونوں کے درمیان اکتفا کیا کیوں کہ تمام قریش مکہ کا نسب ان ہی دونوں کی طرف راجع ہے، اس حالت میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ حدید کے بڑے بڑے چیمپوں پر فخر کش ہیں۔ زرقانی کہتے ہیں: ”اعداد (بفتح ہمزہ و سکون عین) عد (بکسر عین و تشدید) کی وجہ سے اور عد ایسے پانی کہ کہتے ہیں جو ختم نہ ہو، اس لئے اعداد کی اضافت یہاں حدید کی طرف عام کی اضافت ہے خاص کی طرف۔“

اور قاموس میں ہے کہ جَدَّ کا لفظ کسی چیز کی کثرت پر بھی بولا جاتا ہے اور اگر یہ معنی مراد ہوں تو صفت کی اضافت موصوفہ کی طرف ہوگی، یعنی حدید کے بڑے بڑے چٹے۔ حافظ کہتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں بہت سے پانی تھے اور یہ کہ قریش کے پیسے سے پانی پر قابض ہو چکے تھے، اس لئے مسلمان جب معمولی پانی کے کنوئیں پر اتارے تو ان کو پیاس نے ستایا اور عروہ کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ قریش پہلے اگر پانی پر قابض ہو چکے تھے، اور ان کے ساتھ اہل و عیال اور دودھ والے جانور بھی ہیں ”العوذ المطافیل“ اس کی شرح پہلے گزر چکی ہے اور وہ آپ سے لڑیں گے اور آپ کو بیت اللہ سے ملکیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدین کو جواب دیا اور فرمایا ہم کسی سے جنگ کرنے کے لئے نہیں آئے، بلکہ عمارا دادا کرنے کے لئے آئے ہیں اور قریش کو جانگنے کو نہایت ضعیف و زار کر رکھا ہے یعنی جو لڑائیاں آپ کے اور قریش کے درمیان بدر، احد و خندق وغیرہ میں ہو چکی ہیں ان سے ان کی قوت ٹوٹ چکی ہے اور ان کے احوال تباہ و برباد ہو چکے ہیں (حاج) پس اگر ان کی خواہش ہو تو میں ان سے ایک مدت کے لئے جنگ بندی کا معاہدہ کر لوں۔ یعنی اپنے اور ان کے درمیان ایک مدت مقرر کر دوں جس میں ہمارے اور ان کے درمیان جنگ موقوف رہے اور وہ مجھ اور دوسرے لوگوں یعنی کفار عرب وغیرہ کو منٹ لینے دیں، پس اگر میں ان پر غالب آ گیا، پھر اگر یہ بھی میری اس اطاعت میں داخل ہونا چاہیں جس میں دوسرے لوگ داخل ہوئے تو ایسا کر لیں۔ یعنی کہتے ہیں کہ دوسری شرط کا پہلی شرط پر عطف ہے اور ”تو ایسا کر لیں“ دونوں شرطوں کا جواب ہے۔ ”اور اگر میں غالب نہ آیا تو ان کو راحت مل گئی کہ جنگ و قتال کی ضرورت نہ رہے گی۔“ یعنی کہتے ہیں، اگر کہا جائے کہ اس تردید کے کیا معنی ہیں (یعنی اگر میں غالب ہوا تو یہ۔ اور اگر میں مغلوب ہوا تو یہ) جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قطعی یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ انھیں نصرت فرمائیں گے اور آپ کو ان پر غالب کر کے دیں گے۔ جواب یہ ہے کہ یہ بات مخاطب کے ذہن کی رعایت کرتے ہوئے علی سبیل التزلزل اور بطور فرض فرمائی۔ اور حافظ کہتے ہیں کہ اسی نکتہ کی خاطر دوسری شق کو حذف کر دیا یعنی آپ پر دشمن کے غالب آنے کی تصریح نہیں فرمائی۔ لیکن ابن اسحاق کی روایت میں یہ تصریح آئی ہے اور اس کے لفظ یہ ہیں ”پس اگر لوگوں نے مجھے صد سہ ہجریا تو قریش کی مراد برائے گی۔“ پس ظاہر ہے کہ کسی راوی نے رعایت ادب کی خاطر اس کو حذف کر دیا۔ اور اگر ان کو صلح سے انکاس ہے تو اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں اپنے دین کی خاطر ان سے لڑتا رہوں گا یہاں تک کہ میری گردن جدا ہو جائے۔ یہ کنایہ ہے قتل سے، کیوں کہ مقتول کی گردن جدا ہو جاتی ہے۔ اور داؤدی کہتے ہیں کہ اس سے مراد موت ہے۔ یعنی یہاں تک کہ میری موت واقع ہو جائے اور میں اپنی قبر میں تنہا رہ جاؤں اور ممکن ہے یہ مراد ہو کہ آپ لڑتے رہیں گے خواہ ان کے مقابل میں تنہا رہ جائیں اور بخدا! اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد کے واسطے

بے شک۔ اور ابو ذر کی روایت میں اس کے برعکس یہ ہے کہ کیا تم بیٹے نہیں ہو؟ کیا میں باپ نہیں ہوں؟ شیخ ذہبی نے اس کے قول "کیا تم بیٹے نہیں ہو؟" پر فرماتے ہیں کہ "ابن ہشام کی روایت میں اس کے برعکس ہے اور دونوں کے لئے وجہ صحیح موجود ہے، پس اگر روایت ۱۔ بیٹا ہونے کی ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی والدہ سُبَیْعہ، عبد شمس کی بیٹی تھی۔ (لہذا وہ قریش کے لئے لڑا ہے جوئے) اور اگر والدہ ہونے کی روایت صحیح ہو تو یہ باعتبار عمر میں بڑا ہونے کے کہا، اور اس سے غرض اپنی ذات سے ہمت کا دفع کرنا ہے تاکہ وہ جو خرمی لائے اسے غلط بیانی پر معمول نہ کیا جائے۔" اور لامع کے حاشیہ میں فتح سے نقل کیا ہے کہ صحیح روایت یہی کہ "کیا تم باپ اور میں بیٹا نہیں ہوں؟" اس نے کہا کہ کیا تم مجھے ہمت سمجھتے ہو یعنی کیا تم کو مجھ پر ہمت شبہ ہے وہ بولے نہیں آپ پر کوئی شبہ نہیں اور ابن اسحق کی روایت میں ہے کہ وہ بولے "تم بچ کہتے ہو تم ہمارے نزدیک ہمت نہیں۔" اس نے کہا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ میں نے اہل عکاظ (عین مہلکۃ ضمہ) کا بغیر تشدید کے، آخر میں ٹائے مجھ، منصرف ہے) کو اٹھانا چاہا یعنی اُن کو تہاری مدد کی دعوت دی، پھر جب انہوں نے میری بات نہیں مانی تو میں اپنے اہل واداد اور اپنے اہل طاعت لوگوں کو لے کر تہارے پاس آگیا، انہوں نے کہا: بالکل صحیح۔ اس نے کہا ان صاحب نے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے ساتھ مصلاتی کی بات یعنی خیر و صلاح اور انصاف کی بات کی پیش کش کی ہے اس کو قبول کر لو۔ ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ عروہ نے اصل دعا سے پہلے جو باتیں کہیں ان کا سبب یہ تھا کہ جو شخص مسلمانوں کے پاس سے ہو کر آتا قریش کا روتہ اس کے حق میں بڑا شدید ہو جاتا تھا اور ابن اسحق کی روایت میں عروہ سے پہلے کمرز اور اس کے بعض جلس کے جانے کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ "صحیح" کی روایت زیادہ صحیح ہے ماد مجھے اجازت دو کہ میں اس کے پاس جاؤں قریش نے کہا تم جا سکتے ہو۔

عروہ کی آمد : چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی قسم کی باتیں کرنے لگا جو بدیل نے کی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کا جواب دیا جو بدیل کو دیا تھا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان سے لڑوں گا۔ اس وقت عروہ نے کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم دیکھئے اگر آپ نے اپنی قوم کا قصہ پاک کر دیا۔ یعنی آپ نے ان کا بالکل ہی صفایا کر دیا تو کیا آپ نے اس سے قبل کسی عرب کو شہا ہے کہ اُس نے اپنی ہی قوم کو تباہ کر دیا ہو اور اگر دوسری صورت ہوئی اس کا جواب ادب کی بنا پر حذف کر دیا، مطلب یہ کہ اگر قریش کو غلبہ ہوا تو آپ کی حالت خطرہ سے خالی نہیں اور اس کا آئندہ قول: کیوں کہ میں الخ: اس کی دلیل ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس نے اپنے خیال میں دونوں صورتوں کو غیر مستحسن قرار دیا کہ اگر آپ

غالب آئے تو آپ کی قوم تباہ ہو کر رہ جائے گی اور اگر آپ مغلوب ہوئے تو آپ کے صحابہ منتشر ہو جائیں گے۔ مگر یہ دونوں صورتیں شرعاً مستحسن ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لَنْ تَرْضَوْنَ بِنَا اِلَّا اَحَدِي الْخَنِيْنِيْنَ" یعنی تم انتظار نہیں کرتے ہمارے حق میں مگر دو چیزوں میں سے ایک کا۔ کیوں کہ بخدا میں چند چہرے دیکھ رہا ہوں۔ شیخ المشائخ حضرت گنگوہی لایع میں فرماتے ہیں: "اس کا قول" میں چند چہرے دیکھ رہا ہوں" اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ چند صورتیں ایسی بھی نظر آ رہی ہیں جن سے بھاگ جانا کچھ بھی مستحب نہیں" اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ اس لفظ میں بخاری کے نسخے مختلف ہیں، اور تشریح میں اس کے مفہوم و مصلق میں اختلاف ہے، چنانچہ ہندوستانی نسخوں میں اثبات کے ساتھ ہے اور فتح الباری کے نسخہ میں ہے لا اس علی یعنی میں نہیں دیکھتا اور اسی طرح قطلانی اور سندھی کے نسخہ میں بھی نفی کے ساتھ ہے اور عینی کی موافقت میں قطلانی نے لفظ وجوہا کی شرح "اعیان و اشرف" کے ساتھ کی ہے، مگر حافظ نے اور اسی طرح کرمانی نے اس کی تشریح سے تعرض نہیں کیا، پس در صورت اثبات، اعیان و اشرف سے مراد قریش ہوں گے اور مطلب یہ ہوگا کہ قریش کے ساتھ تو اشرف اور سربراہ اور لوگ ہیں اور آپ کے ساتھ ہر قسم کے طے جملے لوگ، شیخ الاسلام نے اپنی شرح میں اس فقرہ کے یہی معنی لئے ہیں اور در صورت نفی اس سے مراد مسلمان ہوں گے، یعنی آپ کے ساتھ اعیان و اشرف نظر نہیں آرہے بلکہ ادھر ادھر کے آدمی ہیں اور شیخ قدس سرہ نے جو مطلب بیان فرمایا ہے وہ ہندوستانی نسخہ پر مبنی ہے جو اثبات کے ساتھ ہے یعنی آپ کے ساتھ بے پچھانے چہرے نظر آتے ہیں جو موقع پر راہ فرار اختیار کریں گے اور صاحب فیض نے بھی یہی معنی لئے ہیں۔ چنانچہ موصوف نے وجوہا (چہروں) کی تفسیر "مختلف قبائل" کے ساتھ کی ہے اور شیخ کے بیان کردہ معنی اسباق کے زیادہ قریب ہیں، کیوں کہ یہ تمام فقرہ اس کے قول "اور اگر دوسری صورت ہوئی" کے تحت ذکر کیا گیا ہے، اور حافظ کے کلام سے بھی یہی معنی نکلتے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "اس کے قول" اور اگر دوسری صورت ہوئی؛ کا جواب ذکر نہیں کیا گیا، مطلب یہ ہے کہ اگر قریش کو غلبہ ہوا تو آپ کی حالت خطرے سے خالی نہیں اور اس کا قول، اور بخدا! مجھے آپ کے ساتھ چند چہرے نظر آرہے ہیں۔ یہ گویا اس جواب مخدوٹ کی دلیل ہے۔ پوری بحث حاشیہ لایع میں دیکھ لی جائے۔ اور زرقانی شرح مواہب میں کہتے ہیں کہ بخاری میں اس طرح وجوہا کا لفظ اثبات کے ساتھ ہے اور مصنف یعنی قطلانی نے اس کی شرح "اعیان و اشرف" کے ساتھ کی ہے، لہذا اس سے مراد قریش ہوں گے اور مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعداء تو اعیان و اشرف ہیں اور آپ کے صحابہ طے جملے (مختلف قبائل کے گھٹیا بڑھیا قسم کے سبھی) لوگ

ہیں اور مواہب کے بعض نسخوں میں اس کہ بجائے: لا اراہی کا تصحیف شدہ لفظ ہے۔ یعنی میں نہیں دیکھتا، اور شارح نے اس نسخہ کو نقل کرنے پر کفایت کر کے اس کی شرح میں تکلف کیا ہے کہ یہ صحابہ کے میدان جنگ ثابت قدم نہ رہنے کی گویا دلیل ہے۔ یعنی ان سے مدد کی توقع نہیں، نہ یہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں گے کیوں کہ یہ بڑے جملے لوگ ہیں، کسی ایک قبیلہ کے افراد نہیں کہ ایک دوسرے کی مدد کے لئے میدان میں بڑبڑ جائے گا جذبہ ان میں پایا جائے۔ مگر چونکہ روایت اس لفظ کے ساتھ وارد نہیں، نہ شارحین نے اس پر کلام کیا ہے اور نہ بطور نسخہ ہی کے اس کا ذکر کیا ہے، لہذا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اھ

نزد قاتی کا یہ کننا کہ لفظ "لا" کا کوئی نسخہ نہیں بہت ہی عجیب ہے، کیوں کہ فتح الباری، قسطلانی اور سندھی کا یہی نسخہ ہے اور ان کا یہ کہنا کہ شارح نے تکلف کیا ہے یہ بھی عجیب ہے کیوں کہ یہی مطلب حافظ کے کلام میں پہلے گز چکا ہے۔ اور بے شک میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے ساتھ مخلوط قسم کے لوگ (اشواہا) ہیں یہاں بخاری کے تمام ہندی و مصری نیز شروح کے نسخے اثبات کے ساتھ ہیں، اور حاشیہ لاسمع میں ہے کہ اس لفظ اشواہا میں شارحین کا اختلاف ہے، حافظ کہتے ہیں کہ شین واؤ سے پہلے ہے، اور اکثر نسخوں میں یہی ہے، اور صاحب مشارق نے صرف اسی کو ذکر کیا ہے اور ابوذر نے کشمینی سے "اشواہا" کا لفظ نقل کیا ہے۔ یعنی شین سے پہلے واؤ، اھ اور علی کہتے ہیں کہ خطابی نے کہا ہے کہ اشواہا سے مراد بڑے جملے لوگ ہیں اور شرب کے معنی لانا ہے اور ایک روایت میں تقدیم واؤ کے ساتھ "اشاب" کا لفظ ہے اور یہ بھی اسی کی مثل ہے اور جب مختلف قبائل کے متفرق لوگ جمع ہوں تو ان کو اشاب اور اشابات کہا جاتا ہے۔ اور ابوذر کی روایت میں اوہاش کا لفظ ہے اس سے مراد گھٹیا قسم کے مخلوط لوگ۔ اھ اور حافظ کہتے ہیں کہ وہ اشواہ سے اخذ ہے۔ حاشیہ لاسمع کی عبارت ختم ہوئی۔ اور آپ سے یہ بات مخفی نہیں ہوگی کہ ابوذر کی روایت کے نقل کرنے میں حافظ اور عینی میں اختلاف ہوا ہے اور قسطلانی نے ابوذر کی روایت نقل کرنے میں حافظ کی پیروی کی ہے، اس کے بعد کہا ہے کہ ایک روایت میں ہے "اوہاش کا نقطہ جہاں لائق ہیں کہ آپ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ "مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ قریش سے اگر آپ کا مقابلہ ہوا تو یہ لوگ آپ کو بے مدد چھوڑ دیں گے اور آپ کو کپڑے قید کر لیا جائے گا، اس سے زیادہ گرانی کی بات آپ کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے؟ عروہ کے اس قول سے معلوم ہوا کہ ان کے ہاں یہ بات معروف تھی کہ جو لشکر مختلف قبائل سے ترتیب دیئے جائیں ان کے بھاگ جانے کا اندیشہ رہتا ہے

اس کے برعکس جو لشکر ایک ہی قبیلہ کا ہو وہ عادیہ بھاگنے سے مار کرتے ہیں اور عروہ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ مودت اسلام مودت قرابت سے عظیم تر ہے اور یہ بات اس وقت اس کے سامنے کھل کر آگئی جب مسلمانوں کو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں مبالغہ کرتے دیکھا جیسا کہ خود اس کا اپنا بیان آگے آتا ہے۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اور ابن اسحاق کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھے تھے، عروہ کی یہ بات سنی تو غصہ سے فرمایا: **تولات کی شرم گاہ کو چوس بنظر: بلیغ باد اور سکون ظاہر معجزہ، اس قطعہ کو کہتے ہیں جو خنہ کے بعد عورت کی شرم گاہ میں باقی رہ جاتا ہے، اور لات ان کے ایک بت کا نام ہے جس کی پرستش قریش اور بنو نضیر کرتے تھے، اہل عرب جب کسی کو ماں کی گالی دیتے تو کہا کرتے تھے: "تلات شخص اپنی ماں کی شرم گاہ کو چوسے۔"** حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ماں کی جگہ ان کے معبود کا ذکر کر کے اس گالی کو اور زیادہ سخت بنادیا اور یہ گالی اس برہمی کا اظہار تھی جو مسلمانوں کی طرف فرار کو منسوب کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس قسم کے گستاخانے الفاظ کا استعمال جائز ہے جب کہ کسی ایسے شخص کو جو ایسے الفاظ کا مستحق ہے ڈانٹنا مقصود ہو۔

پہلی بحث حاشیہ لامع میں ہے اور حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عروہ سے اس درشت گوئی میں اس بات کی دلیل ہے کہ کسی مناسب موقع پر مصلحت کی خاطر اعضائے مستورہ کا نام صراحتاً ذکر کرنے کی اجازت ہے، چنانچہ جو شخص دعوائے جاہلیت کرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو بغیر کسی اشارے کناٹے کے صاف صاف کہو کہ اپنے باپ کی پیشاب گاہ کو منہ سے کاٹ: پس ثابت ہوا کہ ہر بات موقع کے مناسب ہونی چاہیئے۔ کیا ہم آپؐ سے بھاگ جائیں گے اور آپؐ کو تنہا چھوڑ دیں گے؟ استفہام انکاری ہے جس سے مقصود عروہ کو اس امر پر توجیح کرنا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی طرف فرار کو کیوں منسوب کیا۔ عروہ نے کہا کہ یہ کون ہے؟ جس نے اتنی سخت گالی دے ڈالی۔ اس کو بتایا گیا کہ یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ اے محمدؐ: یہ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: یہ ابو قحافہ کا بیٹا ہے۔ عروہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، اس لئے

لے امصص: بافت وصل ومصادین مہتین الاولیٰ مفتخرہ، بصیغہ الامر من معصص یعصص من باب علم یعلم وحکما ابن المتین بصغیر الصاد الاولیٰ وخطام۔ کنذانی القطلائی تجا علیہا فظین، قال ابنہ قانی لاند خلافت الوردیہ وان جار لغتہ۔ اور

یہ دریافت کرنا اس بات کے منافی نہیں کہ وہ ان کو پہچانتا ہو اور ان کا اس کے ذمہ احسان بھی ہو۔ زرقانی میں اسی طرح ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے یہ سوال تجاہلِ عارفانہ کے انداز میں کیا ہو کہ گالی کی وجہ سے اسے حضرت ابوبکرؓ پر بہت غصہ آ رہا تھا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زہ اور خود ہیں کہ بے پہچان ہو گئے ہوں، جیسا کہ آئندہ مغیرہ کے قصے میں آتا ہے، اور اس پر یہ اشکال نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو اسلام ساتھ لے کر نہیں چلے تھے۔ کیوں کہ زندہ اور خود اسلام میں شمار نہیں ہوتی، اس نے کہا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قسم کھانعوں کی عادت تھی۔ اگر تیرا ایک احسان، جس کا میں بدلہ ادا نہیں کر سکا، مجھ پر ہوتا تو میں تجھے اس کا جواب دیتا۔ ابن اسحاق کی روایت میں یہ اضافہ ہے: لیکن یہ اس کے بدلہ میں ہے یعنی اس گالی کا جواب نہ دے کر اس نے اس احسان کا بدلہ ادا کر دیا، جو اس کے ذمہ تھا اور ایک روایت میں ہے کہ یہ مذکورہ بالا احسان یہ تھا کہ عروہ نے ایک دیت اٹھائی تھی، حضرت ابوبکرؓ نے اس میں اس کی بہت اچھی مدد کی تھی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ دوسرے لوگوں نے دو دو، تین تین اونٹوں سے مدد کی تھی اور حضرت ابوبکرؓ نے دس اونٹیاں دی تھیں۔ راوی کا بیان ہے کہ عروہ دورانِ گفتگو بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک پر کھڑکیا تھا، یہ عرب کی عادت تھی کہ جب ایک آدمی دوسرے سے مخاطب ہوتا تو دورانِ گفتگو اس کی داڑھی پکڑ لیا کرتا تھا، خصوصاً جب کہ باہمی ملاطفت کا اظہار مقصود ہوتا، عام طور سے یہ معاملہ ایک شخص اپنے ہم مثل ہی سے کیا کرتا تھا۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عروہ کی تالیفِ قلب اور دل جوئی کے لئے اس سے مسامحہ فرما رہے تھے، اور حضرت مغیرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور جلالِ قدر کے پیشِ نظر اس سے منع کرنے لگے۔ اور مغیرہ بن شعبہ بن مسعود ثقفی مشہور صحابی ہیں، حدیث میں سے قبل اسلام لائے اور صحیح قول کے مطابق سن ۳ھ میں انتقال ہوا یہ عروہ بن مسعود کے حقیقی بھتیجے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر کھڑے تھے، اس سے ثابت ہوا کہ دشمن کا خطہ ہوا تو پہرہ دینے یا دشمن کو معروب کرنے کی خاطر امیر کے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہونا جائز ہے اور بیٹھنے والے کے سر پر کھڑے ہونے کی جو مانعت آئی ہے، یہ اس کے معارض نہیں۔ کیوں کہ مخالفت اس صورت میں ہے جب کہ یہ غصت و کبر کی خاطر ہو، اور ابن قیمؒ نے اس قصے کے فوائد میں کہا ہے: ”باجور کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت نہیں تھی کہ کوئی آپ کے سر پر کھڑا ہو، مگر اس موقع پر حضرت مغیرہؓ کا تلوار لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر کھڑے ہونا اس میں یہ قابلِ اقتداء سنت ہے کہ دشمن کے قاصدوں کی آمد کے موقع پر اہم کی عزت و فخر، تعظیم و اطاعت اور اس کی حفاظت و وقایت کا مظاہرہ کیا جائے، اور یہی عادت جاری رہی ہے، جب کہ

مسلمانوں کے قاصد کافروں کے پاس یا کافروں کے قاصد مسلمانوں کے پاس آئیں۔ اور یہ وہ قیام نہیں جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذموم قرار دیا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ فخر و تکبر لڑائی کے میدان میں مذموم نہیں، جب کہ دوسری جگہ مذموم ہے۔ اور ان کے ہاتھ میں تلوار اور سر پر خود بھی ہتھیار ہو سکتا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ مغیرہؓ نے جب عروہؓ کو آتے دیکھا تو اپنی زہ پہن لی اور سر پر خود پہن لی، تاکہ عروہؓ ان کو نہ پہچان سکے۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ یہ اشکال ہے کہ حضرات تو احرام میں تھے پھر حضرت مغیرہؓ نے خود کیسے پہن لی؟ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے اس سے تعرض کیا ہو، اس سے خلاصی یوں ممکن ہے کہ ان کا یہ فعل مجبوری کی بنا پر تھا، جیسا کہ سر پر جوئیں ہو جائیں تو حق جائز ہے۔ پس جب بھی عروہؓ اپنا ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کی طرف بڑھاتا تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احلال و تعظیم کے لئے اس کے ہاتھ پر تلوار کا نعل مار تے، تلوار کی نیام کے نیچے جو چاندی وغیرہ لگی ہوتی ہے اسے نعل کہتے ہیں۔ اور اس سے کہتے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش سے اپنا ہاتھ پیچھے رکھ، عروہ بن زبیر کی روایت میں یہ اضافہ ہے: ”کیوں کہ کوئی مشرک اس لائق نہیں کہ اس کو ہاتھ لگائے“۔ پس عروہؓ نے سراٹھایا اور کہا، یہ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: مغیرہ بن شعبہ اور ایک اور روایت میں ہے کہ جب مغیرہؓ نے اس کے ہاتھ پر کئی بار تلوار ماری، تو غضبناک ہو کر لولا، کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ یہ کون ہے؟ جو آپؐ کے صحابہؓ میں سے مجھے ایذا دیتا ہے، بخدا میرے خیال میں تمہاری جماعت میں اس سے بدتر اور اس سے بڑھ کر کبھی شخص کوئی اور نہ ہوگا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو عروہؓ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ اسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: یہ میرا بھتیجا مغیرہ بن شعبہ ہے۔“ پس عروہؓ نے کہا بوجہ وفا خدا، اللہ، بردن عمر، غدار سے محدود ہے اور ان کے وصف غدر میں مبالغہ مقصود ہے کیا میں تیری غداری میں کوشش نہیں کر رہا، یعنی مال نہیں خرچ کر رہا اور تیری جانت کے شر کو دفع نہیں کر رہا ہوں! اور اس کا قصہ یہ ہوا تھا زمانہ نجاہلیت میں مغیرہ ایک قوم کے ساتھ رفیق سفر ہوئے تھے، اور ان کو قتل کر کے ان کے اموال پر قبضہ کر لیا تھا۔ حافظؒ کہتے ہیں کہ واقعہ یہ ہوا تھا کہ وہ بنو مالک کے تیرہ افراد کے ساتھ متحوق بنو شاہ مصر کی ملاقات کے لئے گئے، بادشاہ نے ان کو عطیات سے نوازا، مگر مغیرہؓ کو حصہ کم ملا۔ مغیرہؓ کو اس سے غیرت آئی، واپسی پر انہوں نے شراب پی، جب مہربوش ہو کر سو گئے تو مغیرہؓ نے سب کو قتل کر دیا۔ اللہ الخ میں اس پر یہ اضافہ ہے ”بنو مالک کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے مغیرہؓ کے قبیلہ سے لڑائی کی تیاری شروع کر دی، عروہ بن سحر نے بیچ میں چلا کر لڑائی کی آگ کو ٹھنڈا کیا، اور بنو مالک کو تیرہ مقتولوں کی میت دینا منظور کی، انہوں نے اس پر ضلع کر لی، عروہؓ کے اس قتل میں اسی بات کی طرف

اشارہ ہے ”اھ بعد ازاں معزو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے، پس حضرت ابو بکرؓ نے ان سے دریافت فرمایا کہ نبو مالک کے جو لوگ تیرے ساتھ گئے تھے ان کا کیا ہوا؟ معزوؓ نے کہا کہ میں نے اُن کو قتل کر دیا اور اُن سے چھینا ہوا مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا ہوں کہ آپ اس (کے ذریعہ لوگوں) جس سلوک فرمائیں یا جو آپ کی رائے ہو اس کے موافق عمل کریں۔ پس بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام تو قبول کرتا ہوں، لیکن مال سے مجھے کوئی سروکار نہیں! یعنی اس سے کچھ تعزیر نہیں کرنا کہ یہ بدعہدی کے ساتھ حاصل کیا گیا ہے، اس لئے کہ اس کی حالت میں کافر کا مال غدر (بدعہدی اور دھوکہ) کے ساتھ لینا جائز نہیں، کیوں کہ دفاع کی ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت امانت پر مبنی ہوتی ہے، اور جن کی امانت ہو ان کو امانت کا ادا کرنا لازمی ہے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر۔ ہاں کافروں کا مال جنگ اور غلبہ کے ذریعہ حلال ہے۔ غالباً یہ مال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معزوؓ ہی کے پاس رکھنے دیا ہوگا تاکہ ممکن ہے اس کی قوم مسلمان ہو جائے تو ان کو واپس کر دیا جائے۔ زرقانی میں حافظؒ کے کلام سے اخذ کرتے ہوئے اسی طرح لکھا ہے۔ اور حضرت شیخ قدس مترو نے بذکر میں حافظؒ کا کلام ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ ”میں کہتا ہوں اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ حصول مال کا ذریعہ اگر حرام ہو تو وہ مال میں بھی مؤثر ہوگا، اس لئے یہ مال حرام ہوگا، کیوں کہ کفار کے مال اصل میں تو مباح ہیں، ان کی کوئی حرمت نہیں، اس کے باوجود جب بذریعہ بدعہدی حاصل کیا جائے تو حرام ہے، البتہ اگر جنگ میں غلبہ کے ذریعہ حاصل کیا جائے، یا کافر کی رضامندی سے عقیدہ اس کے ذریعہ لیا جائے بشرطیکہ غدر نہ ہو تو جائز ہے۔“ حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں: ”اس قصہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ، جس مشرک سے معاہدہ ہو اس کا مال محفوظ و معصوم ہے اور کیونکہ کوئی شخص اس کا مالک نہیں ہو سکتا بلکہ اس مشرک کو واپس کیا جائے گا، چنانچہ معزوؓ نے امان کی شرط پر ان سے رفاقت کی تھی، پھر ان سے بدعہدی کر کے ان کے مال لے لئے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اموال سے تعزیر نہیں فرمایا، نہ ان کی مداخلت کی، نہ ان کے ضامن ہوئے کیوں کہ یہ قبیحہ معزوؓ کے اسلام لانے سے قبل کا تھا۔“ میں کہتا ہوں کہ اس پر ابوبصیر کے قصہ سے، جو آگے آتا ہے، اشکال نہیں ہوتا کہ وہ بھی ان دو مشرکوں کے رفیق تھے جن کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس بھیجا تھا اس لئے کہ وہ اپنی رضامندی سے اُن کے رفیق بن گئے تھے، بلکہ اُن کے ہاتھ میں قیدی تھے، اور حنفیہ کے نزدیک قیدی کے لئے جائز ہے کہ وہ (کافروں کو) دھوکہ دے اور قتل کر دے۔

اور سیوطیؒ نے درمثور میں ذکر کیا ہے کہ ”خطیب نے اپنی تاریخ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حق تعالیٰ کے ارشاد ”وَمَنِ اتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا“ (یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کے لئے نکلنے کی

صورت پیدا فرمادیں گے) کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہ آیت عوف بن مالک اشجعیؓ کے حق میں نازل ہوئی، مشرکوں نے ان کو قید کر لیا اور باندھ کر بھوکا رکھا، انہوں نے اپنے والد کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ آگے حدیث طویل ہے اور اس کے آخر میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بندش کھلنے کی صورت پیدا کر دی۔ پس وہ اُن کی وادی سے گزرے جہاں ان کے مال مرویشی اونٹ بکری چر رہے تھے۔ وہ ان تمام مرویشیوں کو بینکا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے میری بندش کھول دی، بعد ازاں میں ان کے مرویشیوں کو خفیہ طور پر پہنکا لیا، اب یہ حلال ہیں یا حرام؟ فرمایا: نہیں بلکہ حلال ہیں، ہم جب چاہیں ان کا خنص بھول کریں گے۔“ الخ۔

پھر یہاں ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ عروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ (کے حالات) بڑے غور سے دیکھتا رہا، اس کا بیان ہے کہ خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لمبے نہیں ڈالی مگر وہ صحابہؓ میں سے کسی نہ کسی آدمی کے ہاتھ میں گری اور اس نے بطور تبرک اس کو اپنے منہ اور جسم پر مل لیا اور بن اسحقؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی موٹے مبارک نہیں گرا مگر صحابہؓ نے فوراً اسے لے لیا، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی حکم فرمایا تو آپؐ کے حکم کی تعمیل کے لئے ہر ایک نے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تو قرب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعضاء مبارک سے گرنے والے پانی کے لئے لڑ پڑیں، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بات کی اور ابوذرؓ کی رطبت میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی بات کی تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی آواز کو نہایت پست رکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کی بنا پر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھ مبرکہ نہیں دیکھتے تھے یعنی مجال نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظریں جمائے رکھیں۔ حافظؒ کہتے ہیں، ”اس میں بے غم اور جسم کے جدا ہونے والے بالوں کی طہارت پر، نیز صالحین کے پاک فضلات سے تبرک حاصل کرنے کا ثبوت ہے۔ غالباً حضرات صحابہؓ نے یہ سب کچھ عروہ کے سامنے کیا، اور اس میں خوب مبالغہ فرمایا، جس سے اس طرف اشارہ مقصود تھا کہ اس کا ان کی نسبت فکر کا خیال ناسد ہے، گویا وہ بزبان حال کہہ رہے تھے کہ جو شخص اپنے امام سے ایسی محبت رکھتا ہو اور اس کی اس درجہ تعظیم کرتا ہو اس کے بارے میں یہ گمان کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے امام کو چھوڑ کر بھاگ جائے گا، اور اسے دشمن کے حوالے کر دے گا اور یہ کہ صحابہؓ کرامؓ جس درجہ آپؐ پر جان بچھا کر کرتے ہیں اور آپؐ کی اور آپؐ کے دین کی مدد کے لئے سرکوف ہیں، اس کے مقابلہ میں ان قابل کی کیا وقعت ہے جو محض خون

اور رشتہ کی بنیاد پر ایک دوسرے کی نگہداشت کیا کرتے ہیں۔" اور پس عروہ اپنے لوگوں کے یعنی اہل مکہ کے پاس گیا پس ان سے کہا: اے قوم اللہ کی قسم! میں بادشاہوں کے ہاں گیا ہوں اور قیصریہ شاہِ روم کا لقب ہے اور کسریٰ کا فتح کے فتح اور کسرہ کے ساتھ۔ شاہِ فارس کا لقب ہے اور نجاشی نون کا فتح اور کسرہ بھی جائز ہے اور جہنم بغیر تشدید کے اور جہنم پر تشدید پڑنا غلط ہے۔ جہنم کے بعد الف ہے پھر شین معجم، پھر یائے مقدودہ اور مخففہ۔ یہ شاہِ حبشہ کا لقب ہے کے ذہاب میں بھی لکھا ہوں۔ ان تینوں بادشاہوں کا ذکر عطفِ خاص علی العام ہے۔ یہ تینوں اس دور کے سب سے بڑے بادشاہ تھے اس لئے ان کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ اور شیخ لایع میں لکھتے ہیں: "ان تینوں کا خصوصی ذکر کیا یا توان کی عظمت کی وجہ سے اور پہلے عام بادشاہوں کا ذکر تھا، یا بادشاہوں

سے چھوٹے اور کسریٰ وغیرہ سے بڑے بادشاہ مراد ہیں۔" اور لایع کے حاشیہ میں فتح سے نقل کیا ہے کہ "ابن ابی شیبہ میں علی بن زید کی منزل روایت میں ہے کہ عروہ نے کہا: اے قوم! میں نے بادشاہ دیکھے ہیں مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی نظر سے نہیں گزرا، اور وہ بادشاہ نہیں مگر میں نے نبی کے اونٹ بندھے دیکھے ہیں اور میرے خیال میں تو تم پر کوئی بہت ہی آفت ٹوٹ کر رہے گی، یہ کہہ کر وہ اپنے رفقاء سمیت طائف کی طرف چلا گیا۔" وائے میں نے کبھی کوئی بادشاہ نہیں دیکھا کہ اس کے ہم نشین اس کی ایسی تعظیم کرتے ہوں، جیسی تعظیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کرتے ہیں۔ خدا کی قسم وہ کبھی بخور کتے ہیں تو وہ ان میں سے کسی نہ کسی آدمی کے ہاتھ پر گرتا ہے، اور وہ اپنے منہ اور ہاتھ اور بدن پر بل لیتا ہے۔ اور جب وہ انہیں کوئی حکم دیتے ہیں تو فوراً اس کی تعمیل کرتے ہیں، اور جب وہ وضو کرتے ہیں، تو ان کے وضو کا پانی حاصل کرنے کے لئے اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں گویا آپس میں لڑ پڑیں گے، اور جب وہ بات کرتے ہیں اور ایک روایت میں کہ جب آپ کے صحابہؓ بات کرتے ہیں تو اپنی آواز نہایت پست رکھتے ہیں اور اس کی تعظیم کی بنا پر اس کی طرف نظر بھرنے کی جگہ تک نہیں اور اس نے تمہارے سامنے ایک بھلائی کی تجویز رکھی ہے اس کی تجویز قبول کر لو۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے: خدا کی قسم میں نے ایسی قوم دیکھی ہے جو کسی حالت میں بھی ان کو بے مدد نہیں چھوڑے گی۔ اب جو تمہاری رائے ہو اس پر عمل کرو۔ اس پر بنو کنانہ کے ایک شخص نے کہا: نہ زحالی کہتے ہیں کہ یہ مجلس تھا، حار اور سین ہلکے کے ساتھ، بصیغہ تصغیر، اور ابن اسحاق اور زہری بن زکاف نے اس کے باپ کا نام حلقہ ذکر کیا ہے۔ مجلس اُس دن احابش کا سردار تھا۔ برہان نے کہا کہ مجھے اس کا اسلام لانا معلوم نہیں، بظاہر کفر پر مرا ہے۔" افہ احابش کے معنی پہلے گندھکے ہیں۔ حافظ کہتے ہیں: اور زہری بن زکاف کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے انکار کرتا ہے کہ لحم، جذام، گندہ اور حیر کے قبیلے ترجیح کریں، اور عبد المطلب کے خاندان کو اجازت نہ ہو۔ "آہ اور صاحبِ حقیس نے مجلس کو بنو کنانہ کے ایک شخص سے الگ ذکر کیا ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے: "پس بنو کنانہ سے ایک

شخص نے کہا مجھے اجازت دو تو میں ان کے پاس جاتا ہوں، پس انہوں نے کہا جاؤ، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا: "یہ فلاں شخص ہے اور یہ لوگ ہدی کے جانوروں کی بڑی تعظیم کرتے ہیں اس لیے یہ جانور اس کے سامنے کھڑے کر دو۔ چنانچہ ہدی کے جانور کھڑے کر دیئے گئے، اور لوگوں نے تلخیرہ کہتے ہوئے اس کا استقبال کیا، جب اس نے یہ منظر دیکھا تو بڑا سببان اللہ ان لوگوں کو بیت اللہ سے روکنا بڑا مناسب نہیں، اس کے بعد قریش نے مجلس کو بھیجا، اور ایک روایت میں ہے کہ اس پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی آنکھیں پُرم ہو گئیں، اور کہنے لگا: رت کبھ کی قسم قریش ہلاک ہو گئے، یہ لوگ تو صرف عمرہ کے لئے آئے ہیں۔ اور جب قریش کے پاس واپس گیا تو ان سے کہا کہ میں نے دیکھا کہ ہدی کے اونٹوں کو قلاوہ پہنائے ہوئے ہیں اور ان کا اشعار کیا ہو رہا ہے، اس لئے میری یہ رائے ہرگز نہیں کہ ان کو بیت اللہ سے روکا جائے، پھر قریش نے مجلس بن علقمہ کو بھیجا، معالم التنزیل میں اسی طرح ہے اور رؤفہ اللجباب میں مجلس اور بنو کنانہ کے آدمی کو ایک ہی قرار دیا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے کہ بنو کنانہ کے ایک آدمی نے جو مجلس کہلاتا تھا کہا، اور ایک روایت میں ہے کہ علقمہ نے کہا: مجھے اجازت دو میں آپ کے پاس جاتا ہوں، قریش نے کہا: تم جاسکتے ہو۔

کنانی کی آمد : پس جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ فلاں شخص ہے اور یہ اس قوم کا فرد ہے جو ہدی کے اونٹوں کی بہت عزت کرتے ہیں، "بُذْنُ بَدْنِی" کی جمع ہے، اونٹ کو کہتے ہیں خواہ زہریا مادہ۔ اور اس میں تا، "تانیث کی نہیں، وحدت کی ہے" اس لئے تمام اونٹوں کو یک بار کی اٹھا کر اس کے سامنے کھڑا کر دو۔ چنانچہ اونٹ کھڑے کر دیئے گئے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر عبرت پکڑے اور اسے ثابت ہو جائے کہ یہ لوگ لڑائی کے لئے نہیں آئے۔ اور مکر جاکر عمرہ ادا کرنے میں ان کی مدد کرے۔ حافظ کہتے ہیں، ادا بن اسحاق کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب اس نے ہدی کے اونٹوں کو قلاوہ پہنے ہوئے، وادی کے کنارے سے اپنی طرف سیلاب کے پانی کی طرح بہتے ہوئے دیکھا، "جن کو اپنے غل سے روکا گیا تھا، تو وہیں سے لوٹ گیا" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں مینچا، "لیکن معاذی عمرہ میں روایت ہے جو حاکم سے مروی ہے کہ مجلس نے چنچ کر کہا: رت کبھ کی قسم قریش ہلاک ہو گئے۔ یہ لوگ صرف عمرہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ہاں ہاں۔ اسے بنو کنانہ کے مبعوث (یعنی اس قوم کے فرد) ان کو یہ بات بتا دیجو! پس مکن ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دور ہی سے اس کو مخاطب فرمایا: "اے آدم لوگوں نے یعنی صحابہؓ نے اس کا تلخیرہ کہتے ہوئے استقبال کیا، اس سے ثابت ہوا کہ کسی دینی مصلحت کے لئے یہ ریا جائز ہے جیسا کہ علماء نے مصالح دینیہ کیلئے اظہارِ مدد کو محتجب کہا ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور حافظ عینی

کہتے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ طرائی میں خدایہ سے کام لینا اور ایک چیز کا ارادہ ظاہر کرنا جب کہ مقصود اس کے خلاف کچھ اور ہو، جائز ہے۔ اور حافظ ابن قیم کہتے ہیں کہ قریش کے اس قاصد کے سامنے اونٹوں کے کھڑا کرنے میں اس امر کی دلیل ہے کہ کفار کے قاصدوں کے سامنے شرائع اسلام کا اظہار مستحب ہے، پس جب اس کنانی نے یہ منظر دیکھا تو ازراہ تعجب بولا: سبحان اللہ! ان لوگوں کو بیت اللہ سے روکنا ہرگز مناسب نہیں، حافظ کہتے ہیں: ”اس سے معلوم ہوا کہ بہت سے کافر بھی حرم اور احرام کی حرمت کی تعظیم بجالاتے تھے اور جو شخص اس سے روکتا اس پر نکر کرتے تھے اور یہ حضرت ابراہیم علی نبیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کے باقی ماندہ آثار تھے۔“ اھ پس جب وہ اپنے ساتھیوں یعنی اہل مکہ کی طرف لوٹ کر گیا تو کہا میں نے دیکھا کہ ہدی کے اونٹوں کے قلاوے پٹائے ہوئے ہیں اور ان کا اشعار کیا ہوا ہے۔ پس میں یہ رائے نہیں دوں گا کہ انہیں بیت اللہ سے روکا جائے۔ ابن اسحاق کی روایت میں مزید یہ ہے کہ ”وہ بولے، بیٹھ جا، تو تیرا گنہگار ہے تو کیا جلنے؟ اور اس کی ایک روایت میں ہے کہ اس چٹخیں عَصَہ سے بھڑک اٹھا اور بولا: اے جماعت قریش! بخدا! ہم نے تم لوگوں سے اس مقصد کے لئے دوستی نہیں کی نہ معاہدہ کیا کہ جو شخص بیت اللہ کی تعظیم کے لئے آیا کرے، اُسے روک دیا جائے، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں جُلُوس کی جان ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس مقصد کے لئے آئے ہیں انہیں اس بات کی اجازت دینا ہوگی۔ ورنہ میں سارے احابیش کو ایک آدمی کی طرح یہاں سے ہٹا لے جاؤں گا، اب قریش (کھیلنے ہو کر) بولے جُلُوس، ذرا بٹھرو! یہاں تک کہ ہم۔ اپنی ذات کے لئے کوئی پسندیدہ صورت اختیار کر لیں۔ اور سیرت ابن ہشام میں ہے کہ ”ابن اسحاق نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدائش ابن امیہ الخزاعی کو بلایا اور۔۔۔ انہیں ثعلب نامی ایک اونٹ پر سوار کر کے قریش کے پاس بھیجا، تاکہ وہ اشراف قریش کو اطلاع کر دے کہ آپ کس مقصد کے لئے آئے ہیں قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ کو زخمی کر دیا، اور خدائش کو بھی قتل کرنا چاہا، مگر احابیش ان کے آٹے آٹے تو قریش نے اس کا راستہ چھوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا۔“ اور زرقانی کے لفظ یہ ہیں کہ، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیدریہ میں فروکش ہوئے تو آپ کو مناسب معلوم ہوا کہ قریش کے پاس ایک قاصد بھیجا جائے، جو ان کو اطلاع دے کہ آپ عمرہ کے لئے تشریف لائے ہیں، چنانچہ خزاعہ بن امیہ خزاعی کو اپنے اونٹ پر بھیجا، پس حکم بن ابی جبل نے اونٹ زخمی کر دیا، اور قریش نے خدائش کو قتل کرنا چاہا لیکن احابیش نے اس کی حفاظت کی، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آگئے، الخ۔“ پورا واقعہ آگے آتا ہے اور خدائش میں ہے کہ قریش نے چالیس بیچاس آدمی بھیجے اور انہیں حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کا چکر لگائیں تاکہ آنحضرت کے کسی صحابی کو کپڑا کر لاسکیں، صحابہ کرام نے ان سب کو کپڑا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا۔ یہاں اس امر پر تنبیہ ضروری ہے کہ صاحبِ خیس نے ان صاحب کا نام جن کو قریش کے پاس بھیجا گیا تھا ”جو اس“ ذکر کیا ہے۔ غالباً یہ ناقل کی تصحیف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سیوطی نے ”در منثور“ میں حق تعالیٰ کے ارشاد ہوائی گفت ایہ یحییٰ بن عکرم الکلبی کے ذیل میں متعدد روایات ان لوگوں کے بارے میں ذکر کی ہیں جن کو صحابہ کرامؓ نے حدیبیہ میں گرفتار کیا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا تھا، اور ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، من جملہ ان کے ایک حدیثِ مسلم، ابی داؤد اور ترمذی وغیرہ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں ”حدیبیہ کے دن اہل مکہ کے اسی آدمی مسلح ہو کر جبلِ تنعیم کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی طرف اترے۔ اُن کا مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اچانک حملہ کرنا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے پکڑنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ پکڑے گئے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو معاف کر دیا، پس یہ آیت نازل ہوئی، بعد ازاں صاحبِ خیس کہتے ہیں کہ ”جب جو اس واپس آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطابؓ کو بلوایا تاکہ انہیں مکہ بھیجا جائے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے قریش سے جان کا خطرہ ہے اور مکہ میں بنو مدی بن کعب کا ایک فرد بھی ایسا نہیں جو میری حفاظت کر سکے، اور قریش کو معلوم ہے کہ مجھے اُن سے کتنی عداوت ہے اور یہ کہ میں ان کے حق میں کتنا سخت ہوں، لہذا آپ کو میں ایک ایسا شخص بتاتا ہوں جو مکہ میں مجھ سے زیادہ معزز ہے اور وہ عثمان بن عفان ہیں۔“

حضرت عثمانؓ کا مکہ جانا : چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو بلوایا اور انہیں ابوسفیان اور اشرفِ قریش کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا کہ آپ جنگ کے لئے نہیں آئے بلکہ محض بیت اللہ کی زیارت اور اُس کی حرمت و تعظیم کے لئے آئے ہیں اور ابراہیمی میں یہ اضافہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا: انہیں بتاؤ کہ ہم جنگ کے لئے نہیں بلکہ عرفہ کے لئے آئے ہیں، اور ان کو اسلام کی دعوت دے دو اور آپ نے اُن سے یہ بھی فرمایا کہ مکہ میں جو مومن مرد اور عورتیں ہیں اُن کے پاس جائیں اور انہیں فتح کی خوشخبری دیں اور انہیں بتائیں کہ اللہ تعالیٰ مکہ میں اپنے پیکر کو نازل کر دے گا۔ یہاں تک کہ وہاں کسی کو اخفائے ایمان کی ضرورت نہ رہے گی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ مکہ گئے راستہ میں مقامِ بَدَج پر قریش کی ایک جماعت پران کا گزر ہوا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کہاں جا رہے ہیں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے کہ تمہیں اللہ کی طرف اور اسلام کی طرف دعوت دوں اور تمہیں آگاہ کروں کہ ہم لڑائی کے لئے نہیں بلکہ صرف عرفہ ادا کرنے آئے ہیں۔ وہ بولے: ہم نے تیری بات سُن لی، پس تم اپنے کام کے لئے جاؤ اور وہاں ابان بن سعید نے ان کا اٹھ کر استقبال کیا، ان کو خوش آمدید کہی اور اپنے گھوڑے پر زین رکھی اور حضرت عثمانؓ کو اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا۔ ۱ھ۔

اور ایٹس میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ کی طرف نکلے۔ جب یہ مکہ میں داخل ہوئے یا داخل ہوئے سے پہلے ہی ان کو ابان بن سعید بلا۔ اس نے آپؐ کو اپنے آگے سوار کیا، اور ان کو پناہ دی تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دیں۔ اور ابن اسحاق کے علاوہ دوسروں کی روایت میں ہے کہ ”ابان نے ان سے یہ بھی کہا کہ بلا خوف و خطر جلو بھرو۔ اور کسی کا خوف مت رکھو۔ بڑا سعید حرم میں سب سے معزز ہیں اور۔ حضرت عثمانؓ گئے میاں تک کہ مکہ میں داخل ہوئے ابرسیان اور دیگر اشرا ف قریش سے ملاقات کی اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا۔ پس انہوں نے آپؐ سے عقد و معاہدہ کیا اور جب آپؐ اپنے کام سے فارغ ہوئے اور واپسی کا ارادہ کیا تو قریش نے کہا کہ تم چاہو تو بیت اللہ کا طواف کر سکتے ہو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہیں کر لیتے میں کبھی طواف نہیں کر سکتا۔ اس سے قریش بھڑک گئے اور انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس روک لیا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی آمد میں تاخیر ہوئی تو مسلمانوں نے کہا کہ عثمانؓ خوش قسمت ہیں وہ مکہ چلے گئے اور اب بیت تنہا طواف کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں وہ تنہا طواف نہیں کر سکتے۔ اور الہدیٰ میں ہے کہ جب بیعت پوری ہو چکی تو حضرت عثمان واپس لوٹے، مسلمانوں نے ان سے کہا اے ابو عبد اللہ آپ نے تو بیت اللہ کے طواف سے خوب جی ٹھنڈا کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ آپ حضرات نے میرے حق میں بہت ہی بڑا لگان کیا، اس ذات کی قسم جس کے قبض میں میری جان ہے اگر میں وہاں بحال مجھ پر اتنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبی میں فروکش ہوتے تب بھی جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہ کر لیتے میں کبھی طواف نہ کرتا اور مجھے تو قریش نے بیت اللہ کے طواف کی دعوت دی تھی مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ یہ سن کر مسلمانوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری نسبت اللہ تعالیٰ کو زیادہ جانتے ہیں اور ہم سے زیادہ خوش گمان ہیں۔“

بیعت رضوان : اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ روک لئے گئے تو یہ افواہ گرم ہوئی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے، کہا جاتا ہے کہ شیطان نے مسلمانوں کے لشکر میں بلند آواز سے اعلان کیا کہ اہل مکہ نے عثمانؓ کو قتل کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو یہ خبر سُن کر بہت صدمہ ہوا، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اب ہم ان لوگوں سے دو دوا حقہ کئے بغیر نہیں جائیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو بیت اللہ کے لئے بلایا، پس ان سے بیعت لی کہ وہ قریش سے قتال کریں گے اور ان کے مقابلے میں میدان سے ہٹیں گے۔ ۵۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لیکر یامیری کے دخت کے نیچے تشریف فرما تھے۔

ذوقانی کی عبارت جو ابھی اوپر گزر چکی ہے اس کو ذکر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں، ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلایا، انہوں نے مذہب پیش کیا کہ اہل مکہ سے ان کی جان محفوظ نہیں اور آپ سے حضرت عثمانؓ کا ذکر کیا کہ وہ دہاں معزز ہیں، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلایا اور انہیں ایک گرامی نام دیا، اور انہیں حکم فرمایا کہ مکہ کے کمزور مرد عورتوں کو خوشخبری دیں کہ عنقریب اسلام کی فتح ہوا چاہتی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو سر بلند فرمائیں گے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عازم مکہ ہوئے۔ بلکہ نامی جگہ میں قریش سے ملاقات ہوئی۔ ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ مکہ نہیں جائیں گے مگر ابان بن سعید نے ان کو پناہ دی اور اپنے گھوڑے پر سوار کیا چنانچہ مکہ گئے، ابوسفیان اور رفساء قریش سے ملے اور ایک ایک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نام پڑھ کر سنایا، مگر انہوں نے قبول نہیں کیا بلکہ یہی اصرار کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سال مکہ نہیں آسکتے اور حضرت عثمانؓ کو طواف کی پیشکش کی۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے طواف سے انکار کا واقعہ مفصل ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں، ”اور جب صلح نامہ کی تحریر مکمل ہوئی اور لوگ اس کے نفاذ کے منتظر تھے، اچانک ایک فریق کے کسی آدمی نے دوسرے فریق کے آدمی پر تیر پھینک دیا، اس کے نتیجے میں تیروں اور پتھروں سے مقابلہ شروع ہو گیا، ہر فریق کے پاس دوسرے فریق کے لوگ تھے، ان کو دوک دیا گیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہل بن عمرو وغیرہ کو اور مشرکین نے حضرت عثمانؓ کو روک دیا۔۔۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی کہ عثمانؓ قتل کر دیئے گئے تو آپ نے لوگوں کو جمعیت رضوان کے لئے بلایا“

اور غنیمت میں ہے کہ سب سے پہلے بیت رضوان بنو اسد کے ایک شخص ابوسنان بن دہب نے کی۔ اور جب تھے مسلمان یہاں تھے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے بیعت نہ کی ہو۔ البتہ جب بن قیس انصاری جو بنو سلمہ کا ایک فرد تھا، اپنے اونٹ کے نیچے چھپ گیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ”وہ منظر گویا اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ وہ لوگوں سے چھپ کر اپنی ناقہ کی بغل سے چٹا ہوا ہے۔“ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کام میں گئے ہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دلہنے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، ”عثمانؓ کا ہاتھ ہے۔“ پھر اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا، ”یہ عثمانؓ کی جانب سے بیعت ہے۔“ اور حضرت عثمانؓ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک لوگوں کے اپنے ہاتھوں سے بدرجہا بہتر تھا۔“ اور ابوری میں بھی اسی طرح ہے۔ اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوع نے تین بار بیعت کی، لوگوں سے اول بھی دیکھا میں بھی اور آخر میں بھی۔“ آہ میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے دوسری بیعت کی ایک مرتبہ اپنے والد

ماجہ سے پہلے اور ایک مرتبہ اُن کے بعد، جیسا کہ امام بخاریؒ نے غزوہ حدیبیہ میں متعدد طریق سے روایت کیا ہے اور حاشیہ لائق میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔

زرقانی کہتے ہیں کہ اس بیعت کا نام بیعت رضوان اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی وجہ سے ہوا، لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ (راضی ہوا اللہ تعالیٰ) مومنوں کو جب بیعت کرے تھے آپؐ سے اس درخت کے نیچے) یہ درخت لیکر یا بجل کا تھا اور صحابہؓ نے سرت پر بیعت کی تھی، جیسا کہ شیخین وغیرہ کی روایت میں ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ میدان سے نہ بھاگنے کی بیعت کی تھی اور ان دونوں میں کچھ تضاد نہیں جیسا کہ معروف ہے اُو یہ سب روایات امام بخاریؒ نے غزوہ حدیبیہ میں ذکر کی ہیں۔

مکرز کی آمد : پس ان میں ایک شخص جو مکرز کہلاتا تھا، کھڑا ہوا (مکرز بکسریم و سکون کا ت وفتح راہ اس کے بعد) اور ابن مسعودؓ نے اس کے واسطے کہ اس کا نام بھی ذکر کیا یعنی مکرز بن حفص بن اخیف (ہمزہ جازہ جمع، یا تختانیہ اور فاکہ ساتھ) یہ بنو عامر بن لوی کا ایک ذرعتھا، زرقانی کہتے ہیں کہ الاصابہ میں ہے کہ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے اس کو صحابہؓ میں نہ کر کہا ہو، البتہ ابن جنان نے یوں کہہا ہے کہ اس کو شرف صحابیت حاصل ہے پس اس نے کہا مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دو، جب یہ مسلمانوں کے قریب آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ مکرز ہے اور یہ فاجر آدمی ہے اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے فاجر کی جگہ غار (بہ عہد) کا لفظ ہے حافظ کہتے ہیں کہ ”یہی زیادہ راجح ہے اور مجھے ہمیشہ تعجب رہا ہے کہ اس کو ناجز کیوں فرمایا جب کہ اس سے بظاہر کوئی فخر سرزد نہیں ہوا، بلکہ اس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو اس کے خلاف کی طرف مشعر ہیں، جیسا کہ ابو جندل کے قصہ میں اس کا کلام آگے آتا ہے۔ بیان تک کہ میں نے مغازی واقعہ میں غزوہ بدر کے بیان میں دیکھا کہ عقبہ بن ربیعہ نے قریش سے کہا اتم مکہ چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو جب کہ بنو کنانہ ہمارے پیچھے ہیں اور میں ان کی جانب سے اپنے اہل و عیال کے حق میں خطر ہے۔ راوی کہتا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی حفص بن اخیف یعنی مکرز کے باپ کا ایک بہت ہی خوبصورت لڑکا تھا اس کو بنو بکر کے کسی شخص نے اپنے خون کے بدلہ میں جو قریش کے ذرعتھا، قتل کر دیا، پس قریش نے اس سلسلے گفتگو کی اور صلح ہو گئی، بعد ازاں مکرز نے بنو بکر کے سردار عامر بن زید پر اچانک حملہ کیا اور اسے قتل کر دیا، اس سے بنو کنانہ بھڑک گئے اور اسی اثناء میں واقعہ بدر پیش آیا اور مکرز بہ عہد ہی میں بنام تھا، اور واقعہ میں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس نے حدیبیہ میں مسلمانوں پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا اور پچاس آدمی ساتھ لے کر نکلا، مگر محمد بن مسلمہؓ نے جو پہرے پر تھے ان کو کھڑا کیا اور مکرز ان کی پھوٹ کر بھاگ بچنے میں کامیاب ہو گیا۔

غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسی طرف واقعہ کے مشیر ہے۔ "اھ پس وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے
چیت کئے لگا۔ ابن اسحاق نے یہ اضافہ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی دی جواب دیا جو بدل کر دے
چکے تھے۔

سہیل کی آمد : اس کی گفتگو کے دوران امپانک سہیل بن عمرو القرشی الحامری آگیا۔ ان کا لقب خطیب
قریش ہے، رہائش پہلے مکہ میں تھی پھر مدینہ میں ہوئی۔ فتح مکہ کے سال اسلام لائے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان کا اسلام
بہت ہی محمود تھا اور ابن شاہین نے روایت کیا ہے کہ سہیل کہتے ہیں، اللہ کی قسم میں نے مشرکین کی ہمارہی میں شجاعت
اور بہادری کے جتنے معرکے انجام دیئے اب مسلمانوں کی ہمارہی میں ایک ایک کا قرض ادا کر دیں گا۔ اور مشرکین کی معیت
میں میں نے جتنا مال خرچ کیا اسی قدر مسلمانوں پر بھی خرچ کر دیں گا۔ اکثر علماء کے نزدیک شاعر کی طاعون عوام میں
نکاح شام میں اُن کا انتقال ہوا اور بعض کہتے ہیں کہ جب یربرک میں شہید ہوئے۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں
ہے کہ "قریش نے سہیل کو بلایا اور کہا کہ ان صاحب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤ اور ان سے صلح
کر لو۔ پس جب سہیل آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے لئے تمہارا کچھ کام سہل ہو گیا ہے۔ شیخ لایع میں
فرماتے ہیں "تمہارا کچھ کام سہل ہو گیا۔" کیونکہ آپ نے اس کے دوبارہ آنے سے اندازہ کر لیا تھا کہ قریش طح کی
جانب مائل ہیں، اور یہ نیک فال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نام سے اخذ کی تھی۔ اور اس کے حاشیہ
میں مطلقاً ان سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیک فال کو پسند فرماتے تھے۔ اور "مِنْ" تبغیض کے
ساتھ "مِنْ" امور کمرہ (تمہارا کچھ کام) فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ اس قصہ میں حاصل ہونے والی
سہولت کچھ زیادہ عظیم نہیں ہے اور بعض نے کہا ہے کہ غالباً یہ نکتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل
کی تصفیہ سے اخذ کیا۔ کیوں کہ اس کی تصفیہ کا تقاضہ یہ تھا کہ یہ سہولت زیادہ نہ ہو۔ اھ زندگانی کہتے ہیں۔ کہ
ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو گھٹنے ٹیک کر دوڑا تو ہو بیٹھا
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چار زانو تشریف فرما تھے اور بخا دیج بشر اور سلمہ بن اسلم اپنی لباس میں سر سے
پاؤں تک غرق آپ کے سر پر کھڑے تھے۔ اور مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد حلقہ کے بیٹھے تھے۔ اور
دولوں کے درمیان بات چلی۔ اور سہیل نے دیر تک بات کی اور سوال و جواب ہوتا رہا۔ اور غمخس میں ہے کہ
جب سہیل آپ کے پاس پہنچا تو بلایا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریش آپ سے صلح کرنا چاہتے ہیں مگر شرط یہ ہے
کہ آپ کو عمر آئندہ سال کرنا ہوگا۔ اھ اور حضرت عجلانہ نے اس سے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

اپنی آواز نہ پست رکھ۔“ بالآخر دونوں کے درمیان اس شرط پر صلح طے ہوئی کہ دونوں فریقوں کے درمیان دس سال تک لڑائی موقوف رہے گی۔ جیسا کہ ابن اسحاق کی روایت میں بحدود اسی پلین سعد نے جزم کیا ہے، اور ابو داؤد نے حضرت ابن عمرؓ سے اور حاکم نے حضرت علیؓ سے اس کو روایت کیا ہے اور یہی قابل اعتماد ہے۔ اس کے عکس معاذی ابن عائد میں ابن عباسؓ وغیرہ سے مروی ہے کہ دو سال کی مدت طے ہوئی تھی۔ ابن عقبہ کی روایت بھی یہی ہے۔ حافظؒ کہتے ہیں: ”دونوں کے درمیان تطبیق یہ یوں ہوگی کہ دس سال تو اصل مدت تھی جو صلح میں طے ہوئی تھی، مگر دو سال کی مدت میں صلح کا قصہ تمام ہوا۔ کیوں کہ قریش نے اس کی خلاف ورزی کی، جیسا کہ غزوہ فتح میں آیا ہے۔“ یہ تطبیق زمعی اور ابن ہمام نے یہی بتائی ہے نقل کی ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ بہت اچھی توجیہ ہے۔ جس سے تعارض اٹھ جاتا ہے۔ اس لئے اس کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔ اور حافظؒ کہتے ہیں کہ کابل ابن عدی، مسند رک حاکم اور معجم وسط طبرانی میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مدت صلح چار سال تھی یہ اول تو ضعیف ہے پھر صحیح روایت کے خلاف ہونے کی وجہ سے منکر بھی ہے۔ زرقانی میں حافظؒ کی پیروی کرتے ہوئے اسی طرح ہے۔

غزوہ فتح کا سبب : میں کہتا ہوں کہ حافظؒ کے قول جیسا کہ غزوہ فتح میں آتا ہے۔ کا حاصل یہ ہے کہ غزوہ فتح قریش کے نقض عہد کی وجہ سے ہوا تھا جیسا کہ کتب سیر میں مفصل مذکور ہے اور اس کا خلاصہ وہ ہے، جو مجمع البحار میں مذکور ہے کہ غزوہ فتح کا سبب یہ ہوا تھا کہ بنو خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے۔ اُن کے مقابلہ میں قریش نے بنو نفاثہ کے رؤساء کی مدد کی، اور بنو نفاثہ نے بنو خزاعہ پر شب خون مارا، بنو خزاعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنو کعب کی مدد نہ کروں تو کس کی کروں گا؟ اور یہ شعبان کا قصہ ہے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خفیہ تیاری کی، اور رمضان شہر میں غزوہ فتح کے لئے نکلے۔ الخ، اھ مختصر۔ اور خمس میں ہے کہ قریش میں سے صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمرو، حویطب اور کرز نے اپنے غلاموں سمیت، ہیت بدل کر خزاعہ کے مقابلے میں بنو کعب کی اس رات کو مدد کی، اور رات کو جب کہ وہ غفلت میں پڑے سو رہے تھے ان پر اچانک حملہ کر دیا اور ان کے بیس افراد کو قتل کر دیا، بعد میں قریش کو اپنے کئے پر پشیمانی ہوئی اور انہیں محسوس ہوا کہ جو صلح ان کے اور، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان طے ہوئی تھی اس کو توڑ ڈالا ہے۔ ادھر عمرو بن سالم خزاعی چالیس سروروں کی ہیت میں، طلبہ مد کے لئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے در دولت پر مدینہ حاضر ہوا، یہ تھا وہ واقعہ جو

فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔“

کتنی مدت کے لئے کافروں سے صلح کرنا جائز ہے : حافظؒ کہتے ہیں کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ مشرکین سے کتنی مدت تک کے لئے صلح کا معاہدہ صحیح ہے؟ چنانچہ بعض فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مطابق دس سال سے زائد کی صلح نہ ہونی چاہیے۔ یہ امام شافعیؒ کا قول ہے اور بعض کہتے ہیں کہ دس سال سے زیادہ بھی صحیح ہے بعض نے زیادہ سے زیادہ چار سال، بعض نے تین سال، اور بعض نے دو سال مدتِ صلح تجویز کی ہے، مگر پہلا قول راجح ہے۔ ائمہ اور نو دینی کہتے ہیں: ”کفار سے صلح کرنا جب کہ مسلمانوں کی مصلحت اس کی مقتضی ہو تو بہ ضرورت بالاتفاق جائز ہے اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ صلح دس سال سے زیادہ کی نہ ہو لہٰذا طحطاویؒ نے امام کو غلبہ ہوا اور اگر امام کو غلبہ ہو تو چار بیسے سے زیادہ کی صلح نہ کرے۔ اور ایک قول میں ایک سال سے کم جائز ہے، اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے کوئی حد متعین نہیں، بلکہ امام کی رائے کے موافق قلیل و کثیر مدت کے لئے صلح جائز ہے۔“ ائمہ

اور ابی نے بھی امام مالکؒ کا مسلک اسی طرح نقل کیا ہے اور ابن قیمؒ الہندیؒ میں کہتے ہیں: ”اس قصہ میں یعنی صلح خیبر کے قصے میں اس امر کی دلیل ہے کہ صلح کا معاہدہ مطلقاً صحیح ہے اور اس کے لئے کوئی مدت مخصوص متعین نہیں ہے۔ بلکہ جتنی مدت کے لئے امام چاہے صلح کر سکتا ہے۔ اس قصہ کے بعد کوئی حکم ایسا نہیں آیا جو اس حکم کے لئے ناخ ہو اس لئے صحیح یہ ہے کہ صلح جائز اور صحیح ہے اور زنی کی روایت کے مطابق امام شافعیؒ نے نیز دوسرے ائمہ نے اس کی تصریح کی ہے۔“ اور موفقؒ کہتے ہیں: ”بغیر تعین مدت کے صلح جائز نہیں کہ اس کا نتیجہ مطلقاً ترک جہاد ہوگا۔“ ایک اور جگہ کہتے ہیں: ”عقد صلح صرف معلوم اور معین مدت تک کے لئے صحیح ہے اور جو اس دلیل کے جرح ہم نے ذکر کی ہے۔ اور قاضیؒ کہتے ہیں کہ امام احمدؒ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ دس سال سے زیادہ کی صلح جائز نہیں۔ یہی ابو بکرؓ کا مختار اور یہی شافعیؒ کا مذہب ہے۔ کیوں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد: اقلوا المشرکین حیث وجدتموہم عام ہے۔ جس سے دس سال کی مدت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قریش سے دس سالہ مصالحت کی بنا پر مخصوص ہے۔ اس سے زائد اپنے مقضائے عموم پر رہے گا۔ اور ابو الخطابؒ کہتے ہیں کہ امام احمدؒ کے کلام کا ظاہر ہے کہ امام کی صراحت کے مطابق دس سال سے زیادہ کی صلح بھی جائز ہے اور امام ابو حنیفہؒ کا یہی قول ہے۔ کیوں کہ عقد اجاہہ کی طرح جب یہ عقد دس سال کے لئے جائز ہے تو اس سے زیادہ کے لئے بھی جائز ہی ہوگا۔ اور عام سے وہ سال قلت کی تخصیص ایک علت پر مبنی ہے جو شریعت

سے زیادہ میں بھی بائی جاسکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مصلحت کبھی زیادہ مدت کے لئے صلح کو مقضیٰ ہوا کرتی ہے۔“ اھ

اور ہمایہ میں ہے: ”جب امام کی رائے ہو کہ اہل عرب سے یا ان کے کسی فرقے سے صلح کر لے اور اس میں مسلمانوں کی مصلحت ہو تو اس کا مضائقہ نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وان حذر المسلم ما حجب لہما وتکرل علی اللہ“ (وہ اگر صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کی طرف مائل ہو جائیے اور اللہ تعالیٰ پر عبور و سہ کیجیے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سال اہل مکہ سے مصالحت کی تھی کہ ان کے اور آپ کے درمیان دس سال تک جنگ موقوف رہے گی۔ اور اس لئے کہ مصالحت بھی معنی جہاد کے حکم میں ہے۔ جب کہ وہ مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو۔ کیونکہ مقصود کہ وہ دفع شر ہے اس سے بھی حاصل ہو جاتا ہے اور حکم صلح صرف اسی مدت تک محدود نہیں جو روایات میں وارد ہے۔ کیوں کہ ملت اس سے زائد کی طرف بھی مستعدی ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ وہ مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو تو جائز نہیں کیوں کہ یہ صوریہ اور مضائقہ جہاد ہے۔“ اھ۔

صلح نامہ کی تحریر کا آغاز : پس سہیل نے کہا لائیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور ہمارے درمیان تحریر لکھ دوں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب کو بلایا۔ یہ حضرت علی ابن ابی طالب کم اللہ وجہہ فتنی، جیسا کہ امام بخاریؒ نے کتاب الفتح میں برادر بن عازب رضی اللہ عنہ سے، اسی طرح عمرو بن شہب نے سلم بن اکرع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس کے برعکس عمرو بن شہب نے ایک روایت سہیل بن عمرو سے روایت کی ہے کہ وہ تحریر ہمارے پاس موجود ہے جس کو محمد بن سلمہ نے تحریر کیا تھا۔ (اس روایت سے مفہوم ہوتا ہے کہ صلح نامہ حضرت علیؑ نے نہیں بلکہ محمد بن سلمہ نے لکھا تھا) ان دونوں میں تطبیق یوں ہوگی کہ اصل صلح نامہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تحریر کیا تھا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے اور اس کی ایک نقل محمد بن سلمہ نے سہیل کے لئے لی تھی اور عمرو بن شہب کی ایک روایت میں کاتب کا نام ہشام بن مکرمہ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ وہم اور مرتبہ غلط ہے۔ کیوں کہ جو صحیفہ ہشام نے لکھا تھا، یہ وہ تحریر تھی جو قریش نے متفقہ طور پر بنو ہاشم کو شعیب ابنی طالب میں محصور کرتے وقت لکھی تھی۔ میں نے اس پر تنبیہ کی ضرورت اس بنا پر محسوس کی تاکہ بعض ناواقفوں کو یہ دھوکا نہ ہو جائے کہ قصہ حدیبیہ کے کاتب میں اختلاف ہے۔ یہ بات حافظؒ نے لکھی ہے۔ زرقانی میں اسی طرح ہے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم، پس سہیل نے اور اس کے رفقار نے

جیسا کہ ختم میں ہے کہا بخدا! میں نہیں جانتا کہ رحمن کیا ہوتا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ سہیل نے کہا، میں صاحب ہمارے سوا کسی رحمن کو نہیں جانتا کہ رحمن کیا ہوتا ہے۔ لیکن باسمک اللہم لکھئے جیسا کہ آپ ابتدا اسلام میں لکھا کرتے تھے۔ جاہلیت میں اس کے لکھنے کا دستور تھا (اور آیت نحل کے نزول تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی غالباً یہی معمول تھا) مگر جب آیت نحل نازل ہوئی تو آپ بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنے لگے۔ اس لئے ان لوگوں پر جاہلی نخوت سوار ہوئی۔ اور

انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ سہیل نے کہا، ہم نہیں جانتے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کیا چیز ہے، لیکن آپ وہ لفظ لکھتے جس کو ہم جانتے پہچانتے ہیں یعنی باسمک اللہم۔ اور حاکم کے الفاظ بروایت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ یہ ہیں، ”پس سہیل نے اس کا (کاتب کا) ہاتھ پکڑ لیا اور کہا باسمک اللہم لکھئے جس کو ہم جانتے ہیں۔ مسلمانوں نے کہا، ”اللہ کی قسم! ہم بسم اللہ الرحمن الرحیم ہی لکھیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! باسمک اللہم ہی لکھو۔ چنانچہ یہی لکھا گیا جیسا کہ حاکم کی روایت ہے۔ بظاہر ان حضرات نے اپنی قسم کا کھار ادا نہیں کیا، کیوں کہ ان کی نیت یہ تھی کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قطعی حکم نہیں ہوتا ہم یہی لکھیں گے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے فرمایا: لکھو! یہ وہ تحریر ہے۔ اشارہ ذہن میں مستحضر مضمون کی طرف ہے جس پر مصالحت کی قاضی، قاضی کے وزن پر۔ قضیت الشی کے معنی ہیں کسی چیز کا فیصلہ کرنا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور مستدرک حاکم میں عبد اللہ بن مغفل کی روایت ہے، ”پس کاتب نے لکھا کہ یہ وہ تحریر ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل مکہ سے مصالحت ہوئی۔“ اس روایت سے معلوم ہوا کہ فیصلہ سے مراد مصالحت ہے اور امام بخاری نے اس پر ترجمہ الباب قائم کیا ہے، کیف یکتب هذا ما صلح فلان بن فلان وان لم ینسب الی قبیلۃ او نسب۔ یعنی اس امر کا بیان کر کیے لکھا جائے کہ یہ وہ چیز ہے جس پر مصالحت کی فلان بن فلان نے۔ اگرچہ اس کو اس کے قبیلہ کی طرف منسوب کرے نہ اس کا نسب ذکر کرے۔“ حضرت شیخ لا مع میں اس ترجمہ کی شرح میں فرماتے ہیں: ”مطلب یہ کہ نسب کا ذکر تعین اور رفع ابہام کے لئے ہوتا ہے، اور اگر یہ تعین اس کے بغیر ہی حاصل ہو نسبت ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ حافظ کہتے ہیں: ”یعنی جب وہ اس کے بغیر مشہور ہو کہ کسی طرح کے التباس کا اندیشہ نہ ہو تو تحقیق میں صرف مشہور نام کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے۔ اس کے باپ دادا کے ذکر کرنا، اسی طرح نسبت اور شہر کا ذکر کرنا ضروری نہیں۔ اور فقہاء کا یہ کہنا کہ تحقیق میں اس کا نام اس کے باپ دادا کے کا نام اور نسبت وغیرہ کا ذکر کیا

جائے، یہ اس صورت میں ہے کہ القباس کا اندیشہ ہو، اور اگر اندیشہ نہ ہو تو صرف استحباب کا درجہ رکھتے ہیں، انج
پس سبیل نے کہا: بخدا! اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول سمجھتے تو آپ کو بیت اللہ سے نہ روکتے، نہ آپ سے جنگ و قتال
کی نوبت آتی اور مغازی میں ہے کہ اس نے کہا کہ: ہم آپ کو اس حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں، اگر میں آپ
کا رسول ہوتا تو آپ کو بیت اللہ سے نہ روکتے اور نہ لڑائی کرتے بلکہ آپ سے بیعت کر لیتے۔“

اور مغازی ابو الاسود میں ہے کہ سبیل نے کہا: ”اگر ہم آپ کو رسول اللہ تسلیم کرتے ہوئے بھی بیت اللہ
سے روکیں پھر تو ہم نے آپ پر بڑا ظلم کیا۔“ اور غیس میں شواہد البتہ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے جب صلح نامہ میں محمد رسول اللہ کی بجائے محمد بن عبد اللہ لکھوایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر
فرمایا: ”اے علی تجھے بھی ایک دن اسی قسم کا واقعہ پیش آئے گا۔“ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ اس
واقعہ کی طرف ہے کہ جب جنگ صفین کے بعد حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان مصالحت
ہوئی اور کاتب نے صلح نامہ میں یہ عبارت لکھی ”یہ وہ تحریر ہے جس پر امیر المؤمنین حضرت علی نے مصالحت کی“
تو حضرت معاویہ نے فرمایا: ”امیر المؤمنین نہ لکھیے، اگر میں آپ کو امیر المؤمنین تسلیم کرتا تو آپ سے جنگ کیوں
کرتا؟ اس کے بجائے علی ابن ابی طالب لکھیے۔“ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سناتو انہیں حدیث
کے دن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یاد آیا اور فرمایا کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا، علی ابن ابی
طالب ہی لکھو۔“ زرقانی کہتے ہیں کہ نسائی نے بروایت علیؑ یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ: ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ تجھے بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آئے گا اور تجھے مجبور کرنا پڑے گا۔“ یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ تھا
جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکیم کے دن پیش آیا کہ جب کاتب نے یہ تحریر کیا تھا: ”یہ وہ معاہدہ ہے جس پر...“

امیر المؤمنین حضرت علیؑ نے مصالحت کی۔“ تو حضرت معاویہؓ نے پیغام بھیجا کہ اگر میں آپ کو امیر المؤمنین
جانتا تو حکیم کی بات کیوں کرتا؟ اس لفظ کو مٹا دیجئے اور اس کی جگہ علی ابن ابی طالب، کا لفظ لکھیے۔ یہ سن کر
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ اکبر کہا، اور فرمایا ٹھیک وہی بات ہوئی، جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
پیش گوئی فرمائی تھی، بس اس لفظ کو مٹا دو۔“ بلکہ اس کی جگہ محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ لکھیے۔ اور

ایک روایت میں ہے کہ اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھیے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی
قسم! میں یقیناً اللہ کا رسول ہوں، اگرچہ تم مجھے جھٹلاتے رہو۔ اس کی جزا عذوب ہے یعنی تب بھی میری
رسالت کو مضر نہیں۔ پھر حضرت علیؑ سے فرمایا: اس لفظ کو مٹا دو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں

تو اس کو ٹھانہیں سکتا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ نہیں! اللہ کی قسم! میں آپؐ کے نام) کو کبھی نہیں بٹا سکتا۔ علماء فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ طرز عمل ادب مستحب کے باب سے ہے کہ کسی بزرگ شخصیت کی جانب سے کسی بات کا حکم ہو اور مامور یہ سمجھے کہ امر قطعی نہیں، اور اس میں بظاہر خلاف ادب امر کا ارتکاب ہو، تو مامور کو توقف کرنا چاہیئے، جب تک معاملہ کی صحیح نوعیت سامنے نہیں آجاتی۔ زرقانی میں اسی طرح ہے۔ اور اوچتو میں ہے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی امامت کے واقعہ میں کہ اس پر اشکال ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اپنی نمازیں بدستور مشغول رہے۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تو وہ چھپے ہٹ گئے۔ اس کا سب سے عمدہ جواب یہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ جو امر غیر واجب ہو وہاں تعمیل حکم کے بجائے رعایت ادب بہتر ہے۔ اور حضرت عبدالرحمنؓ نے اس کے برعکس امتثال امر کو ترجیح دی۔“ اھ۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خود ڈٹایا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: مجھے اس لفظ کی جگہ دکھاؤ۔ چنانچہ آپؐ کو وہ لفظ دکھایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ڈٹا دیا۔ امام زہری فرماتے ہیں: ان دونوں باتوں میں سہیل کی ضد کو تسلیم کر لینا اس بنا پر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ وہ مجھ سے جس بات کا بھی مطالبہ کریں گے جس کے ذریعہ اللہ کی حرمت کی تعظیم مقصود ہو، میں ان کا مطالبہ ضرور پورا کر دوں گا۔“ پس اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عبد اللہ کا لفظ لکھا اور بخاری کی کتاب المغازی کی روایت میں ہے کہ: پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیفہ خود لیا، اور آپؐ کتابت نہیں جانتے تھے۔ پس آپؐ نے تحریر فرمایا: ”یہ وہ تحریر ہے جس پر محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصالحت کی۔“ اور شیخ قدس سرہ لایع میں فرماتے ہیں: ”راوی کا قول، پس آپؐ نے تحریر فرمایا۔“ صحیح ترین یہ ہے کہ آپؐ کی طرف نسبت کتابت مجازی ہے اور اس کو حقیقت پر محمول کر کے معجزہ قرار دینا مناسب نہیں کیوں کہ اگر آپؐ نے خود اپنے دست مبارک سے لکھا ہوتا تو کفار کو یہ کہنے کا موقع تھا کہ آپؐ کو لکھنا آتا ہے اور اس سے ان کی یہ بگانی اور پختہ ہو جاتی کہ آپؐ۔ معاذ اللہ۔ شاعر ادکاتب ہیں، کتابیں پڑھ پڑھ کر بتاتے ہیں اور یہ خلاف مقصود ہے۔“ اھ اور لایع کے حاشیہ میں ان حضرات کے نام ذکر میں جو ان دونوں اقوال کے قائل ہیں یعنی یہ معجزہ تھا یا مجاز پر محمول تھا، اور فریقین کے دلائل بھی خوب تفصیل سے ذکر کئے ہیں، جس کا جی چاہے وہاں دیکھ لے۔ پس اس کو یعنی سہیل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شرط یہ ہوگی کہ تم ہمارے لئے بیت اللہ جانے کا راستہ خالی کر دو تاکہ ہم اس کا طواف کر سکیں۔ پس سہیل نے کہا اللہ کی قسم اگرگز

نہیں، ہم آپ کو سیت اشد جانے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتے ورنہ عرب باتیں کیا کریں گے۔ عینی کہتے ہیں کہ اس کا قول ”عرب باتیں کریں گے“ جملہ متعلقہ ہے اور ”ہرگز نہیں“ کے تحت میں داخل نہیں ”ہرگز نہیں“ کا مدخل محدود ہے، یعنی ہم آپ کو سیت اشد جانے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے اور بعض لوگوں نے گمان کیا ہے کہ ”ہرگز نہیں“ کا لفظ بعد کے فقرے (عرب باتیں کیا کریں گے) پر داخل ہے اور مطلب یہ ہے کہ عرب ہرگز باتیں نہیں کریں گے۔ اور نہ ہم انہیں موقع دینا چاہتے ہیں، اور یلن فاسد ہے۔“ اھ

میں کہتا ہوں کہ جس احتمال کو عینیؒ نے رد کیا ہے۔ وہ بھی محمل ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے کتاب الاغیاء ”باب یسینی عنہ من دعوی الجاہلیۃ“ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک مہاجر کے انصاری کو مارنے کا قصہ ذکر کیا ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ کا یہ سوال مذکور ہے کہ آپ اس کو قتل کیوں نہیں کر دیتے؟ اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یحدث الناس ان یقتل صحابہ (یعنی نہیں؛ مبادا لوگ یہ نہ کہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو قتل کرتے ہیں) شیخ لایع میں فرماتے ہیں: ”احتمال ہے کہ دونوں کو ایک ہی کلمہ قرار دیا جائے پس محدث کی نفی ہوگی“ اور اس کے حاشیہ میں کہ ”حافظ کہتے ہیں کہ قتادہ کی مرسل روایت میں یہ الفاظ ہیں ”لا والله لا یحدث الناس“ اس سے شیخؒ کے کلام کی تائید ہوتی ہے۔“ اھ غفرلہ اور امام بخاریؒ نے ”کتاب الایمان والندوۃ“ کے آغاز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے ”لیس لخی الکفارة“ (میں کفایت کرتا ہے کفار) اور حاشیہ لایع میں اس پر تفصیل سے لکھا ہے کہ یہ ایک جملہ ہے کہ دو جملے ہیں؛ عام شامین نے اس کو ایک جملہ قرار دیا ہے اور میں نے اس کو ترجیح دی ہے کہ دو جملے ہیں اور میں نے اس کے متعدد نظائر ذکر کئے ہیں۔ مغلان کے مسجد میں گم شدہ چیز کے تلاش کرنے والے کے بارے میں فرمایا: لا ردھا اللہ ملک (یہاں تلاش نہ کرو واپس کر دے اللہ تعالیٰ تیری چیز) وغیرہ۔ کہ ہم سے زبردستی یہ بات منوائی گئی ہے۔ اور ابن اسحقؒ کی روایت میں ہے کہ ”آپ ہم پر زبرد قوت داخل ہو گئے“ لیکن یہ یعنی آپ کے عمر کا ارادہ آئندہ سال پورا ہوگا۔ چنانچہ آپ نے یہی لکھوا دیا۔

صلح نامہ کی ایک اہم شرط : پس سہیل نے کہا اور اس شرط پر۔ یہ پہلی شرط پر حطفت ہے کہ آپ کے پاس ہمارا جو آدمی بھی آئے، خواہ وہ آپ کے دین پر ہو، آپ اس کو چارے پاس واپس کر دیں گے۔ بخاری کی کتاب الشروط میں قصہ حدیبیہ کی ایک طویل حدیث کے ضمن میں اسی طرح ہے۔ زرقانیؒ کہتے ہیں: ”بخاری ہی کی ایک روایت میں کتاب الشروط کے شروع میں یہ الفاظ ہیں: ”اور نہیں آئے گا، ہم میں سے کوئی فرد“ الخ۔ یہ

الفاظ مردوں کو بھی شامل ہیں اور عورتوں کو بھی۔ اس لئے عورتیں بھی اس معاہدہ صلیح میں داخل تھیں۔ مگر بعد ازاں ان کے حق میں معاہدہ منسوخ ہو گیا، یا (یہ کہا جائے کہ) عورتیں بطریق عموم ہی اس میں داخل تھیں، پھر اس عموم میں تخصیص کر دی گئی اور ابن اسحاق کی روایت میں مزید یہ ہے کہ ”اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبتدین میں سے جو شخص قریش کے پاس آئے، وہ اسے واپس نہیں کریں گے“ اور مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس شرط پر مصالحت کی تھی کہ تم میں سے جو شخص ہمارے یہاں آئے ہم اُسے واپس نہیں کریں گے اور ہمارا آدمی جو تمہارے پاس آئے ہمیں واپس کرنا ہوگا۔“

پس صحابہؓ نے (ازراہِ حُجرت و تَعَجُّب) عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم یہ (صریح جابہ از رائدہ شرط بھی) لکھ لیں؟ فرمایا: ہاں! کیوں کہ ہمارا جو آدمی ان کے یہاں جائے (ہمیں اس کی ضرورت کیا ہے جس) اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ دکھے۔ اور جو شخص ان کے یہاں سے ہمارے پاس آئے (ہم معاہدہ کے مطابق اس کو واپس کر دیں گے مگر) عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے لئے کثرتِ نسل اور نکلنے کی صورت پیدا فرمادیں گے۔ اھ

عورتیں اس شرط میں داخل نہیں تھیں : اور یہاں دو فقہی بحثیں ہیں، جن پر لامعہ اہل اس کے حاشیہ میں مفصل کلام کیا گیا ہے، اول یہ کہ کیا حدیثیں بھی اس شرط میں داخل تھیں اور پھر نزولِ آیت سے اس سے مستثنیٰ ہونے یا یہ کہ وہ شروع ہی سے معاہدہ میں داخل نہیں تھیں؟ اس ناکارہ کے نزدیک اُدْجَر یہ ہے۔ جیسا کہ لامعہ کے حاشیہ میں یہ دونوں قول، جو زرقانی کے کلام میں ابھی اور پر گزرتے ہیں، مفصل نقل کرنے کے بعد ذکر کیا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں عورتوں کو اس سے مستثنیٰ کرنا منظور تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ صورت پیدا کر دی کہ معاہدہ ان الفاظ میں ہوا ”ہمارا جو آدمی آپ کے پاس آئے“ جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے مگر انہوں نے اس سے عموم سمجھا، چونکہ عورتیں مردوں کے تابع ہوا کرتی ہیں اس لئے بعض راویوں نے اس کو عموم کے الفاظ سے نقل کر دیا پھر جب عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے آیت امتحانِ نازل فرما کر اس پر تنبیہ کر دی کہ معاہدہ صرف مردوں سے مخصوص ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ معاہدہ کا اصل لفظ ان تین لفظوں میں سے ایک ہوگا، یعنی کوئی مُرد، کوئی مُردہ، کوئی مُرد، جو شخص (رجل، احد، من) اور رجل کا لفظ زیادہ قرین قیاس ہے کیوں کہ مشرکین کو اس میں منازعت کا حق نہیں تھا اور اس سے عموم سمجھنا ان کے فہم کا قصور تھا اور اللہ عزوجل عالم الغیب تھے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا لفظ اللہام فرمایا جو مقصود سے زیادہ قریب تھا۔

کیا صلح میں ایسی شرط رکھنا اب بھی جائز ہے؟ بحث دوم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس شرط پر صلح کا معاہدہ جائز ہے یا نہیں کہ مسلمانوں کو کافروں کی طرف واپس کر دیا جائے گا؟ شیخ قدس سرہ لائٹ میں فرماتے ہیں: ”یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے جائز نہیں کیوں کہ جس شخص کو واپس کیا جائے گا اس کی حالت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا (کہ وہ اپنے اسلام پر قائم رہ سکے گا یا نہیں) اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کا ایسی صلح کرنا خلاف متفقہی شرع ہے“ اھ اور لامع کے حاشیہ میں ہے کہ ”میں کہتے ہیں:“ اس شرط پر مشرکوں سے صلح کرنے میں ملکہ کا اختلاف ہے، چنانچہ ایک قوم کا قول یہ ہے کہ یہ جائز نہیں۔ اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے منسوخ ہے کہ ”میں ہر اس مسلمان سے بڑی ہوں جو کسی کافر کے ساتھ دارالحرب میں قیام پذیر ہو“ اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ دارالحرب سے ہجرت کرنا نامردوں اور عورتوں پر فرض ہے، یہ کہ فیہین اور امام مالکؒ کا قول ہے اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم مردوں کے حق میں منسوخ نہیں، مگر اس قسم کے معاہدہ کا حق صرف خلیفہ کو ہے، یا ایسے شخص کو خلیفہ کی طرف سے مامور ہو، خلیفہ کے علاوہ اگر کسی شخص نے ایسا معاہدہ کیا تو وہ مردود ہوگا اور توضیح میں ہے کہ امام شافعیؒ کے اس قول سے کہ ”یہ مردوں کے حق میں منسوخ نہیں“ مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عورتوں کے حق میں یہ حکم منسوخ ہے۔“ میں کہتا ہوں کہ مالکیہ سے مختلف روایات منقول ہیں جیسا کہ حاشیہ لامع میں مذکور اور دوستی سے نقل کیا ہے اور مدد دیر نے امام مالکؒ کا مذہب امام شافعیؒ کے موافق نقل کیا ہے اور مسلمانوں کو واپس کرنے کی شرط خاں بلہ کے نزدیک صحیح ہے، جیسا کہ حاشیہ لامع میں المغنی سے نقل کیا ہے اور شیخ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ ”عورتوں کو واپس کرنے کی شرط جائز نہیں اور نبی قرآن اس عقد (صلح حدیبیہ) میں صرف ہی چیز موضع فتح ہے، اس کے ماسوا میں فتح کے دعویٰ کی کوئی سبیل نہیں کیوں کہ کوئی چیز موجب فتح نہیں“ مسلمانوں نے کہا سبحان اللہ! اہل کو مشرکین کی طرف تگوا لیں کر دیا جائے جب کہ وہ مسلمان ہو کر آیا ہے؟ حافظ کہتے ہیں کہ یہ بات غالباً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہی ہوگی، جیسا کہ آگے آنا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس بات کے کہنے والوں میں اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ اور اسعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے نام بھی ذکر کئے ہیں اور سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ بھی نے اس کا انکار کیا تھا جیسا کہ بخاری شریف کی کتاب المغازی میں ہے۔

ابو جندل کا قصہ : اور ابھی وہ اسی حالت میں تھے اور ابن اسحق کی روایت میں ہے کہ صلح نامہ ابھی ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ ابو جندل بردن جعفر بن سہیل بن سہراہی بڑوں میں لڑا کھڑا تھوڑے ہوئے آئے (ابو جندل)

(بسیغہ مضارح از نصر) یعنی بطیروں کے سبب آہستہ آہستہ چلے آ رہے تھے ان کا نام ماضی تھا، جس کو انہوں نے ترک کر دیا تھا، یہ جب اسلام لائے تو کہ میں مجوس کو دینے گئے، انہیں ہجرت سے روک دیا گیا اور اسلام کی خاطر سزاؤں دی گئیں اور یہ اسلحہ سے نکل کر آئے تھے یہاں تک کہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے درمیان لا ڈالا ابن اسحاق کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ سہیل، ابوجندل کی طرف اٹھا، اس کے چہرے پر پٹا بچھا، اس کا گریبان کھلا اور اس کی گردن دبائی۔ پس اس کے باپ سہیل نے کہا ”اے محمد! سب سے پہلی چیز جس پر میں آپ سے محاکمہ کرتا ہوں یہ ہے کہ آپ اس کو واپس کر دیں۔ آپ نے فرمایا ابھی تک تو ہم نے صلح نامہ پورا نہیں کیا یعنی ابھی تک تو اس کی کتابت کی تکمیل نہیں ہوئی۔ سہیل نے کہا: پھر اشد کی قسم! میں آپ سے کسی چیز پر صلح نہیں کرنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چلیے اس کو میری خاطر اجازت دے دیجئے اُجُودُ! اُجُودُ! سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی اس کے حق میرے فعل کو نافذ نہ کرنے دیجئے کہ میں اس کو واپس نہ کروں یا اس کو صلح سے مستثنیٰ کر لیجئے۔ اور حمیدی کی جمع میں اٹھین میں: اُجُودُ! ”اے محمد! اس کے ساتھ ہے اور ابن جوزی نے ”نا“ کو ترجیح دی ہے۔ اس واقعے سے معلوم ہوا کہ حقوق میں اصل اعتبار زبانی معاہدہ کا ہے اگرچہ اس کی تحریر اور اس پر شہادت ثبت کرنے میں تاخیر واقع ہو جائے۔ اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل کو اس کو لڑکا ابوجندل واپس کر دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد: ”ابھی تک تو ہم نے تحریر مکمل نہیں کی“ کے ذریعہ یہ چاہا تھا کہ کسی حیلے سے سہیل راضی ہو جائے تو بات قریشی بھی انکار نہیں کریں گے کہ یہ اس کے اپنے بیٹے کا معاملہ تھا لیکن جب اس نے انکار پر صدمہ باندھ لی۔ تو آپ نے اس کو واپس کر دیا، پس سہیل نے کہا میں اس کی کبھی اجازت نہیں دوں گا۔ آپ نے مکر فرمایا: کہ اس کو تو بھی اجازت دے ہی دو، سہیل بولا: میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اور مرکز نے کہا اور واقعہ کی مطابق مرکز اور حلیط نے کہا کہ نہیں بلکہ ہم آپ کی خاطر اس کو اجازت دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر ان دونوں نے ابوجندل کو پکڑ کر خیمہ میں داخل کر لیا اور اس کے باپ کو اس کے مارنے سے ہٹا دیا۔ حافظہ کہتے ہیں کہ یہاں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ سہیل نے مرکز کو کیا جواب دیا، بعض شارحین کا کہنا ہے کہ ”اس کو کوئی جواب نہیں دیا کیوں کہ مرکز کا عقد صلح سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“ لیکن یہ عمل نظر ہے کیوں کہ واقعہ اور ابن عثام کی روایت ہے کہ مرکز بھی سہیل کے ساتھ صلح کے سلسلہ میں آیا تھا اور ان کے ساتھ حلیط بن عزیٰ بھی تھا۔ مگر ان دونوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ اجازت صرف مذاب و غیرہ سے امن دینے تک محدود تھی، مسلمانوں کے پاس اس کے رہنے کی اجازت نہیں تھی، لیکن اس پر اشکال ہوتا ہے کہ صحیح کی روایت میں ہے کہ مرکز نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالب

ہو کہ کہا کہ ہم نے آپ کی خاطر اس کی اجازت دی اور اسی بنا پر اس کا وہیہ اشکال کا باعث سمجھا گیا۔ کیوں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے خلاف تھا کہ ”وہ فاجر آدمی ہے“ بظاہر اس کے فاجر ہونے کا معقنیٰ یہ تھا کہ وہ سہیل کی ہمنوائی کرتا۔ اور اس اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا فاجر ہونا تو ایک حقیقت ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے شاذ و نادر بھی کوئی نیکی وقوع میں نہ آئے یا ممکن ہے کہ اس نے یہ بات ازراہ لفاق بھی ہو اور باطن میں اس کے خلاف ہو یا ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد سن لیا ہو کہ ”وہ فاجر ہے۔“ اس لئے اس کے خلاف کوئی ہر کرنے کا ارادہ کیا ہو اور اگر واقعی اور ابن عابد کی روایت ثابت ہو تو وہ ان احتمالات سے قوی تر ہے کیونکہ اس کے اجازت دینے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اسکو مزید نادم کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے باپ کی اطاعت کی طرف رجوع ہو جائے پس وہ اس اجازت کے ساتھ بھی فخر سے خارج نہیں ہوا اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ ”سہیل نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی آمد سے پہلے میرے اور آپ کے درمیان قطعی فیصلہ ہو چکا تھا آپ نے فرمایا تو نے ٹھیک کہا۔“

اور شیخ قدس سرہ ”لامع“ میں فرماتے ہیں کہ مرکز کا یہ کہنا کہ ”ہم نے آپ کی خاطر اس کو اجازت دے دی۔“ چونکہ مرکز نے توفیق کی جانب سے دلیل تھانہ البجندل کا دلی تھا اس لئے اس کی بات نہیں سنی گئی اور لامع کے حاشیہ میں اس پر مفصل کلام کیا گیا ہے اور اس میں حافظ کا وہ کلام بھی ذکر کیا ہے جو اجماعی اور پر گندہ اور اس کے آخری سچے کہ حافظ نے خبر کہا ہے کہ: ”بعض شامین کا خیال ہے کہ سہیل نے مرکز کو کوئی جواب نہیں دیا“ الخ اس سے کہ مانی مراد ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں: ”اگر تم کہو کہ جب مرکز نے کہہ دیا تھا کہ ہم نے اس کو اجازت دے دی تو آپ نے البجندل کو مشرکین کی طرف کیوں واپس کیا؟ جواب یہ ہے کہ عقد صلح کو طے کرنا سہیل تھانہ کہ مرکز، پس اسی شخص کا قول معتبر ہے جو صلح طے کر رہا ہے نہ کہ مرکز کا قول“ اھ البجندل نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا: اے مسلمان! کیا مجھے مشرکوں کے حوالے کیا جائے گا جب کہ میں مسلمان ہو کر آیا ہوں؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ مجھے کن مصائب سے سامنا ہے؟ ان کو اللہ کے راستے میں بہت ہی سخت مذاب دیا گیا تھا۔ ابن اسحاق نے یہ اضافہ کیا ہے کہ ”البجندل بلندہ آواز سے فریاد طلبی کے انداز سے کہنے لگا، ”اے مسلمانو! کیا مجھے مشرکین کے حوالے کر دیا جائے گا کہ وہ مجھے دین سے بھلاتے رہیں؟ یہ سن کر مسلمانوں کے غم و اندوہ میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔“ اھ اور خیس میں ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ سہیل ایک لیکر کے درخت کی طرف گیا اس سے ایک شاخ کاٹی اور اس سے البجندل کے منہ پر مارنے لگا، یہ منظر دیکھ کر مسلمانوں پر رقت طاری ہو گئی اور وہ رونے

لگے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے ابوجندل صبر کر اور اللہ سے ثواب کی امید رکھ، کیوں کہ اللہ تعالیٰ تیرے لئے اور تیرے ساتھ کے اور مسلمانوں کے لئے کثرتِ بخشش اور غریح (اس مصیبت سے نکلنے کا راستہ) پیدا فرمادیں گے، ہم ان لوگوں سے ایک معاہدہ کیچکے ہیں اور ہماری صلح ہو چکی ہے جس میں واپسی کی شرط بھی ہم نے قبول کر لی ہے، ان لوگوں نے ہمیں اللہ کا عہد دیا ہے اور ہم ان سے بدعہدی نہیں کریں گے۔ اور حضرت عمر بن خطاب اپنی جگہ سے فوراً اٹھ کر ابوجندل کے پہلو میں چلے گئے اور ان سے فرما رہے تھے، اے ابوجندل! یہ تو مشرک ہیں، ان میں سے ایک ایک کانخون کتے کے خون کی حیثیت رکھتا ہے اور حضرت عمرؓ تلوار اس کے قریب کر رہے تھے اور بعد میں فرماتے تھے، مجھے توقع تھی کہ وہ تلوار لے کر اپنے باپ کا سر اڑا دے گا۔ مگر ان صاحب کو اپنے باپ سے یہ سلوک گوارا نہ ہوا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ابوجندل نے کہا، اے عمرؓ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے مجھ سے زیادہ مستحق نہیں ہو۔“

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جب گھر سے چلے تھے تو چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں اس لئے انہیں فتح میں قطعاً شک نہیں تھا کہ جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں صلح ہو گئی ہے اور وہ فتح کے بغیر واپس جا رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کڑی شرطیں بھی قبول فرما لی ہیں تو انہیں اس کا اتنا صدمہ ہوا کہ قریب تھا کہ وہ اس صدمے سے مر جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا ہے کہ انہوں نے فرمایا واللہ! میں جب سے اسلام لایا اس دن کے سوا مجھے کبھی کسی معاملہ میں تردد نہیں ہوا۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: کیا آپ اللہ کے پیچے بنی نہیں؟۔ ارے خیر میں اسی طرح ہے اور یہ پوری گفتگو بخاری کی روایت سے آگے آتی ہے۔ زرقانی، حافظؒ کی متابعت میں کہتے ہیں ”علماء نے کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سوال اور ان کی گفتگو خدا نخواستہ دین میں شک کی وجہ سے نہیں ہوئی، تو یہ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے، چنانچہ ابن اسحقؒ کی روایت میں ہے کہ جب حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے فرمایا، آپ کی رکاب تھامے لکھ کر آپ اللہ تعالیٰ کے پیچے رسول ہیں“ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ آپ واقعی اللہ کے پیچے رسول ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ بلکہ ان کی ساری گفتگو کا منشا اس صلح کی مصلحت دریافت کرنا تھا جو ان سے غنی تھی، اودان کی (کفار کی) تذلیل کرنا اور اسلام کے علم پر براہِ گیمختہ کرنا تھا، جیسا کہ انصاریؒ دین اور تذلیلِ مبطلین کے بارے میں ان کی عادت اور شدتِ معروف ہے۔ میں کہتا ہوں! آپس میں شک جس کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول میں ذکر ہے وہ نہ تو دین میں محتاذِ رسالت میں بلکہ اس امر میں تھا کہ صلح مصلحتِ دین کے حق میں

ہے یا نہیں؟ اور اس کا منشا یہ تھا کہ وہ اللہ کے معاملے میں سب سے سخت تھے۔ حافظ گنجپیش "جو بات میرے لئے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا توقف اس مقصد کے لئے تھا کہ وہ اس قصص کی حکمت سے واقف ہو جائیں اور ان کا شبہ زائل ہو جائے۔ اس کی نظر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ قصہ ہے جو عبد اللہ بن ابی ابن سلول کی نمازِ جنازہ کے وقت میں آیا۔ اگرچہ صلح حدیبیہ کے قصہ میں ان کا اجتہاد حکم کے مطابق واقع نہیں ہوا، بخلاف آخر الذکر قصہ کے۔ اور انہوں نے جو اعمال کئے وہ ایسی بنا پر کئے وہ زمان سے جو کچھ صادر ہوا تھا وہ اس میں معذور ہی نہیں بلکہ ماحور بھی تھے کہ وہ اس معاملہ میں مجتہد تھے۔" کہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اعمال کئے ان کا بیان آگے آتا ہے۔

تکمیل صلح سے قبل دو غلاموں کی آمد: اور اس قصہ پر اس حدیث سے اشکال نہیں ہوتا جو مشکوٰۃ میں بڑا بڑا اور ابو داؤد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ "حدیبیہ کے دن صلح سے پہلے دو غلام حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، ان کے آقاؤں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھا کہ! "واشد یہ آپ کے پاس اس لئے نہیں آئے کہ انہیں آپ کے دین سے رغبت ہے، بلکہ محض غلامی سے فرار کی بنا پر آئے ہیں۔" صحابہؓ میں سے کچھ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! انہوں نے صبح کھا ہے آپ ان کو واپس کر دیجئے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غصہ تک ہوئے اور فرمایا اے جماعت قریش! میری خیال ہے تم اس باز نہیں آؤ گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تم پر ایسے افراد مسلط کر دے جو اس پر تمہاری گردنیں ماریں۔" اور فرمایا: "یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے آزاد ہیں" (اشکال وارد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے) کہ یہ قصہ صلح سے قبل پیش آیا اور شیخ بدل میں اس طرف مائل ہوئے ہیں کہ یہ قصہ حدیبیہ کا نہیں بلکہ غزوہ طائف کا ہے اور اس کو تین وجوہ سے ترجیح دی ہے، لیکن اس ناکارہ کے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ قصہ دونوں جگہ پیش آیا ہو۔ کیوں کہ ابو داؤد، ترمذی اور حاکم کی روایت میں یوم حدیبیہ کی تصریح ہے اور ابو داؤد کی روایت میں "یعنی یوم حدیبیہ" کا لفظ ہے اور ترمذی اور حاکم کی روایت میں "یعنی" کا لفظ نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بے چینی: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، پس عرض کیا کہ یہ کیا واقعہ نہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پیچھے بنی ہیں؛ آپ نے فرمایا: بلا شک میں نے عرض کیا: کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن باطل پر نہیں؟ فرمایا: بلا شک اور بخاری کی کتاب الجزیہ اور کتاب التفسیر میں یہ اضافہ کیا ہے کہ میں نے عرض کیا: کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہمارے مقتول جنت میں اور ان کے مقتول جہنم میں جائیں گے؟ فرمایا: بلا شک اور یہ مجلہ کتاب الشروط میں نہیں عرض کیا، جب یہ سب کچھ صبح ہے تو پھر میں ہمارے دین کے معاملہ میں سخت اور ذلت کیوں دی جا رہی ہیں؛ اور تفسیر اور جزئیہ میں یہ اضافہ ہے کہ کیا ہم لوگوں ہی واپس لوٹ جائیں

جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان فیصلہ نہیں کیا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں اللہ کا رسول ہوں اور میں اس کے حکم کے خلاف نہیں کر رہا اور وہ میری مدد فرمائیں گے، اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قتل اور اضطراب زائل کرنے کے لئے ان کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ آپ نے یہ معاہدہ کسی ایسے مقصد کی خاطر کیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطلع فرمایا ہے اور یہ کہ آپ نے جو کچھ کی ہے وہ وحی سے کیا ہے میں نے عرض کیا کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ جائیں گے اور طواف کریں گے؟ اس میں تنبیہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواب مدینہ منورہ میں دیکھا تھا، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے وہ ان صحابہ کی طریت کے کھجاہ کو اس بابے میں ذرا بھی شک نہ تھا کہ مندرستہ ہو گی مگر جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں تو صلح ہو گئی تو انہیں اس سے اتنا صدمہ ہوا کہ قریب تھا کہ صدمہ سے ہلاک ہو جائیں، فرمایا: یہ تو صحیح ہے مگر کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال جائیں گے؟ میں نے عرض کیا یہ تو نہیں فرمایا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس تم بالضرورت اللہ جاؤ گے اور طواف کرو گے" اور واقعی نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اس دن مجھے عظیم صدمہ ہوا اور میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا سوال جواب کیا جو اس سے قبل کبھی نہیں کیا تھا" اور بزار نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو گئے مگر میں انکار ہی کرتا رہا یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! تم دیکھ رہے ہو کہ میں راضی ہو گیا ہوں مگر تم انکار ہی کئے جاتے ہو" اور بخاری کی کتاب الخیر اور کتاب التفسیر میں حضرت سہل بن صفین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لے ابن خطاب! میں اللہ کا رسول ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھے برگزینا ہے میں نے فرمایاں گے۔ پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ غم و غصہ کی حالت میں واپس ہوئے مگر کسی کو روٹ چین نہیں آتا تھا، یہاں تک کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "پس میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا، حافظ کہتے ہیں کہ: "حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہوں نے اس سلسلہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ کسی اور سے بھی مراجعت کی ہو۔ اور یہ اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جلالت قدر اور وسعت علم مسلم تھی۔" زنداغانی کہتے کہ ابن اسحاق کی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل حضرت ابو بکر سے سوال کرنا مذکور ہے، مگر صحیح کی روایت زیادہ صحیح ہے، خصوصاً جب کہ ایک دوسری حدیث میں اس کی وضاحت بھی موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر کے پاس جلسہ کا سبب کیا تھا۔ اور ایک دوسری جگہ کہتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حضرت ابو بکر سے سوال و جواب کرنے کا سبب وہ شدید غم و غصہ تھا جو انہیں لاحق تھا،

اور دین کی نصرت و سرپنڈی اور کافروں کی تذلیل کا وہ شدید داعیہ متعاجران میں موجزن تھا، جیسا کہ حضرت سہیل بن حنیف اس کو اپنے لفظوں میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ، وہاں سے غم و غصہ کی حالت میں لوٹے، مگر کسی کو روٹ میں نہیں آیا یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے، اللہ پس نے کہا! اسے ابوبکر! کیا آپؐ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیچھے نبی نہیں ہیں؟ کہا: کیوں نہیں؟ بے شک پیچھے نبی ہیں۔ میں نے کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ کہا: کیوں نہیں؟ یقیناً۔ میں نے پھر کہا: ہمیں ہمارے دین کے بارے میں ذلت اور خست کیوں دی جا رہی ہے۔ ابوبکرؓ نے عرضی اللہ عنہا سے کہا: ارے یہاں! یقیناً آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اور آپؐ اپنے رب کے حکم کے خلاف نہیں کرتے، اور اللہ تعالیٰ آپؐ کی ضرورت مدد کرے گا، اس لئے آپؐ کی رکاب تھلے رکھو، غزو (فتح غنیمت) سکون (اور اس کے بعد زلا، اونٹ کی رکاب کو کہا جاتا ہے) یعنی آپؐ کے حکم کو مضبوطی سے پکڑو، اور آپؐ کی مخالفت نہ کرو، جس طرح کوئی شخص سوار کی رکاب تھلے اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور اس سے کسی وقت جدا نہیں ہوتا اور الہدی میں یہ اضافہ ہے: ”یہاں تک کہ تمہاری موت آجائے“ اور لایع میں ہے کہ: ”یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم کیا گیا ہے کہ مرتے دم تک آپؐ کا ساتھ دیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امر و نہی میں آپؐ کے خلاف نہ کریں“ اللہ کی قسم! آپؐ حق پر ہیں، میں نے کہا کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے یہ نہیں فرماتے تھے کہ ہم بیت اللہ جا میں گئے اور اس کا طواف کریں گے؟ کہا: یہ تو صحیح ہے مگر کیا آپؐ تم سے یہ بھی فرمایا تھا کہ تم اسی سال جاؤ گے؟ میں نے کہا: یہ تو نہیں فرمایا تھا۔ کہا: پھر تم ضرور جاؤ گے اور بیت اللہ کا طواف کرو گے، الغرض حضرت ابوبکرؓ نے لفظ بلفظ ٹھیک وہی جواب دیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، اس سے ثابت ہوا کہ؟ حضرت ابوبکرؓ تمام صحابہؓ میں سے کامل، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کے سب سے زیادہ واقف، امور دین کے سب سے بڑے عالم اور امر الہی کی موافقت میں سب سے مضبوط تھے اور فتح میں ہے ”اس حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ مسلمانوں نے صلح نہ کرونا گوارا سمجھا، عام مسلمان اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے پر تھے، اور اس جگہ سے ثابت ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس میں ان کے موافق نہیں تھے، بلکہ آپؐ کا قلب ٹھیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کے ہر رنگ تھا، اور ہجرت کے بیان میں آتا ہے کہ ابن ابی العزہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ٹھیک وہی اوصاف بیان کئے ہیں جو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کئے تھے کہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، ناداروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور ناگہانی مصائب میں لوگوں کی اعانت فرماتے ہیں، وغیرہ چونکہ دونوں کی

صفات ابتداء ہی سے ہرگز تھیں، اس لئے یہ ہمرنگی نہ صرف آخر تک وہی بلکہ انتہا کو پہنچ گئی۔
 میں کہتا ہوں کہ یہ وہی حالت ہے جس کو حضرات صوفیہ ”نسبت اتحادیہ“ سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ ان چاروں
 نسبتوں میں سے ایک ہے جو صوفیہ کے میاں معروف ہیں۔ یعنی نسبت العکاسیہ، نسبت القاۃ، نسبت اصلاحیہ
 اور نسبت اتحادیہ۔ میں نے حاشیہ لائحہ کے ابتدائی اوراق میں، جہاں ابتداء وحی کے وقت حضرت جبریل علیہ السلام
 کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبل میں لے کر دوائے کا ذکر ہے، ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اور کتب حدیث میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس ”نسبت اتحادیہ“
 کی بہت سی مثالیں مذکورہ الصدور دو واقعات کے علاوہ بھی مذکور ہیں، ان میں ایک اُساریٰ بدر کا واقعہ ہے جس
 میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت کی تھی۔ اور اسی نسبت اتحادیہ کے نتیجے میں آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بلا فصل ہوئے کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 کے فراق سے نہایت وحشت و پرہیزگاری تھی، ان حالات میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت
 کسی ایسے شخص کے سپرد ہوتی جس کی طبیعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کے ذرا بھی خلاف ہوتی تو اس
 کے احکام میں مزید وحشت پیدا ہو جاتی، اور میں نے حاشیہ لائحہ میں اسی کی طرف مختصر اشارہ کیا ہے، چنانچہ اس
 میں لکھا ہے کہ ”حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے تقدم کے وجہ و اباب میں سب سے بڑی وجہ
 سچکراں کی خواہش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات و عواطف کے کثیر تابع تھی اور یہی سبب تھا کہ حضرات
 صحابہ کرام کے احوال سے اُنس حاصل ہوا۔ رضی اللہ عنہ۔“

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ”بعد ازاں اس کی خاطر میں نے بہت سے عمل کئے“۔ بعض شارحین نے
 ”بہت سے اعمال“ کی تفسیر آمد و رفت اور سوال و جواب سے کی ہے، حافظؒ کہتے ہیں ”بہت سے اعمال“ کی تفسیر
 مردود ہے، بلکہ اس سے مراد اعمال صالحہ ہیں، تاکہ ان سے ابتداء میں امتثال امر سے جو توقف سرزد ہوا، اس کا ازالہ اور
 تکفیر ہو جائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس کی تصریح منقول ہے، چنانچہ ابن اسحاق کی روایت ملے کہ ”حضرت
 عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اسدن میں نے جو کچھ کیا اور جو گفتگو ہوئی اس کے خوف سے میں نے صدقہ کئے، روزے
 رکھے، غازیں پڑھیں اور غلام آزاد کئے۔“ اور واقدی کی روایت میں ہے کہ: ”میں نے اس کی وجہ سے بہت سے
 غلام آزاد کئے اور مدت تک روزے رکھے۔“

صلح نامہ کی دس دفعات : نہ کافی کہتے ہیں : اور دس سال کے لئے صلح کا معاہدہ ہوا تھا جیسا کہ سہیل کی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ابتدائی گفتگو میں مفصل کر چکا۔ اور غیس میں ہے کہ: ”سہیل نے جو شرط بھی پیش کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے قبول کرتے گئے، اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھتے گئے اور لکھا کہ: یہ وہ تحریر ہے، جس پر محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم تلمیذ) نے سہیل بن عمر سے مصالحت کی۔ اور دونوں نے دس برس تک لڑائی سرفروغ رکھنے پر اتفاق کیا تاکہ لوگ اس مدت میں امن سے رہیں اور ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائیں، اور یہ کہ قریش کا جو شخص دل کی اجازت کے بغیر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اگرچہ وہ مسلمان ہو، وہ اسے واپس کر دیں گے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رفتار میں سے جو شخص قریش کے پاس آئے وہ واپس نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ ہمارے درمیان از بندہ ہیں گے، یعنی بہت سے امور ہیں جو صاف سینوں میں دفن ہیں گے، یہ اس امر کی جانب اشارہ تھا کہ اس کے قبل اسباب حرب وغیرہ کے جو قصے فریقین کے درمیان پیش آچکے ہیں ان پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا اور یہ کہ چور کی اور حیانت نہیں ہوگی۔ اسلالم سئل سے ماخوذ ہے یعنی چوری کرنا اور اطلال کے معنی خیانت کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ فریقین امن و امان سے رہیں گے اور فریقین کے جان و مال سرحد جہاں امن و محفوظ رہیں گے، اور یہ کہ جو قبیلہ قریش کے عقد و معاہدہ میں شامل ہونا چاہے شامل ہو سکتا ہے اور جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب شامل ہونا چاہے، اس جانب شامل ہو جائے۔

چنانچہ خزاعہ فوراً آگئے اور کہا: ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کے عقد و معاہدہ میں شامل ہوتے ہیں۔ اور نوکر نے کہا کہ ہم قریش کے عقد و معاہدہ میں شامل ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ آپ اس سال واپس لوٹ جائیں، پس ہمارے یہاں مکہ میں نہ آئیں، اور یہ کہ آئندہ سال ہم مکہ سے نکل جائیں گے پس آپ اور آپ کے صحابہ داخل ہوں اور تین دن رہیں، آپ لوگوں کے ساتھ صرف وہ ہتھیار ہوں جو سوار کے پاس ہوتے ہیں یعنی نیام میں بند تلواریں، ان کے علاوہ آپ کوئی ہتھیار نہیں لائیں گے۔ اندھیس کی عبارت ختم ہوئی۔ اور زرقانی میں ہے کہ: ”ایک شرط یہ تھی کہ آپ اس سال نہیں بلکہ آئندہ سال مکہ آئیں گے، تین دن رہیں گے اور صرف بند ہتھیار ساتھ لائیں گے۔ جُلبان، بغیم جیم و سکون لام بام مودہ بغیر تشدید کے پھر الف پھر نون یا قحیلہ جیسی ایک چیز ہوتی ہے جس میں نیام بند تلوار رکھی جاتی ہے۔ اور ایک روایت میں جُلبان، بغیم جیم و لام اور تشدید بام کے ساتھ ہے یعنی وہ قحیلہ جن میں اسلحہ رکھا جائے۔ یہ شرط اس بنا پر لگائی تاکہ یہ صلح کی علامت ہو کہ ان کا داخلہ صلی تھا۔“

گو اہوں کے دستخط : جب صلح نامہ کی تحریر سے فارغ ہوئے۔ ابن اسحاق نے یہ اضافہ کیا ہے کہ جب

بن القوسین کی عبارت اصل عربی نسخہ میں رہ گئی تھی حضرت شیخ مدنی نے حکم سے ترجمہ میں اضافہ کیا گیا مترجم

صلح نامہ کی تحریر سے فراغت ہوئی تو صلح نامہ پر طرہیں کے چند افراد کی شہادت ثبت کر دی گئی، مسلمانوں کی طرف سے حضرت ابوبکر، عمر، علی، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، محمود بن مسلمہ، عبداللہ بن سہیل بن عمرو اور۔ ابوعبیدہ بن جراح کے اور مشرکین کی طرف سے مکہ زبیر بن جحش اور حنظل بن عبدعزیٰ کے نام ذکر کئے گئے ہیں فتح الباری میں اسی طرح ہے اور کچھ اضافہ خیس سے کیا گیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: اٹھو! نحر اور حلق کر دو حافظہ کہتے ہیں کہ ابوالاسود کی روایت میں عروہ سے مروی ہے کہ متعجب صلح سے ناراض ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہبی کا حکم فرمایا۔ پس مسلمانوں نے ہبی کے جائز حرم کی طرف کھینچے، اور مشرکین قریش نے ان کو روک دیا، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر کا حکم فرمایا۔ اور زرقانی نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ۔

”ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہبی کے اونٹوں کو بیت اللہ شریف سے روک دیا گیا تو وہ اس طرح آواز نکالتے تھے جس طرح اپنی اولاد کے اشتیاق میں آواز نکالا کرتے ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہبی کے اونٹوں کو حدیبیہ میں اسی جگہ نحر کیا جہاں ان کو روک دیا گیا تھا۔“ یعنی اکثر کہہ لہذا یہ روایت اس دوسری روایت کے سنائی نہیں جوا بن سعد نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نقل کی ہے کہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو اسلم کے ایک شخص کے ساتھ میں اونٹ بھیجے تاکہ انہیں مردہ کے پاس نحر کیا جائے۔“ زرقانی میں اسی طرح ہے اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث ابن کثیر نے امام احمد کے حوالے سے ذکر کی ہے کہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے دن نحر اونٹ نحر کئے، جن میں ابوجہل کا اونٹ بھی شامل تھا، پس جب ان کو بیت اللہ سے روک دیا گیا تو وہ ایسی مشتاقانہ آواز نکالتے تھے جیسے اپنی اولاد کے اشتیاق میں نکالتے ہیں۔ پس اللہ کی قسم! صحابہؓ میں سے ایک بھی نہ اٹھا۔ کہا گیا ہے کہ غالباً انہوں نے اس بنا پر توقف کیا کہ شاید یہ حکم استحباب کے لئے ہو یا اس موقع پر کہ شاید زہل وحی کے ذریعہ صلح مذکور کا عدم قرار دینے دیا جائے یا انہیں اسی سال عہدہ کے لئے مکر جانے کی اجازت دے کہ اس میں تخصیص ہو جائے، اور اس کی گنجائش اس لئے تھی کہ یہ زمانہ نزع کا تھا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ صلح جو دُب کہہ رہی تھی اس نے انہیں بہت اور بے خود کر دیا ہوا اور یہ اس فکر میں مستغرق ہوں کہ باوجود ظہور قوت کے ان کے خیال میں انہیں زلت لاحق ہوئی، جبکہ انہیں یقین تھا کہ وہ قبہ وغیرہ کے ساتھ اپنے مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں اور اداسے عہدہ کی قدرت رکھتے ہیں۔ یا انہوں نے تعیل حکم میں اس لئے تاخیر کی کہ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ ابرہہ طعن کا فی الفور بجالانا ضروری نہیں۔ اور احتمال ہے کہ یہ امور مجموعی طور پر ان کے مجرورہ کو پیش آئے ہوں۔ (یعنی بعض حضرات کے لئے بعض امور اور دوسرے بعض کے لئے دوسرے بعض امور) جیسا

کہ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے کلام میں آگے آتا ہے، میان تک آپ نے تین بار یہی فرمایا: پس جب کوئی نہ اٹھا تو آپ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے۔ اس سفر میں آپ کے ساتھ صرف اُم سلمہ رضی اللہ عنہا تھیں، جیسا کہ ابتداء میں گزر چکا ہے۔ پس ان سے اُس امر کا تذکرہ کیا جو لوگوں کی جانب سے آپ کو پیش آیا۔

تھا۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ: آپ نے اُن سے فرمایا: تم لوگوں کی حالت نہیں دیکھ رہی ہو کہ میں انہیں حکم دیتا ہوں مگر وہ اس کو بجا نہیں لاتے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ یہ بات آپ کو بہت گراں گزری، پس اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا: مسلمان ہلاک ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کو حکم دیا کہ حلق اور نحر کریں مگر انہوں نے نہیں کیا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس دن صحابہ کرامؓ کی شکل اللہ تعالیٰ نے حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاهما کے ذریعہ حل فرمائی، چنانچہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ اس کو پسند فرماتے ہیں؟ باہر تشریف لے جائیے اور کسی سے ایک لفظ کہے بغیر اپنی ہدیٰ ذبح کر دیجئے، اور حلاق کو ہلاک کرالیں۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ: ”اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ان سے بات نہ کیجئے، آپ نے امر صلح میں جس مشقت کا تحمل فرمایا ہے اس کی وجہ سے نیز بغیر فتح کے واپس لوٹنے کی وجہ سے انہیں صدمہ عظیم لاحق ہے۔“ اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے صحابہ کے بارے میں یہ سمجھا ہو کہ انہیں یہ خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں رخصت پر عمل کرنے کے لئے احرام کھولنے کا حکم فرمایا ہے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عزیمت پر عمل فرماتے ہوئے احرام باقی رکھیں گے۔ اس لئے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ آپ خود اپنا احرام کھولیں تاکہ صحابہ کرامؓ کے سامنے یہ احتمال باقی نہ رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ یہ صائب مشورہ ہے اس لئے یہی کیا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے، کسی سے کچھ نہیں کیا بلکہ اپنے اونٹوں کا اور ایک روایت میں ہے کہ اپنی بیوی کا نحر کیا۔ ابن اسحاق نے روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ اضافہ کیا ہے کہ آپ کی ہدیٰ کے ستر اونٹ تھے، جن میں ابو جہل کا اونٹ بھی تھا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور حلاق کو ہلاک کرالیا۔ ابن اسحاق کہتے ہیں: ”مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ جن صاحب بنے اس دن آپ کا حلق کیا، ان کا نام خیراش (خاء، راء، الف، اور شین کے ساتھ) ابن امیہ خزاعی تھا، پس جب صحابہؓ نے یہ دیکھا تو فوراً اُٹھے اور نحر کیا، حافظؒ کہتے ہیں: ”پس جب صحابہؓ نے یہ دیکھا تو فوراً امر نبوی کی طرف سبقت کی کیوں کہ اس کے بعد کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔“ اور ایک دوسرے کا حلق کرنے لگے، میان تک کہ قریب تھا کہ غم کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل ہی کر دیں۔ اور بناری میں حضرت

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (عمرو کے لئے) نکلے، پس کفار قریش
حائل ہو گئے۔ اس روایت کے آخر میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کیا اور صحابہؓ نے قصر کیا۔ ملا علی
قاری مرقات میں کہتے ہیں: ”یعنی بعض صحابہؓ نے قصر کیا اور باقی حضرات نے حلق کیا تھا۔“

حلق کرانے والوں کے لئے تین بار دُعا کرنا: اور طبقات میں ہے کہ ”آپ کے صحابہؓ نے خنکنا اور عا حضرت
نے حلق کرایا اور کچھ لوگوں نے قصر پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حلق کرانے والوں پر رحم فرمائے؟
یہ دعائیں بار فرمائی عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! اور قصر کرنے والوں پر بھی فرمایا اور قصر کرنے والوں پر بھی۔ ابن اسحاق نے ابن

حباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس دن حلق کرایا اور کچھ حضرت نے قصر کرایا، پس رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حلق کرنے والوں پر رحم فرمائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: اور مقصرین پر بھی۔ — الحمد للہ —
اور ان کے اخیر میں ہے کہ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! آپ نے حلق کرانے والوں کو رحمت کی دعا کرنے میں ترجیح کیوں دی؟ فرمایا:
وہ شک میں نہیں پڑے۔ زرقانی کہتے ہیں کہ معطلاتی نے کہا ہے: اور اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی۔ جیسا کہ ابن سعد نے

روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو بیت اللہ سے روک دیا گیا۔ اور انہوں نے حلق
و خنکنا تر اللہ تعالیٰ نے زور کی ہوا بھیجی جس نے ان کے بالوں کو اٹھا کر حرم میں لا ڈالا۔ یہ ان کے بیت اللہ سے
روک دینے جانے کی تلافی تھی ابو عمر کی روایت میں یہ عاذ ہے کہ وہ قبول عمرو کی نیک خالی سے بہت ہی خوش ہوئے
غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک اس سے مستثنیٰ تھے۔ چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ خراش نے
جب آپ کا حلق کیا تو آپ کے موئے مبارک لیکر کے مر بنزدخت پر جو ان کے قریب ہی تھا، پھینک دیئے
پس لوگ اس کے اوپر سے لینے لگے اور اُمّ عمارہ نے آپ کے موئے مبارک کے کئی گچھے لئے، وہ ان کو دھو کر
کہ بیماروں کو پلاتی تھیں جس سے وہ شفا یاب ہو جاتے تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ موئے مبارک کا اکثر حصہ صحابہؓ
نے لے لیا ہو اور باقی ماندہ ہوا سے ادا کر حرم شریف میں جا پڑے ہوں۔ اور صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ

سے مروی ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حیدریہ کے دن ہم سے فرمایا: تم لوگ تمام روئے زمین کے لوگوں
سے افضل ہو۔ اور مسلم وغیرہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ”کوئی شخص جو بد اور حیدریہ
میں شریک ہو اور زرخ میں داخل نہیں ہوگا۔ اور امام مسلم نے حضرت اُمّ بشر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے،
وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے: آپ فرماتے تھے کہ ”اصحاب شجرہ میں سے کوئی
شخص دمنخ میں داخل نہیں ہوگا۔“ ابو عمر کہتے ہیں کوئی غزوہ، غزوہ بدر کے مساوی یا اس کے قریب نہیں، بخیر

غزوہ مدینہ کے، کہ وہاں بیعت رضوان ہوئی تھی، لیکن دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ غزوہ احد کو غزوہ مدینہ پر ترجیح حاصل ہے اور وہ فضیلت میں غزوہ بدر کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔

حدیبیہ میں قیام کی مدت : اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں دس دن سے کچھ زیادہ فرودکش رہے، بعض نے بیس دن بتائے ہیں اور واقعہ ای اور ابن سعد نے ”کچھ زیادہ“ کو مبہم رکھا ہے۔ شامی میں ان دونوں سے انیس دن نقل کئے ہیں اور ابن عابد نے ڈیڑھا ماہ قیام کا ذکر کیا ہے۔

قصہ حدیبیہ سے متعلق فقہی مباحث : غنی نہ رہے کہ قصہ حدیبیہ میں بہت سے فقہی ابحاث ہیں جن کی تفصیل وجہ اور لائحہ کے حاشیہ میں مذکور ہے۔ اس مختصر مقالہ میں ان کے ذکر کی گنجائش نہیں چنانچہ وجہ میں باب مابا بنین احصر لہ۔ کے ذیل میں ہے کہ ”اس میں بہت سے ابحاث ہیں، ۱۔ احصار کس چیز سے مستحق ہوتا ہے؟ ۲۔ کیا عمرہ میں بھی احصار مستحق ہوتا ہے؟ ۳۔ وجوب قضا کی بحث۔ ۴۔ وجوب ہدی کی بحث۔ ۵۔ بخر ہدی کے زمانہ و مکا میں اختلاف۔ ۶۔ جو شخص ہدی سے عاجز ہو کیا وہ کسی اور چیز کی طرف انتقال کر سکتا ہے؟ ۷۔ وقوف عرفات کے بعد بیت اللہ سے روک دیئے جانے کی بحث۔ ۸۔ کیا محصر کے لئے احرام کھولتے وقت حلق کرنا لازم ہے؟ ۹۔ کیا احرام کی وقت شرط لگانا محصر کے لئے مفید ہے؟ ۱۰۔ حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا احصار۔ ۱۱۔ حدیبیہ میں داخل ہے یا حرم میں؟ ۱۲۔ جس شخص کو احرام سے قبل احصار کا علم ہو جائے اس کا حکم؟ ۱۳۔ ماتیس من الہدی سے کیا مراد ہے؟ علاوہ ازیں دیگر مباحث جو وجہ میں مذکور ہیں۔

سورہ فتح کا نزول : پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے واپس ہوئے۔ درآنجا لیکھ صحابہ کے دل میں اس بات کا قلق تھا کہ فتح نہیں ہوئی۔ جب کہ مدینہ منورہ سے چلتے وقت انہیں اس کے ہونے میں کسی طرح کا شک نہیں تھا، پس جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی راستہ ہی میں تھے سورہ فتح نازل ہوئی۔ مذاقاً کہتے ہیں کہ یہ سورہ مکہ و مدینہ کے درمیان نازل ہوئی، جیسا کہ ابن اسحاق کی روایت ہے اور ابن سعد کی روایت ہے کہ اس کا نزول موضع خنجان میں ہوا۔ خنجان غنہ مہملہ کا فتح بچیم کا سکون، اور دونوں اور ان کے درمیان الف۔ مکہ سے ایک برید پر ایک سپاہ کا نام ہے اور سیوطی و مشور میں کہتے ہیں کہ امام بخاری، امام احمد، امام ترمذی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ میں نے تین بار آپ سے ایک بات دریافت کی، مگر آپ نے جواب نہ دیا، میں نے اپنے جی میں کہا اسے خطاب کے بیٹے! تجھ کو تیری ماں گم پائے، تو نے تین بار۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا مگر آپ نے تجھے جواب نہیں دیا۔ پس میں نے اپنے اونٹ کو حرکت دی اور سب

اتنے بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگ اسلام لائے۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ حدیبیہ کے لئے تشریف لے گئے تو کل چودہ یا پندرہ سو آدمی آپ کے ساتھ تھے اور اس کے دو سال بعد فتح مکہ میں آپ دس ہزار قدسین کے ساتھ نکلے۔ الخ

زر قانی کہتے ہیں کہ موسیٰ بن عقبہ نے عروہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لا رہے تھے کہ ایک صحابی نے کہا: کیا یہ فتح ہے؟ انہوں نے ہم کو بیت اللہ سے روک دیا، ہماری ہمی روک دی گئی اور دو مسلمان مشرکوں کے حوالے کر دیئے گئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا: بہت ہی بُری بات کہی۔ ارے یہ تو سب سے بُری فتح ہے کہ مشرکین... صرف اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ اپنے علاقے میں جانے سے نہیں روک دیں اور وہ تم سے صلح کی درخواست کرتے ہیں اور اس کی خاطر تمہاری طرف رحمت کرتے ہیں، جو چیز ان کو ناکوار تھی اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف سے اس کا موقع نہیں آنے دیا اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر کامیابی دی اور تمہیں اجر و ثواب کے ساتھ صحیح و سالم واپس کر دیا، اس لئے یہ سب سے بُری فتح ہے، کیا تم اُحد کا دن بھول گئے جب کہ تم دوڑے جا رہے تھے اور کسی کو پیچھے ٹکڑ بھی نہیں دیکھتے تھے اور میں پیچھے سے تم کو بلارہ تھا؟ کیا تم تکب احزاب کا دن بھول گئے جب کہ وہ تمہارے اوپر کی جانب سے اور تمہارے نیچے کی جانب سے چڑھ آئے تھے اور جب آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور کیچے منہ کو آ رہے تھے اور تم اللہ کے بارے میں مختلف خیال باندھ رہے تھے؟ پس مسلمانوں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا، واقعی یہ بہت بُری فتح ہے اللہ کی قسم! یا نبی اللہ! ہم نے اس بات پر غور نہیں کیا جو آپ کے پیش نظر تھی، بلاشبہ آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے امر کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ امام زہری نے صلح حدیبیہ کی جو مصلحت ذکر کی ہے اس کے علاوہ یہ مصلحت بھی ہے کہ وہ فتح اعظم کا مقدمہ تھی اور اس کے بعد لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے، اور قصہ حدیبیہ چونکہ فتح کا مقدمہ ہے اس لئے وہ بھی فتح کے ساتھ موسوم ہوا۔ ادیش بن قیس نے صلح حدیبیہ کے مصالح بہت ہی تفصیل سے ذکر کئے ہیں، جن کا خلاصہ چار چیزیں ہیں: اول یہ کہ یہ فتح اعظم کا مقدمہ ثابت ہوئی جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے رسول، صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اپنے لشکر کو معزز کیا اور جس کے ذریعہ لوگ اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوئے، دوم یہ کہ یہ خود بھی سب سے بُری فتح تھی، کیوں کہ لوگوں کو ایک دوسرے سے امن نصیب ہوا، مسلمانوں کو کافروں سے اختلاف کا موقع ملا اور مسلمانوں نے ان کو کھل کر دعوت دینا شروع کی، ان کو ترکانِ سُنیاء اور نہایت امن و سکون سے علی الاعلان ان کے ساتھ اسلام کے موضوع پر گفتگو اور مناظرے کے علاوہ جو

لوگ اپنے اسلام کا اظہار نہیں کر پاتے تھے ان کو اظہار اسلام کا موقع ملا اور مدت صلح کے درمیان وہ سب لوگ اسلام میں داخل ہوئے جن کا داخل ہونا اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کے ایمان و اذعان میں اضافے کا ذریعہ بنادیا اور ان کو ہر پسند و ناپسند میں انقیاد اور مکمل سپردگی کی مشق ہوئی اور اس ضمن میں انہیں رضا بقضاء اور وعدہ الہی کی تصدیق کی دولت حاصل ہوئی، چہارم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان نعمات کا ذریعہ بنایا جن کا ذکر سورۃ فتح میں ہے یعنی آپ کی اگلی پچھلی تمام خطاؤں کی مغفرت، آپ پر اپنے نعمات کی تکمیل، طرہ مستقیم کی طرف آپ کی راہنمائی، آپ کی قوی نصرت، آپ کا ان امور سے رہنمی ہونا، اور آپ کا الشرح الصدہ۔ انتہی مختصر

مسلمان عہدوں کی آمد: پھر مؤمن عورتیں آئیں۔ حافظ کہتے ہیں: اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورتیں آپ کے پاس اس وقت آئیں، جب کہ آپ مدینہ میں فروکش تھے۔ مگر ایسا نہیں، بلکہ وہ مدت صلح کے دوران آئی تھیں، امام بخاری نے کتاب الشروط کے اوّل میں جو روایت ذکر کی ہے وہ اس مدعا پر شاہد ہے، چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں: ”اور اس مدت کے دوران جو مرد بھی آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے واپس کر دیا اگرچہ وہ مسلمان تھا اور کچھ مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں۔“ آہں۔ اور جنس کی ایک روایت میں ہے کہ ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے کہ آپ کے پاس مومن عہدوں کی ایک جماعت ہجرت کر کے آئی، ان ہی میں ام کلثوم بنت عقبہ اور سیدۃ بنت الحارث الاسلمیہ تھیں، سیدۃ کا شوہر مسافر غزوہ میں اس کی طلب میں آیا اور مشرکین نے چاہا کہ آپ اسے واپس کر دیں، پس جبریل علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے: یا ایہا الدین امنوا اذا حکم المؤمنات منہن ما حکمت الایہ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت سے حلف لیا، اس نے قسم کھائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے شوہر سے فرمایا کہ اس کا شوہر چاؤا فرمایا اور بیعت سے حضرت عمرؓ نے نکاح کیا۔“ اھ

اور الاکتفا۔ میں ہے، کہ مدت صلح میں ام کلثوم رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے آئیں۔ ان کے دو بھائیوں عمار اور وکید نے مطالبہ کیا کہ ان کو واپس کیا جائے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واپس نہیں کیا اور فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اس سے انکار کرتے ہیں“ اھ حافظ ابن عبد البر ”استیعاب“ میں لکھتے ہیں: ”کہا گیا ہے کہ یہ سب سے پہلی خاتون تھیں جو ہجرت کر کے آئیں، ان کی ہجرت مدت صلح میں ۳ھ میں ہوئی اور اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: اذا حکم المؤمنات منہن ما حکمت الایہ۔ حافظ ابو عمر ابن عبد البر کہتے ہیں کہ لوگوں کا بیان ہے کہ یہ

۱۔ دنی الاصل اذا جاءکم المہاجرات

مکہ سے چل کر پیدل مدینہ پہنچے تھے۔ حافظ کہتے ہیں: جو مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں ان میں سے مندرجہ ذیل کے نام ذکر کئے گئے ہیں۔ ۱۔ امیر بنت ابتر، یحسان کے نکاح میں تھیں، پھر سہیل بن حنیف نے ان سے نکاح کیا۔ ۲۔ ام حکم بنت ابی سفیان۔ ۳۔ بروہ بنت عقبہ۔ ۴۔ عبیدہ بنت عبد العزیٰ۔ ۵۔ بنت خرمزہ بن عبد المطلب۔ انتہی مختصر۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل نازل کی: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الرِّسَالَاتُ فَاهْتَجِبْنَ۔ حتیٰ بلغ بعضهم الکؤافر (اے ایمان والو! جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو ان کا استحان کر لیا کرو۔ آخر تک) فسطائیٰ ابن کثیر کی متابعت میں کہتے ہیں کہ، اس روایت کے مطابق جس میں صلح نامہ کی عبارت نقل کی گئی ہے: ”اور نہیں آئے گا آپ کے پاس ہمارا کوئی فرد الخ“ یہ آیت سنت کے لئے مخصوص ہوگی اور یہ سبکی بہترین مثال ہے (کہ قرآن مجید سے سنت کی تخصیص صحیح ہے) اور بعض سلف کے طریقہ پر اس کے لئے ناسخ ہوگی، از قبیل نسخ سنت بالکتاب۔ اور جس روایت میں ”نہیں آئے گا آپ کے پاس ہمارا کوئی آدمی الخ“ کے الفاظ مروی ہیں اس کے مطابق اس میں کوئی اشکال ہی نہیں۔ ۱۔

ابن عربی احکام القرآن میں لکھتے ہیں: ”والپی کے معاہدے سے عورتوں کا خارج ہونا، اس معاہدہ کے عموم کی تخصیص تھی، اس کی تفسیر نہیں جیسا کہ بعض غافلین کو وہم ہوا ہے۔“ نیز آیت کے مسائل میں کہتے ہیں: ”تیسرے مسئلہ اس علت میں جس کی وجہ سے عورتوں کو واپس نہیں کیا گیا اگرچہ شرط کے عموم میں وہ بھی داخل تھیں اور اس میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ ان کی نرم دلی اور ضعف کی وجہ سے، دوم یہ کہ حرمت اسلام کی وجہ سے۔ اور حق تعالیٰ کا ارشاد: ”نہ یہ ان کافروں کے لئے حلال ہیں، نہ وہ کافر“ ان (مسلمان عورتوں) کے لئے حلال ہیں۔“ اس پر دلالت کرتا ہے، اور دونوں معنی صحیح ہیں اور جائز ہے کہ حکم دو عورتوں کے ساتھ معطل ہوئے آگے لکھتے ہیں۔ اور استحان کی تفسیر میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد قسم ہے اور دوسرا وہ جو صحیح میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے ساتھ ان کا استحان کیا کرتے تھے۔ الخ مختصر۔ میں کہتا ہوں کہ صلح نامہ کی تحریر کے آماز میں گزر چکا ہے کہ اس ناکارہ کے نزدیک لایانیک منارجل (نہیں آئے گا آپ کے پاس ہم میں سے کوئی آدمی) کی روایت زیادہ مناسب ہے، جیسا کہ تفصیل سے گزر چکا ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے کیوں کہ اس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

ابو بصیر کا قصہ : پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ آگئے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔ اور بخاری کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول مدینہ کی واپسی سے قبل ہوا تھا۔ پس قریش کا ایک آدمی ابو بصیر (فتح بار موحده و کسر صاد مہمل) آپ کے پاس آیا۔ اس کا نام قبہ (بضم عین مہملہ و سکون تاء) ہے اور بعض نے عبیدہ۔

(بصیغہ تصغیر) فرمایا ہے۔ گریہ دہم ہے، اور یہی زہرہ کا حلیف تھا، اس سے معلوم ہوا کہ حدیث الباب میں قریش کا آدمی سے مراد ————— قریش کا حلیف ہے کیوں کہ زہرہ قریش کی ایک شاخ تھی، پس قریش نے اس کی طلب میں دو آدمی بھیجے، ابن سعد نے ایک کا نام خنیس (خار مجہولون اور آخر میں سین مہمل کے ساتھ، بصیغہ تصغیر) ابن جابر ذکر کیا ہے، اور دوسرا اس کا غلام تھا جو ”کوثر“ کہلاتا تھا۔ اور ابن اسحق کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ۔

اخنس بن ثمری اور انہر بن عبدعوف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ایک خط لکھا اور اپنے ایک غلام اور بنو عامر کے ایک شخص کو، جس کو دو اونٹ اجرت کے دیئے گئے تھے، یہ خط دے کر بھیجا۔ اخنس تو ابوبکر کے قبیلہ بنو تہیف کا ایک فرد تھا، اور انہر کا تعلق ابوبکر کے حلفاء بنو زہرہ سے تھا، اور دونوں کی طرف سے اس کی واپسی کا مطالبہ تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ”یہ دونوں شخص ابوبکر کے تین دن بعد آئے۔ اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ حدیبیہ میں جو عہد آپ نے ہم سے ٹھہرایا تھا کہ ہمارے یہاں سے جو شخص آئے آپ اسے واپس کریں گے، اس کو پورا کیجئے، اور انہوں نے ابوبکر کی واپسی کا مطالبہ کیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفادار عہد کی خاطر اسے ان دونوں کے حوالے کر دیا۔ حافظؒ لکھتے ہیں کہ، ابن اسحق کی روایت میں ہے کہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر سے فرمایا، ”مجھے معلوم ہے کہ ان لوگوں سے کن شرائط پر ہماری صلح ہوئی ہے، اور ہم معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ اس لئے اپنی قوم میں واپس چلا جا۔ اس نے عرض کیا کہ کیا آپ مجھ مشرکوں کی طرف واپس فرماتے ہیں جو مجھ دین سے بچلا میں گئے اور مجھے سزائیں دیں گے؟ آپ نے فرمایا: صبر کر اور ثواب کی نیت رکھ، اللہ تعالیٰ جلد ہی تیرے لئے اس شخص سے نکلے گا راستہ پیدا فرمادیں گے۔“ اور ابوالمیخ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر سے کہا، تو بھی آدمی ہے وہ بھی آدمی ہیں اور تیرے پاس تلوار موجود ہے۔ یہ اس کے قتل کی طرف اشارہ تھا۔“ میں کہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد ”اور تیرے پاس تلوار ہے“ میں غالباً دشمن کی تلوار مراد ہے جو ذوالخلیفہ میں ابوبکر نے اس سے طلب کی تھی، گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اس بات پر برا لگایا تھا کہ اسے جب بھی موقع ملے دشمن کی تلوار لے کر اس کا فیصلہ چکا دے پس یہ دونوں شخص اس کو لے کر نکلے۔ یہاں تک کہ جب ذوالخلیفہ پہنچے تو وہاں اتر کر کھجوریں کھانے لگے اور واقعہ کی رونا میں ہے کہ جب ذوالخلیفہ پہنچے تو ابوبکر مسعد میں داخل ہوئے، دو رکعتیں پڑھیں اور بیٹے کو کھانا شروع کیا اور ان۔

دونوں کو بھی کھانے کی دعوت دی چنانچہ ان کے لئے دسترخوان بچھایا اور سب مل کر کھانے لگے، پس ابوبکر نے ایک شخص سے کہا۔ ابن اسحق کی روایت میں مروی ہے کہ مامری کو کہا اور ابن سعد کی روایت میں ہے کہ

خمس بن جابر کو کہا: واللہ تمہاری تلواری تو بہت ہی عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ اس نے یعنی عامری نے جس کی تلواری تھی تلواریام سے نکال کر کہا: ہاں، اللہ کی قسم! یہ بہت بہترین ہے، میں نے اس کا بار بار تجربہ کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ جیسا کہ
زرقانی میں ہے: کہ میں دن رات اس دھنرج کو اس کے ساتھ ماروں گا۔ ابو بصیر نے کہا: نہ مجھے دکھاؤ، دیکھوں
یہ کیسی ہے؟ اس نے تلواری اس کو پکڑا دی۔ پس ابو بصیر نے اس کو ایسی ماری کہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ وہیں ٹھنڈا ہو گیا
یہ موت سے کنا یہ ہے، کیوں کہ میت کی حرکت سکون سے بدل جاتی ہے، کذا فی الفتح "اور عینی کہتے ہیں کہ برودت موت
کو لازم ہے۔ اور ابن اسحق کی روایت میں ہے کہ: پس ابو بصیر اس پر چڑھ گیا، یہاں تک کہ اس کو قتل کر دیا۔ ابن قیم
بقصر کے فوائد میں لکھتے ہیں "کہ معاہدین نے جب اس کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد اس
ان میں کسی کو قتل کر ڈالا تو وہ مقتول کا ضامن نہیں، نہ دیت کے ساتھ نہ قصاص کے ساتھ۔ اور امام بھی اس کا ضمان
نہیں۔ بلکہ اس کا حکم اس شخص کا ہے جو خود ان کے اپنے علاقہ میں قتل کیا گیا ہو، کیوں کہ اس پر امام کا حکم نافذ نہیں۔
چنانچہ ابو بصیر نے اس کو ذوالحلیفہ میں قتل کیا تھا اگرچہ مینہ کے زیر حکم ہے، مگر وہ اس کو اپنے قبضہ میں لے چکے تھے اور امام کی
ذمہ داری اور اس کے حکم سے نکل چکا تھا۔ اور دوسرا بھاگ گیا۔ اور ابن اسحق کی روایت میں ہے کہ منہم بھاگ نکلا
اور ابن عائد کی روایت میں ہے کہ: "وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف، بائیں کیفیت بھاگا کہ اپنے کپڑے کا نیچے کا حصہ
منہ میں دبا رکھا تھا اور شرم گاہ کا ایک حصہ ننگا ہو رہا تھا اور تیز دوڑنے کی وجہ سے کنکریاں اس کے قدموں کے نیچے
اڑ رہی تھیں اور ابو بصیر اس کے پیچھے آ رہے تھے" حافظہ کی پیروی میں زرقانی میں اسی طرح ہے۔ یہاں تک کہ
دریہ منورہ (زاد اللہ شرفاً و کرامتہ) آیا تو بھاگتے ہوئے مسجد میں داخل ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے
دیکھ کر فرمایا: اس نے تو کوئی خوف کی بات دیکھی ہے۔ جب یہ بھگورٹا غلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا
تو کہا: میرا ساتھی قتل کر دیا گیا اور مجھے بھی قتل کر دیا جائے گا یعنی اگر تم لوگوں نے اس کو نہیں بٹایا۔ اور واقعی
کی روایت میں ہے کہ: "میں تو بچ نکلا ہوں، میں نے اس کا بدلہ نہیں لیا" اور ابوالاسود کی روایت عروہ سے
مروی ہے کہ "انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بصیر کو ان دونوں کے ساتھ واپس کر دیا انہوں نے اس کی منگیں باز نہ
لیں راستہ میں وہ کہیں سو رہے تھے۔ اس نے منہ سے تلواری لے کر ان رسیوں پر پھیری اور منہ صحن کاٹ ڈالی اور ایک
کے تلواری ماری اور دوسرے کی طرف متوجہ ہوا تو وہ بھاگ نکلا۔" مگر پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔ کذا فی الفتح۔ اس میں ابو بصیر
بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا۔ پس عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے آپ
کا ذمہ بری کر دیا قسطلانی کہتے ہیں: قسم محذوف ہے اور جو عبارت ذکر کی گئی ہے۔ یہ قسم محذوف کی مؤکد ہے۔"

حافظ کہتے ہیں: "یعنی میں نے جو کچھ کیا ہے اس سلسلہ میں ان کی جانب سے آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ اور اذہبی نے زہری سے یہ فقرہ بھی روایت کیا ہے کہ: ابوبصیر نے کہا: یا رسول اللہ! میں جانتا تھا کہ قریش کے پاس جاؤں گا تو مجھے دین سے برگشتہ کر دیں گے۔ اس لئے میں نے یہ کچھ کیا اور (معاہدہ تو ان کے اور آپ کے درمیان ہے امیرے اور ان کے درمیان تو کوئی معاہدہ نہیں)۔ آپ تو مجھ ان کی طرف واپس کر ہی چکے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اُن سے نجات دلا دی۔ زندگانی چکھتے ہیں کہ ابن حقیقہ کی روایت میں ہے کہ ابوبصیر مقتول کا سامان لے کر آئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! اس کا خنس لیمے: فرمایا: میں اس کا خنس لے لوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے ان سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کیا، لیکن تو جانے اور تیرے مقتول کا سامان! جہاں جی چاہے چلا جا، چنانچہ اس کے ساتھ جو پانچ مسلمان مکہ سے آئے تھے وہ بھی نکل گئے۔ آٹھ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہ پانچ افراد ابوبصیر کے بعد مدینہ آئے تھے، کیوں کہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوبصیر تنہا آیا تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دو شخصوں کے ساتھ واپس کر دیا جو اس کی طلب میں آئے تھے روایات کے سیاق میں ایک ہے۔ اس لئے مند جب لا روایت میں راوی کا یہ کہنا کہ وہ پانچ آدمی بھی اس کے ساتھ نکل گئے اس سے مراد دوسری مرتبہ مدینہ سے نکلنا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی ماں کی ہلاکت وکیل اہل لام، قطع ہمزہ و کسریم مشدود یہ لفظ اصل میں بدو کا کے لئے ہے۔ مگر یہاں تعجب کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی جنگ کی طرف اس کے اقدام کرنے، جنگ کی طرف جلد بازی کرنے اور جنگ کی آگ بھڑکانے پر تعجب کا اظہار مقصود تھا، اور ایک روایت میں یہ لفظ ہمزہ اور تخفیف کے ساتھ "ولیمہ" مروی ہے، میقول مطلق کی حیثیت سے منصوب یا مبتداء محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور جوہری کہتے ہیں کہ جب یہ مضاف ہو تو صرف نصب ہی طرح جاتا ہے پوری تفصیل معنی میں ہے، یہ جنگ بھڑکانا ہے نہ مسعر حرب"۔ بکسر میم و سکون مہملہ فتح معین مہملہ تیز کی بنا پر منصوب ہے اور ابن اسحق کی روایت میں "معر حرب" کا لفظ ہے اس کے بھی یہی معنی ہیں۔ یعنی وہ کمری جس سے آگ کو حرکت دی جاتی ہے۔ اگر کوئی اس کے لئے ہوتا۔ یعنی اگر کوئی شخص اس کی مدد اور پشت پناہی کرتا۔ کنانی الفتح۔ معنی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ لفظ "اگر" کا جواب محذوف ہے یعنی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس کا کوئی ہونا ہو جو اس کی مدد کرتا اور تائید کرتا" اھ اور میرے نزدیک زیادہ مناسب یہ ہے کہ لفظ "لو" تمنا کے لئے ہے اور ایک روایت میں ہے کہ "لو کان لہ رجال" یعنی کاش کچھ لوگ اس کے ہنوا ہوتے، پس ابوبصیر نے اس تمنا کو سمجھ لیا اور چلا گیا۔ اس میں اس کے فرائض کی طرف اشارہ تھا تاکہ

اسے مشرکوں کی طرف دوبارہ واپس نہ کرنا چاہیے اور لطیف اشارہ اس طرف بھی تھا کہ جن مسلمانوں کو اس کی اطلاع پہنچے وہ اگر اس کے ساتھ بل جائیں۔ جمہور علماء شافعیہ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس کی تصریح صحیح نہیں البتہ تعریض جائز ہے جیسا کہ اس فقہ میں ہوا یہاں تک کہ ابوبصیر سیف البحر پہنچ گئے۔ سیف بکسر مہملہ و سکون تختانیہ اس کے بعد فار۔ ساحل سمندر کو کہتے ہیں اور ابن اسحاق نے اس جگہ کی بھی تصریح کی ہے چنانچہ کہا ہے ”میان تک کہ وہ عمیق بکسر مہملہ و سکون تختانیہ اس کے بعد صا و مہملہ“ پہنچے اور یہ جگہ شام جاتے ہوئے اہل مکہ کے راستے میں تھی ”کذا فی الفتح۔ اور غنیمت میں ہے کہ سیف البحر ایک جگہ ہے جس کو عمیق کہا جاتا ہے ساحل سمندر پر مردہ کی جانب واقع ہے، قریش ملک شام جاتے تھے تو یہ جگہ ان کے راستے میں آتی تھی۔ لہذا حافظ کہتے ہیں کہ یہ ساحل کی جانب مدینہ کے عذات میں واقع ہے اور بنو سلیم کے علاقہ کے قریب ہے۔

الوجہندل کا ابوبصیر سے جا ملنا : راوی کہتے ہیں: ”اذ الوجہندل بن سہیل بھی ان سے یعنی اپنے باپ سے یا اہل مکہ سے چھوٹ کر بھاگ جاتے ہیں۔ یہ وہی الوجہندل ہیں جن کو صلح کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجے سے واپس کیا تھا حافظ کہتے ہیں: اس کو مشاہدہ حال کے ارادہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے مستقبل کے صیغے سے تعبیر کیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ الوجہندل چھوٹ کر ستر مسلمان سواروں کی معیت میں بھاگ نکلے ابوبصیر سے جا ملے۔ پس انہوں نے ذی الرءوہ یہ راوی القری میں ایک بستی ہے۔ کذا فی البحر۔ کے قریب قافلہ قریش کے راستہ پر ڈیرہ لگایا، چنانچہ ان کے قافلہ کو روٹنا شروع کیا۔ کذا فی الفتح۔ زرقانی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ ابوبصیر اپنے رفقاء کو نماز پڑھاتے تھے، جب الوجہندل آئے تو چونکہ وہ قریشی تھے اس لئے امامت کے فرائض ان کے سپرد ہوئے۔ یہاں تک کہ سہ ان کی ایک جماعت وہاں جمع ہو گئی۔ عصا بہ: اس کا کوئی مفرد اس کے لفظوں سے نہیں اور اس کا اطلاق چالیس یا اس سے کم پر ہوتا ہے، اور حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات چالیس سے کہیں زیادہ تھے، چنانچہ ابن اسحق کی روایت میں ہے کہ وہ ستر افراد کے قریب پہنچ گئے تھے اور عروہ نے جزم سے کہا ہے کہ وہ ستر کی تعداد کو پہنچ گئے تھے اور ہسبکی کا خیال ہے کہ وہ تین سو تک پہنچ گئے تھے اور عروہ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ: ”یہ لوگ آگے ابوبصیر سے ملے رہے اور انہوں نے مدت صلح میں مدینہ آنا پسند نہیں کیا اس خیال سے کہ کہیں انہیں مشرکوں کی طرف واپس نہ کر دیا جائے“ زرقانی کہتے ہیں ”فتح الباری میں اسی طرح ہے مگر اس میں یہ بحث کہ سہیل نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی بلکہ اس کے لئے معمر بن الزہری کا حوالہ دیا ہے۔ اور ابن عقیبہ نے بھی اپنی مناسبت میں اسی پر جزم کیا ہے۔ چنانچہ کہا ہے کہ الوجہندل کے ساتھ عمار بن سلم، جبینہ اور دوسرے قبائل کے لوگ جمع ہو گئے تھے یہاں تک کہ تین سو جنگی جوان جو سب مسلمان تھے جمع ہو گئے۔“ اھ پس اس کی قسم! وہ قریش کے کسی قافلہ کی آمد کی خبر نہیں سنئے تھے مگر اس سے ضرور تعرض کرتے

یعنی اس کا دستہ روک لیتے اور آگے جانے سے منع کرتے، پس انہیں قتل کر دیتے اور ان کے اموال پر قبضہ کر لیتے اور ابن اسحق کی روایت میں ہے کہ، جو کافر بھی ہاتھ لگتا اسے قتل کر دیتے اور ان کے پاس سے جو قافلہ گزرا اُسے لوٹ لیتے۔ پس قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھیجا، اور ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے ابوسفیان بن حرب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور نہایت منت و زاری سے درخواست کی کہ ابوجہل اور اس کے رفقاء کو اپنے پاس بلا لیں۔ اور جو شخص ہمارے پاس سے نکل کر آپ کے پاس آئے گا وہ آپ کے لئے بغیر حرج کے حلال ہے۔
 درآن حالیکہ وہ اللہ تعالیٰ کا اور رشتہ قربت کا واسطہ دے رہے تھے۔ یعنی وہ آپ سے کہہ رہے تھے ہم آپ کو اللہ تعالیٰ کا حق قربت کا واسطہ دیتے ہیں کہ آپ اس کو اپنے پاس بلا بھیجیں پس جو شخص بھی آپ کے پاس آئے اس کو امن یعنی اجازت ہے۔ عینی کہتے ہیں کہ لابتندی یعنی لاپہ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش نے کچھ درخواست نہیں کی، مگر اس کے کہ آپ ابولہبیر اور ان کے رفقاء کو پیغام بھیجیں کہ وہ قریش کی ایذا رسانی سے باز رہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف پیغام بھیج دیا کہ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابولہبیر کے نام گرامی نامہ تحریر فرمایا، اور آپ کا نام مبارک اس وقت پہنچا جب کہ ابولہبیر نہج کی حالت میں تھے چنانچہ ان کا انتقال — میں اس وقت ہر واجب آپ کا نام مبارک ان کے ہاتھ میں تھا۔ ابوجہل نے ان کو وہیں دفن کر دیا اور ان کی قبر کے پاس مسجد بنائی۔ اور ابوجہل اپنے رفقاء سمیت مدینہ آگئے، بعد ازاں ہمیشہ وہیں رہا کرتے، میان تک کہ جہاد کے لئے ملک شام گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شہید ہوئے، رادسی کہتے ہیں کہ جب حضرات نے مشورہ دیا تھا کہ ابوجہل کو اس کے باپ کے حوالہ نہ کیا جائے ان کو معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اس چیز سے بہتر تھی جس کو وہ پسند کرتے تھے۔ کہانی النفع۔

اور غمیں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل اور ابولہبیر کے نام تحریر فرمایا کہ وہ دونوں آپ کے پاس مدینہ آجائیں اور ان کے ساتھ جتنے مسلمان ہیں انہیں حکم دیں کہ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں، اور قریش کا کوئی شخص یا قافلہ ان کے پاس سے گزرے تو اس سے تعرض نہ کریں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک ابولہبیر اور ابوجہل کے پاس پہنچا، تو ابولہبیر کا آخری وقت آپ پہنچا، چنانچہ ان کا انتقال ہو گیا تو ابوجہل اپنے چند رفقاء کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور باقی لوگ اپنی اپنی جگہ واپس ہو گئے اور قریش کے قافلوں نے امن و سکون کا سانس لیا اور ابوجہل ہمیشہ آپ کے پاس رہے اور اس کے بعد جتنے فزوات ہوئے ان میں شریک ہوئے اور فتح مکہ میں بھی شریک ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ واپس ہو گئے پس آپ کے پاس مدینہ میں ہے

تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور ان کے والد ماجد سہیل بن عمرو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور خلافت میں رہے، ایک مہینہ رہے اس کے بعد جہاد کے لیے مکہ شام کی طرف نکلے ان کے ہمراہ ان کے صاحبزادے ابوجندل بھی تھے۔ پس باپ بیٹا دونوں جہاد کرتے رہے یہاں تک کہ وہیں ان دونوں کا انتقال ہوا۔ رضی اللہ عنہما۔

حافظ قحطی ابوصیر کے فوات میں کہتے ہیں "غلام مشرک کو حلیہ سے اچانک قتل کر دینا جائز ہے، ابوصیر نے جو کچھ کیا اسے غدر (عہد شکنی) نہیں کہا جاسکتا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے مابین جو معاہدہ ہوا تھا، ابوصیر اس میں داخل نہیں تھا، کیونکہ وہ اس وقت مکہ میں مجبوس تھا، لیکن جب اسے اندیشہ ہوا کہ یہ مشرک اس کو مشرکین کے حوالے کر دے گا تو اس نے اس مشرک کو قتل کر کے اپنی ذات سے اس کے شر کو دفع کیا اور اس حلیہ سے اپنے دین کی مدافعت کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر تیکڑ نہیں فرمائی، اولین اسخ کی روایت میں ہے کہ "سہیل ابن عمرو کو عاصی کے قتل کی اطلاع ہوئی تو اس نے مقتول کی دیت کا مطالبہ کیا کیونکہ وہ اس کے قبیلے کا فرد تھا، مگر ابوسفیان نے اس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس کا مطالبہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ آپ نے تو اپنا عہد پورا کر دیا تھا، اور اس کو تمہارے قاصد کے سپرد کر دیا تھا، اور اس نے آپ کے حکم سے اس کو قتل نہیں کیا، اور ابوصیر کے ذمہ بھی اس کی دیت نہیں کیونکہ وہ مقتول کے دین پر نہیں"۔

اونٹ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے مالک کی شکایت کرنا اور یہ بات منجملہ عبات کے ہوتے کہیں نے اس زمانے میں خواب دیکھا کہ ایک شخص مجھ سے فراتش کرتا ہے کہ میں عمرہ حدیہ کے بیان میں اس اونٹ کا قبضہ بھی ذکر کروں جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مالک کی یہ شکایت کی تھی کہ وہ اس سے کام پورا لیتا ہے مگر اسے بھوکا رکھتا ہے، میں بیدار ہوا تو اس خواب سے حیرت ہوئی، کیونکہ ایک زمانے سے یہ بات دل میں راسخ تھی کہ یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے، اور اونٹ کا مالک ایک انصاری شخص تھا، چنانچہ میں نے اپنے احباب سے اس کی تفتیش کیلئے کہا، مگر کسی کو یہ تصریح نہیں ملی کہ یہ واقعہ حدیہ کا ہے جو عمرہ حدیہ میں پیش آیا ہو، اور میں خود ضعف بصر کی بنا پر تلاش اور تتبع سے معذور تھا، لیکن میرے حاشیہ نڈل میں ملا کہ میں نے اس میں لکھا ہے کہ یہ قبضہ شفاء اور اس کی شرح میں مختلف طرق سے اور مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک قبضہ نہیں چنانچہ شفاء اور اس کی شرح میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹ کی شکایت کرنے اور آپ کو سجدہ کرنے کے کئی واقعات مذکور ہیں، اور مشکوٰۃ میں حضرت یعلیٰ بن مرقہ ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین چیزیں (تین معجزات) دیکھی ہیں ایک یہ کہ ہم ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے کہ ہمارا گنڈر ایک اونٹ کے پاس سے بھڑکے پر پانی لا کر لایا جاتا تھا، پس جب اونٹ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو بلبلایا اور اپنی گردن رکھ دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں ٹھہر گئے اور دریافت فرمایا کہ اس اونٹ کا مالک کہاں ہے؟ وہ حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: "اس کو میرے پاس فروخت کر دو" اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اس کو آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرتے ہیں، اور بات یہ ہے کہ یہ اونٹ ایسے گھر کا ہے جس کے پاس اس کے سوا کوئی اور ذریعہ معاش نہیں" فرمایا: "جب تو نے اس کا یہ قصہ ذکر کیا ہے تو (ہم اس کو تم سے لینا نہیں چاہتے، مگر) اس نے شکایت کی ہے کہ اس سے کام زیادہ لیا جاتا ہے اور چارہ کم دیا جاتا ہے اس لیے (آئندہ اس کو شکایت کا موقع نہ دو) اس کے ساتھ جن سلوک سے پیش آؤ؟ پھر ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک منزل پر اترے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے۔ یہاں ایک رخت کے آنے کا قصہ مذکور ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پھر ہم آگے چلے، پس ایک پانی کے پاس سے گزرے تو ایک عورت آپ کے پاس اپنے بچے کو لاتی جس پر جنات کا اثر تھا" الخ یہ حدیث صاحب مشکوٰۃ نے شرح السنۃ کے حوالہ سے نقل کی ہے اور ابھی تک مجھے اس سفر کی تسعین نہیں ملی۔ اور ملا علی قاری نے اس کی شرح میں صرف یہ لکھا ہے: "تین چیزیں یعنی تین معجزات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دیکھے یعنی ایک ہی سفر میں" مگر سفر کی تسعین نہیں کی اور سیوطی نے الخصائص میں ایک فصل ان معجزات میں ذکر کی ہے جو حجۃ الوداع میں صادر ہوتے، اور ان میں یعلیٰ بن مرقہ کی حدیث بروایت احمد وغیرہ نقل کی ہے، لیکن حدیث میں حج کا ذکر نہیں بلکہ اس کے الفاظ یہ ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کا سفر کیا" الخ اور اس میں سفر حج اور عمرہ دونوں کا احتمال ہے۔ پس اگر اس واقعہ کا سفر عمرہ میں ہونا ثابت ہو تو کوئی مانع نہیں کہ اس کا عمرہ حدیبیہ میں ہونا تسلیم کیا جاتے البتہ اونٹ کو بھڑکانے والے اس کا کام لینے کا واقعہ بظاہر مدینہ میں پیش آیا۔ چنانچہ یہ قصہ ابو داؤد نے کتاب الجہاں میں عبد اللہ بن جعفر سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے پیچھے سوار کیا، پس آپ انصار کے ایک شخص کے باغ میں تشریف لے گئے، وہاں ایک اونٹ تھا، جب اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو بلبلایا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے الخ اس حدیث کے آخر میں

ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مالک سے فرمایا: "اس نے میرے پاس شکایت کی ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو اور ہمیشہ کام پلٹے ہو" پس اس سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ مدینہ منورہ میں پیش آیا۔

تیسری فصل، عمرہ قضا میں

حنفیہ اور ان کے موافقین جن کے نزدیک مخیر کے عمرہ کی قضا واجب ہے ان کے نزدیک یہ عمرہ القضا (مد کے ساتھ) کہلاتا ہے، اور شافعیہ اور ان کے موافقین جن کے نزدیک قضا واجب نہیں ان کے نزدیک یہ عمرہ القضا (بغیر مد کے) اور عمرہ القضیہ کہلاتا ہے، حافظ ابن قیمؒ "المدی" میں کہتے ہیں: "دوم عمرہ قضیہ اس میں اختلاف ہے کہ گزشتہ سال جس عمرہ سے آپؐ روک دیتے گئے یہ اس کی قضا تھی یا یہ مستقل عمرہ تھا؟ اس میں علماء کے دو قول ہیں امام احمدؒ سے دونوں روایتیں مروی ہیں، ایک یہ کہ یہ قضا تھی، اور یہ امام ابو حنیفہؒ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، دوم یہ کہ قضا نہیں تھا اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، جو حضرات کہتے ہیں کہ یہ قضا تھا ان کا استدلال یہ ہے کہ اس کا نام ہی عمرہ القضا ہے اور یہ نام تابع ہے حکم کے۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ یہاں قضا کے معنی بدلہ ادا کرنے کے نہیں بلکہ قضا بمعنی مقاضات یعنی فیصلہ کے ہیں۔ چونکہ اس عمرہ کے ادا کرنے کا اہل مکہ سے فیصلہ ہوا تھا اس لیے اس کو عمرہ القضا اور عمرہ القضیہ کہا گیا" ۱۱

اور اگرچہ جن کا اس کا نام عمرہ القضیہ، عمرہ القضا اور عمرہ القضا ہے، زرقانی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ اس کا نام عمرہ الصلح بھی ہے جو الحاکم نے ذکر کیا ہے اور صاحب جمیس نے اس پر غزوۃ الامن کے نام کا بھی اضافہ کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا نام عمرہ القضا اس لیے ہوا کہ یہ اس عمرہ کی قضا تھی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دیا گیا تھا، اور ابن ہشام کہتے ہیں کہ اس کو عمرہ القضا اس لیے کہتے ہیں کہ کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے روک دیا تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بدلہ لیا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آئندہ سال اسی حرمت کے مہینے (شہر حرام) ذی القعدہ میں کہ تشریف لے گئے تھے میں انھوں نے روکا تھا، موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ ذکر کیا گیا ہے کہ اسی عمرہ کے بار میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "الشہر الحرام بالشہر الحرام والحرمات قصاص"۔

میں کہتا ہوں کہ کون نہیں جانتا کہ اس کا نام عمرہ القضا بہ نسبت دوسرے ناموں کے زیادہ مشہور ہے اور

ابن قیمؒ کا اندر یہی ہے کہ لکنہ کہ جس حضرات کو بیت اللہ سے روکا گیا تھا ان کی تعداد چودہ سو تھی اور یہ سب حضرات عروۃ القیضہ میں آپ کے ساتھ نہیں گئے تھے اور اگر قضا ہوتی تو کوئی ایک بھی پیچھے نہ رہتا یہ کتب سیر کے خلاف ہے چنانچہ تاریخ خمیس میں ہے: "اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ تمام مسلمان (عروۃ قضا کے لئے نکلے جو گذشتہ عہد سے روک دیتے گئے تھے۔ پس جب اہل مکہ نے دُنا تو وہ کچھ دُڑ کر نکل گئے" الاکتائیں اسی طرح ہے اور دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ جب ذی القعدہ کا چاند نظر آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم فرمایا کہ اپنے اس عہد کی قضا کے لئے عہد کریں جس سے ان کو حدیبیہ میں روک دیا گیا تھا، اور جو لوگ حدیبیہ میں شریک ہوتے تھے ان میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے، چنانچہ ان میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہا، بجز ان حضرات کے جو خیبر میں شہید ہو گئے تھے یا جن کا انتقال ہو چکا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکا۔ حدیبیہ کے علاوہ بھی بہت سے لوگ تھے، چنانچہ عروۃ القضا میں دو ہزار افراد تھے۔ اور مواہب میں ہے کہ "حاکم نے" الاکلیل میں کہا ہے کہ اس مضمون کی ولایت متواتر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب ذی القعدہ کا چاند دیکھا تو صحابہ کو حکم فرمایا کہ حدیبیہ میں شریک نہ جس عہد سے روک دیا تھا اس کی قضا کے لئے عہد کریں، اور یہ بھی حکم فرمایا کہ شرکا۔ حدیبیہ میں سے کوئی ایک شخص بھی پیچھے نہ رہے ماسوائے ان لوگوں کے جو خیبر میں شہید ہو چکے ہیں یا جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ زرقانی کہتے ہیں واقعہ کی روایت میں ہے کہ عرب کے کچھ لوگوں نے جو مدینہ میں حاضر تھے عرض کیا یا رسول اللہ! اجدا، نہ تو ہمارے پاس سفر خرچ ہے، نہ کوئی ایسا شخص ہے جو ہمیں کھانا کھلا سکے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور صدقہ کریں اور ان کے ہاتھوں کو ہلاکت سے بچائیں "الحج

مصر کے ذمہ قضا واجب ہے یا نہیں؟ مختصر کے ذمہ ہی اور قضا واجب ہے یا نہیں؟ اس میں ناقلین مایہب کا اختلاف ہے، اور صحیح وہ ہے جو آج میں ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کے تین قول ہیں ایک یہ کہ جس کو (احرام باندھنے کے بعد عہد کے ادا کرنے میں رکاوٹ پیش آجائے۔ اس پر قضا بھی لازم ہے اور ہی بھی یہ امام احمد کی ایک روایت ہے بلکہ ان کی سب سے مشہور روایت یہی ہے۔ اور یہی حنفیہ کا مسلک ہے کہ اس کے ذمہ قضا اور ہی لازم ہے۔ اور بعض لوگوں نے حنفیہ سے جو نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک اس شخص کے ذمہ ہی لازم نہیں یہ غلط ہے، جو ان کی کتب فقہ کے خلاف ہے دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے ذمہ قضا تو واجب نہیں مگر ہی لازم ہے، یہ امام شافعی کا قول ہے اور امام احمد کی ایک روایت ہے تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے ذمہ قضا واجب ہے نہ ہی۔ یہ امام احمد سے ایک روایت۔ اور امام مالک کا صحیح مذہب بھی یہی ہے۔ البتہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر ہی ساتھ لایا

ہو تو اس کو ذبح کرنے کا احکام

عمرة القضا کے لیے روانگی: حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیمہ سے واپس تھے تو (مختلف اطراف کو) سرایا بھیجا اور خود مدینہ طیبہ میں تشریف فرما رہے، یہاں تک کہ جب ذوالقعدہ کا چاند ہوا تو لوگوں میں (عمرة قضا کے لیے) نکلنے کا اعلان فرمایا: ”اھ اور سیرت ابن ہشام میں ہے کہ:“ پ۔ ابن اسحاق نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیمہ سے مدینہ کی طرف مراجعت فرما چکے تھے، تو ربیع الاول سے سوال تک مدینہ میں اقامت پذیر رہے اور اس دوران حضرت صحابہؓ کے مختلف دستے جہاد کے لیے بھیجتے رہے، پھر ذوالقعدہ میں عمرة قضا کے لیے نکلے، اسی مہینے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین نے روکا تھا، میں کہتا ہوں پس جب ذوالقعدہ کے روز کا چاند ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرة قضا کے لیے روانہ ہوئے۔ اور لوگوں میں روانگی کا اعلان فرمایا، جیسا کہ قبیلہ کے حوالے سے پہلے گزر چکا ہے۔ اور حکم فرمایا کہ جو لوگ پہلے مدینہ میں شریک ہوئے تھے ان میں سے کوئی شخص بھی پیچھے نہ رہے چنانچہ ان میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہا، سوائے ان کے جو خیمہ میں شہید ہو چکے تھے یا جن کا اشتغال ہو چکا تھا جیسا کہ الاکلیل اور رئیس کے حوالے سے گزر چکا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عورتوں اور بچوں کے علاوہ دو ہزار مسلمان نکلے جیسا کہ زرقانی میں ہے۔ اور اس کو فاطمہؓ نے امام حاکم کی الاکلیل سے بھی نقل کیا ہے، اور تاریخ خمیس کے حوالے سے بھی یہی مضمون درگزر چکا ہے۔ اور مدینہ طیبہ زادہ اللہ تبارک و تعالیٰ میں ابوہریرہؓ (بعض راویوں نے) کلثوم بن حصین الغضاری کو جو مشہور صحابی ہیں اپنا جانشین بنایا اور بقول ابن ہشام عوف بن الاضبط (منا بعد اود طامسہ کی تھی) لیلیٰ کو اور بلذری نے کہا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو جانشین بنایا، اور بقول بعض عوف کو، جو عوف کا مصغر ہے اور اس کو فاطمہ کے بھائی تھے تاتے تاتے مثلثہ کے ساتھ عوفیت بھی کہا جاتا ہے۔ زرقانی میں اس طرح ہے اور تاریخ خمیس میں ابوہریرہؓ کا اور قاموس میں عوف بن الاضبط کا جانشین بناؤ گور ہے۔

حضرت ناجیہؓ کو ہدی کا نگران مقرر کرنا: اور اپنے ساتھ ہدی کے باٹھ اونٹ بٹکاتے۔ زرقانی اور تاریخ خمیس میں اسی طرح ہے، اور حافظ ابن کثیرؒ نے واقعہ کی سند سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہدی پر ناجیہ بن جندب اسلمی کو مقرر کیا تھا، وہ ہدی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے درختوں میں چراتے جاتے تھے، اور ان کے ساتھ نبواً سلم کے چار جوان اور تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرة القضا میں قربانی کے باٹھ اونٹ اپنے ساتھ لیے تھے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے ہدی کے جانوروں کو قلا دے پہناتے۔ اور اپنی ہدی

پر ناجیم بن جندل اسلمی کو مقرر کیا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے دختوں میں چراتے جا رہے تھے ان کے ساتھ بنو اسلم کے چار جوان تھے، اس کو وادی نے روایت کیا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہتھیار، زبریں، خودیں اور نیزے اور سو گھوڑے بھی اپنے ساتھ لیے۔ پس جب ذوالحلیف پہنچے تو گھوڑے آگے بھیج دیتے اور محمد بن مسلمہ انصاری کو ان پر نگران مقرر فرمایا، اور مذکورہ بالا ہتھیار بھی آگے بھیج دیتے، اور بشیر بن سعد کو۔ اور ایک روایت میں ہے کہ عاصم کو ان کی نگرانی پر مامور فرمایا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! آپ نے ہتھیار بھی ساتھ اٹھاتے حالانکہ ان کی شرط یہ تھی کہ آپ مکہ میں ہتھیاروں کے ساتھ داخل نہیں ہوں گے، مگر پیام میں بند لوہار کے جو مسافر کا ہتھیار ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ان کو حرم میں نہیں لے جاتیں گے بلکہ وہ حرم کے قریب ہیں گے، خدا نخواستہ ان کی طرف سے کوئی شرارت ہوتی تو ہتھیار ہمارے کمر تو ہوں گے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بابِ سجد سے احرام باندھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فروع کا راستہ اختیار فرمایا تھا، اگر نہ ہوتا تو بیاد سے احرام باندھتے، اس کو وادی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، اور محب طبری نے اس کو حضرت جابر سے بغیر حوالہ کسی کتاب کے ذکر کیا ہے، زرقانی میں اسی طرح ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں نے بلیہ پڑھا اور محمد بن مسلمہ گھوڑے لے کر مرانظہران جا پہنچے جو قریب مکہ میں ایک اُدی ہے، وہاں قریش کے چند آدمیوں سے ملاقات ہوئی، انھوں نے گھوڑے ساتھ لانے کا سبب پوچھا یہ بولے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل صبح سویرے یہاں آیا چاہتے ہیں، یہ لوگ قریش کے پاس گئے اور انہیں اس قصہ سے آگاہ کیا، وہ گھبرا گئے اور بولے واللہ! ہم نے تو کوئی نئی حرکت نہیں کی، ہم تو اپنی تحریر اور معاہدے کی مدت پر قائم ہیں پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو لے کر ہم پر کیوں چڑھائی کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مکہ زمانہ ایک شخص کو قریش کے چند لوگوں کے ہمراہ بھیجا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بطنِ یاجج میں صحابہ کے ہمراہ تشریف فرما تھے اور بدی کے جانور اور ہتھیار بھی یہاں پہنچ گئے تھے ان لوگوں نے میان آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور عرض کیا: آپ نے بچپن سے آج تک کبھی معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اب آپ حرم میں اپنی قوم پر ہتھیاروں سمیت داخل ہوں گے؟ حالانکہ آپ نے ان سے شرط کر رکھی ہے کہ آپ صرف مسافر کے ہتھیار کے ساتھ داخل ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان پر ہتھیار لے کر داخل نہیں ہوں گا۔ یہ سن کر بدر بولا: آپ اسی نیکی اور دفاءِ عہد کے ساتھ

معروف ہیں: پھر وہ اپنے رفقاء کے ساتھ واپس ہوا اور اہل کتب سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو شرط تم لوگوں سے مل کر رکھی ہے وہ اس پر قائم ہیں: یہ قعدہ واقدی نے روایت کیا ہے (نزدقانی میں اسی طرح ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرا نظر ان میں فروکش ہوتے یہ کہ کے قریب ایک وادی ہے۔ اور تاجریج نہیں میں ہے کہ مرا نظر ان کو وادی فر بھی کہا جاتا ہے: اور بکری کے قول کے مطابق وادی تراور کہ کے امین ۲۶ میل کا فاصلہ ہے اور بعض نے ۱۸ میل اور بعض نے ۲۱ میل ذکر کیا ہے (ثغاف الغرام) اور مرا نظر ان سے موضع سرف تک سات میل ہے اور سرف سے مکہ تک چھ میل ہے: اھ اور کہ اور سرف کے باہر مہافت میں چند اقوال ہیں جو حجۃ الوداع میں گذر چکے ہیں، اور ہتھیار اپنے آگے بطن یا حج میں بھیج دیتے۔ یا حج یا تھمانی، پھر ہنزہ ساکنہ، پھر دو جیم، اور پہلی جیم پتینوں حرکتیں صحیح ہیں۔ یہ مکہ کے قریب ایک جگہ ہے جو مکہ سے آٹھ میل ہے، اور یہاں سے حدود حرم کے نشان نظر آتے ہیں۔ اور اوس بن خولی (بفتح خا تے محمد وفتح واو) الانصاری الخزرجی کو دو سو رفقاء کی معیت میں ان کی ٹکرائی پر ماور فرما کر ان کو پیچھے چھوڑ کر کہ تشریف لے گئے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ پھر (جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ عمرہ سے فارغ ہوتے تو) اتنبہری اور آدمی ان کی جگہ بھیج دیے، یہاں تک کہ سب حضرات نے عمرہ کے مناسک ادا کر لیے: اور الخمیس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف، نحر اور حلق سے فراغت کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چند صحابہ کو حکم فرمایا کہ وہ اسلحہ کی حفاظت کے لیے بطن یا حج میں ٹھہریں، اور ذکر لوگ جواب تک اس مہم پر ماور تھے) اگر مناسک عمرہ ادا کر لیں، چنانچہ صحابہ نے یہی کیا: مواہب لبت میں اسی طرح ہے۔

موضع سرف میں حضرت میمونہ سے نکاح کرنا: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ سے موضع سرف میں بحالت احرام نکاح کیا اور الخمیس میں ہے کہ حضرت ابو عبیدہ کہتے ہیں: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خیبر سے فارغ ہوتے تو بقصد عمرہ عازم مکہ ہوتے، اور جعفر بن ابی طالب صلی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حبشہ سے آتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کی طرف پیغام نکاح دے کر پہلے بھیج دیا۔ حضرت میمونہ کی ماں شریک بہن اسماء بنت عیسیٰ حضرت جعفر کے نکاح میں تھیں۔ پس حضرت میمونہ نے اپنا معاملہ حضرت عباس کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے حضرت میمونہ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ اور اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم

احرام کی حالت میں تھے۔ اور آپ کی جانب سے ان کو چار سو درہم مہر ادا کیا گیا۔ اھ اس کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے یافو الخلیفہ سے روانہ کیا تھا مگر یہ اس بار سے میں مزید نہیں اور حافظ ابن قیمؒ نے کہا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بطن باججہ پہنچے تو سارا سامان وہاں رکھ دیا، اور جعفر بن ابی طالب کو حضرت میمونہؓ کی طرف نکاح کا پیغام دے کر روانہ کیا، انہوں نے پیغام پہنچایا تو حضرت میمونہؓ نے اپنا معاملہ حضرت عباسؓ کے سپرد کر دیا، اور انہوں نے حضرت میمونہؓ کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ اھ اور ابن کثیر نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ نیز الحمیس میں ہے کہ ان کے نکاح کے قصہ میں یہ بھی مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرۃ القضاء کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مقام جعفر میں ملاقات کی۔ اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میمونہ بنت حارث بیوہ ہو گئیں ہیں، کیا آپ کو ان سے نکاح کی رغبت ہے؟ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت احرام ان سے نکاح کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت جعفر کو حضرت میمونہؓ کے پاس بھیجے اور حضرت عباسؓ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نکاح کی سفارش کرنے کے مابین تعارض نہیں کیونکہ بظاہر حضرت عباسؓ کی درخواست کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کو حضرت میمونہؓ کے پاس نکاح کا پیغام دے کر بھیجا اس پر انہوں نے اپنا معاملہ حضرت عباسؓ کے سپرد کر دیا۔ اور حضرت عباسؓ نے ان کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کرادیا۔

میں کہتا ہوں کہ امام مالکؒ نے موطا میں سلیمان بن یازر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قادم البواغ کو انصار کے ایک شخص کی معیت میں روانہ کیا، ان دونوں نے حضرت میمونہؓ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک مدینہ میں ہی تشریف فرما تھے، اور سفر کا آغاز نہیں فرمایا تھا، گزشتہ دونوں قول یعنی حضرت جعفر کو بھیجا، اور حضرت عباسؓ کا نکاح کی درخواست کرنا ان دونوں کے درمیان اور موطا امام مالکؒ کی روایت کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ان دونوں صاحبوں کو حضرت میمونہؓ کی راستے دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا، پھر حضرت عباسؓ نے جعفرؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکورہ بالا درخواست کی تو آپ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو بھیجا، انہوں نے اپنا معاملہ حضرت عباسؓ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا تو

انھوں نے مقام سرف میں ان کا نکاح کیا۔

اور یہاں ایک مشہور طویل الذیل فقہی بحث ہے کہ محرم کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟ بدل اور اوہ جزو غیرہ شروع بحالت احرام نکاح کرنے کا حکم

حدیث میں اس پر بہت تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ محرم کا نکاح اتم ثلاثہ کے نزدیک صحیح نہیں۔ اگر اس نے نکاح کیا تو وہ باطل ہوگا۔ اور حضرات حنفیہ اور ان کے موافقین کے نزدیک جائز ہے، اور اس باب میں جو ممانعت وارد ہے وہ کراہت متفریغی پر محمول ہے۔ اس لیے کہ وہ خلاف اولیٰ ہے کیونکہ یہ وقت اہم ترین عبادت میں مشغول ہونے اور ظاہر اور باطن کے ساتھ حق تعالیٰ کے سامنے کھڑے رہنے کا ہے۔ اور حضرت میمونہؓ سے نکاح کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بیان جواز کے لیے تھا، اور کسی فعل کو، باوجود کراہت کے، بیان جواز کی خاطر کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اجر عظیم کا موجب تھا۔ جیسا کہ علماء کے ہاں معروف ہے۔ اور فریقین کے دلائل اور وجوہ ترجیح کی تفصیل بدل میں ہے، اس مختصر میں اس کی گنجائش نہیں۔ اور شیخ المشائخ گنگوہیؒ قدس سرہ نے کوکب میں اس پر بہت ہی عمدہ کلام کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں: "اتم ثلاثہ کا یہ مذہب کہ نکاح باطل ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح فعل سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ اور اس کے برعکس ایک روایت میں جو آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہؓ سے اس وقت نکاح کیا جبکہ آپ احرام کی حالت میں نہیں تھے" یہ یا تو غلط ہے یا مجاز پر محمول ہے کہ نکاح سے مراد مقاربت لی جاتی ہے کیونکہ تمام مورخین اور محدثین اس امر پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کب جاتے ہوئے موضع ہرب میں یہ نکاح کیا تھا۔ اب کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احرام کے بغیر مکہ تشریف لے گئے تھے، جب سب کا اتفاق ہے کہ نکاح موضع سرف میں ہوا اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مکہ جا رہے تھے، تو اندرین صورت یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت عدم احرام نکاح کیا ہو؟ اس مقام کے لطائف میں سے یہ ہے کہ اسی جگہ حضرت میمونہؓ کا نکاح ہوا اور مکہ سے واپسی پر اسی جگہ ان کی رخصتی عمل میں آئی۔ اور بالآخر ایک سفر میں اسی جگہ ان کا وصال ہوا۔ اھ

میں کہتا ہوں کہ ان تینوں امور کا عجائبات میں سے شمار کیا جانا، جیسا کہ اہل تاریخ کو مسلم ہے، اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ یہ تینوں واقعات تین الگ الگ اسفار میں پیش آتے ہوں۔ اور اگر نکاح اور رخصتی ایک ہی سفر میں ہوتی ہو تو اس میں کچھ بھی غرابت اور تعجب انگیزات نہیں۔ نیز کتب تاریخ

اس پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں رخصتی کا قصد فرمایا تھا اور اہل مکہ کو ولیمہ کی دعوت دی تھی۔ مگر انھوں نے قبول نہیں کی۔ تو کیا نکاح سے قبل ہی ولیمہ کا قصد فرمایا تھا، چنانچہ حافظ ابن قیمؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تین دن رہے، جب چوتھے دن کی صبح ہوئی تو سہل اور حویطب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آئے اور حویطب نے بلند آواز سے پکار کر کہا کہ ابھی تک تم ہماری زمین سے نہیں نکلے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”میں نے تمہارے یہاں کی ایک خاتون سے نکاح کیا ہے، اگر میں اس کی رخصتی تک ٹھہروں تو تمہارا کیا حرج ہے۔“ ہم کھانا تیار کریں گے ہم بھی کھائیں گے اور تم بھی ہمارے ساتھ کھاؤ گے“ اس پر انھوں نے کہا ہم آپ کو اللہ تعالیٰ کا اور معاہدہ کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں“ پورا قبضہ آگے آتا ہے۔ اور یہ پورا قبضہ ابن ہشام نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے۔ اور امام طحاوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت احرام حضرت یثرب سے نکاح کیا، پھر مکہ میں تین روز قیام پذیر رہے اور تیسرے دن حویطب قریش کے چند افراد کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ آپ کی معیاد ختم ہو چکی، اس لیے یہاں سے نکل جاتیے“ الخ

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناقہ و ہوا پر سوار ہوئے اور مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف تلواریں جھانکے ہوئے تلبیہ پڑھ رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں داخل ہونا اور کفار کا مکہ چھوڑ کر باہر نکل جانا اور کفار قریش یعنی ان کے اکابر و اشراف خدا اور رسول سے عداوت کی بنا کہ چھوڑ کر پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف نکل گئے۔ انہیں اس بات پر یار لے صبر نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو طواف کرتے دیکھ سکیں اور ایک روایت میں ہے کہ وہ نفرت اور کبر کی بنا پر باہر نکل گئے کیونکہ انھیں غلطو عداوت کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا گوارا نہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے اونٹ آگے بھیج دیتے اور انھیں مکہ کے قریب وادی طوی میں رکھا گیا تاکہ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) عہدہ سے فارغ ہوں تو ان کو نحر کے لیے لایا جاتے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ثنیۃ کداسے (مکہ میں) داخل ہوتے کداسے: بفتح اول و د کے ساتھ۔ وہ گھاٹی جو نخجہ پر چڑھتی ہے اور نخجہ: بفتح جاتے مہملہ۔ وضم جیم، اور واو اور نون کے ساتھ۔ مکہ میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اور حجة الوداع

میں گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج اور عمرہ میں کد آسے داخل ہوتے تھے۔

عبداللہ بن رواحہ کے اشعار | اور عبداللہ بن رواحہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
اوٹنی کی مہارت تمام رکھی تھی۔ اور ایک روایت میں ہے

کہ وہ آپ کی رکاب تھامے ہوتے تھے۔ ممکن ہے کہ بھی ہمارے پڑتے ہوں اور کبھی کاب تھام لیتے ہوں
اور کبھی آپ کے آگے آگے چلتے ہوں۔ اور لوہار حمال کہتے یہ زجر یہ شعر پڑھ رہے تھے

خلو ابی الکفار عن سبیلہ الیوم فصر بکم علی تنزیلہ

من ربنا یزیل الہام عن مقلہ ویذہل الخلیل عن خلیلہ

(ترجمہ)، اسے کافروں کی اولاد! آپ کا راستہ چھوڑ دو، آج اس (قرآن کی) تنزیل پر ہم تمہیں ماریں گے۔

اور ایسا ماریں گے کہ سترین سے جدا ہو جائیں گے، اور دوست و ستوں کو بھول جائیں گے۔

ابن رواحہ کے اشعار کے سلسلہ میں مختلف روایات وارد ہیں، جیسا کہ انجیس میں ہے اور حافظانے

یہ اشعار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف بیت اللہ کے وقت ذکر کرتے ہیں۔ یہ اشعار سن کر حضرت

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اے ابن رواحہ! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور اللہ تعالیٰ

کے حرم میں شعر پڑھتے ہو؟“ زرقانی کہتے ہیں: یعنی ان اشعار سے اعداء کا غصہ بھڑک جاتے تو حرم میں

قتال کی نوبت آسکتی ہے یا یہ مطلب تھا کہ اس موقع پر شعر خوانی اس کمال ادب کے منافی ہے، جس

کے ہم عادی ہیں، خصوصاً عبادت کی حالت میں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے

فرمایا: ”اے عمر! ان کو چھوڑ دو، کیونکہ یہ اشعار کفار کے لیے تیروں کی بارش سے بھی زیادہ تکلیف دہ

ہیں“ اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے ابن رواحہ! پڑھو:

”لا الہ الا اللہ وحدہ“ اور ”عز وجلہ“، ”ہم الاحزاب وحدہ“۔ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے،

اسی نے اپنے بندے کی مدد فرمائی، اور اپنے لشکر کو عزت بخشی، اور جماعتوں کو تنہا شکست دی)۔

چنانچہ ابن رواحہ نے یہ کلمات کہے اور ان کے ساتھ مسلمانوں نے بھی یہ کلمات کہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں اس امر پر تنبیہ ضروری ہے کہ امام ترمذی اور نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے

روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ القضاء میں مکہ میں داخل ہوتے، اور عبداللہ بن رواحہ

آپ کے آگے یہ شعر پڑھتے جا رہے تھے: خلوا ابی الکفار عن سبیلہ الخیر حضرت عمرؓ نے

ان سے کہا کہ اے ابن رواحہ! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور اللہ تعالیٰ کے حرم میں شہرکتے ہو؟ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! ان کو کہنے دو۔ کیونکہ یہ شعر کافروں میں تیروں کی بارش سے بھی زیادہ اثر انداز ہیں۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس سند سے صحیح ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضا میں مکہ میں داخل ہوتے۔ اور کعب بن مالک آپ کے آگے آگے تھے، اور بعض علماء حدیث کے نزدیک یہ دوسری حدیث زیادہ صحیح ہے،

کیونکہ عبد اللہ بن رواحہ جنگ موتہ میں شہید ہوئے اور عمرۃ القضا اس کے بعد ہوئی۔ اھ

امام ترمذی کا یہ کہنا کہ عمرۃ القضا غزوہ موتہ کے بعد ہوئی، وہم ہے۔ کیونکہ عمرۃ القضا مکہ میں ہوئی اور غزوہ موتہ شہ میں۔ جیسا کہ معروف ہے، حافظ ابن حجر کہتے ہیں: یہ ذہول شدید اور غلط مردود ہے۔ میں نہیں جانتا کہ امام ترمذی، وفود معرفت کے باوجود اس غلطی میں کیسے جا پڑے، عمرۃ القضا میں حضرت جعفر، حضرت علیؑ اور زید بن حارثہ کا حضرت حمزہ کی صاحبزادی کے بارے میں جھگڑنا ایک معروف واقعہ ہے جیسا کہ آگے آئے گا، اور حضرت جعفر، حضرت زید اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ ایک ہی عمرہ میں شہید ہوئے۔ آخر امام ترمذی پر ایسی چیز کیسے مخفی رہ گئی؟ بعد ازاں مجھے بعض لوگوں کی یہ تحریر ملی کہ ترمذی میں حضرت انسؓ کی حدیث کے ذیل میں یہ لکھا ہے کہ ”یہ واقعہ فتح مکہ کا ہے“ اگر یہ صحیح ہو تو امام ترمذی کا اعتراض بجا ہے، لیکن ترمذی کے راوی کو رخصی کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو نسخہ موجود ہے اس میں یہی عبارت ہے جو اوپر گذر چکی ہے۔ واللہ اعلم۔ اھ میں کہتا ہوں کہ بعض لوگوں سے حافظ کی مروا غالباً حافظ ابن قیم ہیں۔

کیونکہ انھوں نے انسؓ میں کہا ہے کہ ”ترمذی وغیرہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح کے دن مکہ میں داخل ہوئے۔ درآئیکہ عبد اللہ بن رواحہ آپ کے آگے آگے یہ شعر پڑھ رہے تھے،

خَلَّوْا بَنِي الْكُفَّارِ عَنْ سَبِيلِهِمْ
مگر یہ وہم ہے کیونکہ ابن رواحہ مکہ کے فتح ہونے سے چار ماہ قبل جنگ موتہ میں شہید ہو چکے تھے، وہاں آپ کے سامنے ابن رواحہ کے شعر پڑھے جاتے تھے۔ اور یہ الیٰہی حقیقت ہے جس میں اہل نقل کا کوئی اختلاف نہیں۔ اھ اور کوکب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت عمرؓ کے انکار کی وجہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر بلیہ کہتے رہے یہاں تک کہ آپ نے اپنی چھڑی کے ساتھ رکن یعنی حجر اسود کا استلام کیا۔ درآئیکہ آپ نے اپنے کپڑے سے اضطباع کر رکھا تھا۔ (اضطباع کے معنی یہ ہیں کہ چادر کو داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر اس کے دونوں پٹے بائیں

کندھے پر آگے پیچھے نکالیے جاتیں) ابن قیم کہتے ہیں کہ آپ نے صحابہ کو حکم فرمایا کہ اپنے کندھے پر ہنہ رکھیں اور طواف میں تیز چلیں، تاکہ مشرکین کے سامنے ان کی قوت و طاقت کا مظاہرہ ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر ممکن طریقہ سے ان کو مرعوب کرنے کی تدبیر کیا کرتے تھے۔ اور آپ نے اپنی اونٹنی پر طواف کیا جیسا کہ ابن سعد اور واقفی نے ذکر کیا ہے، اور ان دونوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آپ کو کوئی عذر نہیں تھا۔ اور ابن اسحاق وغیرہ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدل طواف کیا، تین پھیروں میں تیز چلے اور باقی پھیروں میں اپنی متاد رفتار سے چلے۔ اور مسلمان آپ کے ساتھ پیدل طواف کرتے تھے، زرقانی کہتے ہیں: "اور ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کیا اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ عمرہ کیا، پس جب آپ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے طواف کیا اور ہم نے آپ کے ساتھ طواف کیا، اور آپ صفا و مروہ پر آتے تو ہم بھی آپ کے ساتھ آتے۔ اور ہم آپ کو اہل مکہ سے چھپاتے رکھتے تھے کہ کہیں کوئی شخص آپ پر تیر نہ پھینکے" اور ایک روایت میں ہے کہ ہم آپ کو مشرکوں اور مشرکوں کے لڑکوں سے بچا رہے تھے کہ کہیں آپ کو ایذا نہ دیں۔ دو دنوں روایتیں بخاری میں ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جب آپ مکہ تشریف لاتے اور عمرہ القضاء میں بیت اللہ کا طواف کیا تو ہم آپ کو احمقوں اور بچوں سے بچا رہے تھے کہ مباد آپ کو تکلیف پہنچائیں" اھ۔

در آنجا ایک انھوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اضطباع کر رکھا تھا (اضطباع کی تفسیر اوپر گند چکی ہے) اور انھوں نے رمل کیا۔ رمل اور اضطباع کی بحث جزو حجۃ الوداع میں گذر چکی ہے، پس اہل مکہ مروہ، حوٹین اور بکعہ کھڑے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو طواف کرتے دیکھ رہے تھے۔

اور حقیقت میں بروایت بخاری حضرت ابن عباسؓ سے نقل
زل کا سبب اور اس کی ابتداء کیا ہے کہ مشرکین نے لگا کر یہ لوگ تمہارے پاس آ رہے

ہیں ان کو شرب کے بخار نے لاغر کر رکھا ہے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ پہلے تین پھیروں میں زل کریں اور رکن یمانی اور حجر اسود کے مابین متاد رفتار سے چلیں، اور تمام پھیروں میں زل کا حکم دینے سے کوئی چیز مانع نہیں تھی بجز اس کے کہ آپ ان پر شفقت کرتے ہوئے ان کی رعایت فرما چاہتے تھے اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: زل کرو تاکہ مشرکین تمہاری قوت کا مشاہدہ کریں اور مشرکین جبل قیقان کی جانب کھڑے تھے: اور اسد الغابہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے اضطباع اور

زُکُل کیا، اور یہ اسلام میں سب سے پہلا زُکُل اور اضطباع تھا، اور اکتھائیں بنے کہ قریش نے باہم چمکیا کیا کیں، جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ عشرت و مشقت اور سختی میں ہیں، پس وہ دار الندوة کے پاس صف باندھ کر بیٹھ گئے تاکہ آپ کو اور آپ کے صحابہ کو دیکھیں۔ پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوتے تو اپنی ردا سے مبارک کے ساتھ اضطباع کیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرماتے جو آج ان کافروں کے سامنے اپنی قوت کا مظاہرہ کرے۔ پھر آپ نے حجر اسود کا استلام کیا اور دوڑتے ہوئے نکلے اور حضرات صحابہ نے بھی آپ کے ساتھ دوڑ لگائی (یعنی زُکُل کیا) یہاں تک جب آپ اُن سے بیت اللہ کی آڑ میں آتے اور رکن یمانی کا استلام کیا تو معتاد رفتار سے چلے، اور حجر اسود کا استلام کرنے کے بعد پھر زُکُل کیا، تین پھیرے اسی طرح پورے کئے، اور باقی پھیروں میں عام رفتار سے چلے، فقط

میں کتا ہوں کہ امام بخاری، امام مسلم اور امام ابو داؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ آئندہ الفاظ ابو داؤد کے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ آتے تو صحابہ کرام خیر ب کے بخار کی وجہ سے لاغر تھے۔ پس مشرکوں نے کہا کہ تمہارے یہاں ایسے لوگ آ رہے ہیں جن کو بخار نے لاغر کر رکھا ہے۔ اور انہوں نے اس سے سخت تکلف اٹھائی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی گفتگو سے مطلع فرمایا، پس آپ نے ان کو حکم دیا کہ وہ تین پھیروں میں زُکُل کریں اور رکن یمانی اور رکن اسود کے درمیان عام رفتار سے چلیں، پس جب مکہ کے لوگوں نے ان کو زُکُل کرتے دیکھا تو کہنے لگے کیا یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم کہتے تھے کہ ان کو بخار نے کمزور کر رکھا ہے؟ یہ لوگ تو ہم سے بھی زیادہ قوی اور مضبوط ہیں۔ الخ اور ایک روایت میں ہے کہ قریش کہتے تھے کہ یہ تو ہرنوں جیسے ہیں۔

زرقانی کہتے ہیں کہ امام احمد نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمرہ میں "مرانظران" میں اتارے تو آپ کے صحابہ کو خبر ہوئی کہ قریش ان کے صنف کے افسانے بیان کر رہے ہیں، پس انہوں نے کہا کہ اگر ہم اپنی سواریوں کو ذبح کر کے ان کا گوشت کھاتیں اور شور باپتیں تو کل جب ان لوگوں کے یہاں جاتیں گے تو تازہ دم ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہ کرو بلکہ اپنے توشے جمع کر کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ انہوں نے جمع کر کے دسترخوان بچھاتے اور غائب کھایا اور کچھ کھانا باقی بچ رہا تو ہر ایک نے اپنے توشہ دان میں بھر لیا، اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی گفتگو سے مطلع کر دیا۔ پس آپ نے ان کو حکم دیا کہ نزل کریں۔ الحج“
 پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر صفا اور مروہ کے درمیان طواف کیا یعنی سعی کی، سعی کو طواف
 کہنا حق تعالیٰ کے ارشاد ان یطوف بہما کی اقتدار کی بنا پر ہے۔ پہلے گڈر چکا ہے کہ ہدی کے جانور ذبی
 طویٰ میں چھوڑے گئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف وسیعی سے فارغ ہونے تک وہ آپ کے
 حکم سے نرؤذ کے پاس لاتے جا چکے تھے۔ چنانچہ آپ جب سعی کے ساتویں پھیرے سے فارغ ہوئے تو فرمایا:
 یہ عمر کی جگہ اور مکہ کا ہر گلی کوچہ منہر ہے۔“ پھر آپ نے ان ساتھ اونٹوں کو جو ساتھ لاتے تھے نرؤذ کے پاس منہر
 کیا اور اسی جگہ حلق کرایا۔ صاحب امتناع نے ذکر کیا ہے کہ معمر بن عبد اللہ العدوی نے آپ کا حلق کیا تھا۔ یہی
 عمل مسلمانوں نے کیا، واقعہ یہی کہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ ان لوگوں نے بھی عمرہ کیا تھا جو حدیبیہ میں شریک نہیں
 تھے۔ مگر انھوں نے عمرہ نہیں کیا، اور جو لوگ حدیبیہ میں شریک تھے اور عمرہ القضاء کے لئے بھی آئے انھوں نے
 ہدی میں اشتراک کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شو صحابہ کو ان کے طواف وسیعی سے فارغ
 ہونے کے بعد حکم فرمایا کہ وہ بطن یا حج“ چلے جائیں اور اسلحہ کی نگرانی کریں۔ اور دوسرے لوگ جو وہاں ہیں
 اور انھوں نے ابھی تک مناسک ادا نہیں کئے وہ آکر مناسک ادا کریں۔ چنانچہ آپ کے ارشاد کی تعمیل
 کی گئی۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی شرط کی مطابق مکہ میں تین دن رہے، اور اس عمرہ القضاء میں کعبہ کے اندر داخل نہیں ہوئے۔ زرقانی کہتے ہیں کہ امام	عمرہ القضاء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے اندر داخل نہیں ہوئے
--	---

بخاری کی روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن ابی اوفی سے دریافت کیا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ
 القضاء کے سال کعبہ میں داخل ہوئے، فرمایا: نہیں“ اور واقعہ یہی کہ روایت ہے کہ انھوں نے کہا: آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ القضاء میں کعبہ کے اندر نہیں گئے۔ آپ نے ان کو پیغام بھیج کر اجازت طلب کی تھی۔
 مگر انھوں نے یہ بات کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ آپ کی شرطیں یہ بات داخل نہیں تھی؟

حضرت بلال کا کعبہ کی چھت پر
 اذان کہنا فتح مکہ کا واقعہ ہے
 کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ القضاء میں جب طواف
 پورا کیا تو بیت اللہ کے اندر داخل ہوئے۔ پس وہیں رہے۔ یہاں تک حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کعبہ پر چڑھ کر ظہر کی اذان کہی "الحديث اور اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ عکرمہ، صفوان اور خالد بن اسید (بروزن امیر) نے اس امر پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کے باپ مرچکے ہیں اور انھوں نے اس غلام کو کعبہ کی چھت پر (معاذ اللہ) گدھے کی طرح آواز نکالتے نہیں دیکھا " مگر یہ روایت وہم ہے، چنانچہ ابو ایمیلى، ابن ابی شیبہ، ابن ہشام اور خود بخوٹی نے دوسری سند سے اور دیگر حضرات نے متعدد طرق سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کعبہ تشریف میں داخل ہوا اور حضرت بلالؓ کا اس کی چھت پر اذان کہنا فتح مکہ کا واقعہ ہے۔ اور بعض نے تصریح کی ہے کہ یہی شہور ہے، اور واقعی کسی روایت میں منفرد ہو تو بھی قابل احتجاج نہیں ہے جانتے کہ وہ دوسروں کے خلاف روایت نقل کرے، بالخصوص صحیح بخاری کی روایت کے خلاف؟ " اھ

اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں کہا ہے کہ "یہ سنی نے بطریق واقعی اسی طرح ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت اللہ میں داخل ہونا عمرہ القضاء کا واقعہ ہے مگر مشہور ہے کہ یہ فتح مکہ کے سال ہوا۔ واللہ اعلم " اھ اور جزر حجتہ الوداع میں گند چکا ہے کہ عمرہ القضاء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کعبہ میں داخل نہ ہونا اجماعی ہے۔ اور صحیح بخاری میں عبد اللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کیا، پس بیت اللہ کا طواف کیا۔ اور مقام ابراہیم (علیہ السلام) کے پیچھے دو رکعتیں پڑھیں، اور آپ کے ساتھ وہ لوگ تھے جو آپ کو لوگوں سے (بچانے کے لیے) پردہ کر رہے تھے، پس ایک شخص سلطان سے عبد اللہ بن ابی اوفیٰ سے کہا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے؟ فرمایا: "نہیں" اور شیخ لا مفع فرماتے ہیں: "یہ عمرہ القضاء کا واقعہ ہے اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کے اندر نماز نہیں پڑھی، کیونکہ اس کے اندر جو تصاویر آویزاں تھیں، ان کے ہٹانے اور مٹانے کی قدرت نہ تھی، اور ان کی موجودگی میں داخل ہونا جائز نہ تھا۔ اور اس میں اس بات پر دلائل ہے کہ مقامات مبارک میں جب کسی نوع کا کفر و شرک ہوتا ہو تو ان کی زیارت کو ترک کر دینا چاہیے " اھ اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ شیخ کا یہ ارشاد کہ "یہ عمرہ القضاء کا قبضہ ہے" یہی واقعہ ہے، نووی کہتے ہیں کہ علمائے کما ہے کہ آنحضرت کے ترک دخول کا سبب یہ تھا کہ بیت اللہ میں اصنام و تصاویر تھیں، اور مشرکین آپ کو ان کی تغیر کی اجازت نہیں دے سکتے تھے، پھر فتح مکہ کے موقع پر آپ نے تصاویر کو ہٹانے کا حکم فرمایا بعد ازاں بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے، جیسا کہ بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے۔ پس خیب جو تھا دن

ہوا، اور خمیس میں ہے کہ جب چوتھے دن ظہر کا وقت ہوا تو سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبد العزیٰ آپ کے پاس آئے اور کہا: آپ کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ لہذا یہاں سے تشریف لے جاتے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ اپنے صاحب سے کہیے کہ ہمارے یہاں سے نکل جائیں۔ کیونکہ مدت ختم ہو چکی۔ اس کے بعد صاحب خمیس کہتے ہیں: ”پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھے دن کی صبح کی تو سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبد العزیٰ آپ کے پاس آئے“ ان کا یہ بیان گذشتہ بیان کے خلاف ہے کہ وہ چوتھے دن کی ظہر کی وقت آتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی مجلس میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ پس حویطب نے پیچ کر کہا: ہم آپ کو اللہ تعالیٰ اور معاہدہ (حدیبیہ) کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ آپ ہماری سرزمین سے نکل جائیں۔ کہتین دن گذر چکے ہیں: پس سعد نے کہا: تو غلط کہتا ہے۔ تیری ماں درہے۔ یہ تیری زمین ہے نہ میرے باپ کی، واللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف اپنی خوشی سے جائیں گے“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے فرمایا: اے سعد! ان لوگوں کو جو ہمارے ڈیرے میں ہماری ملاقات کو آتے ہیں، اذامت دو“ زرقانی کہتے ہیں کہ یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تین دن رہے۔ اس روایت کے منافی نہیں جو عروہ سے مروی ہے کہ جب چوتھے دن ظہر کا وقت ہوا تو سہیل آپ کے پاس آیا۔ الحج: چنانچہ حافظ، فتح میں کہتے ہیں کہ غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ میں تشریف آوری دن کے نصف اول میں ہوتی ہوگی۔ اور کل وقت ملا کہ چوتھے دن اسی وقت تین دن پورے ہوئے، جس وقت کہ آپ مکہ میں داخل ہوتے تھے۔ اور سہیل اور حویطب قرینا اسی وقت آکر آپ سے مستدعی ہوئے کہ آپ تشریف لے جائیں“ اھ

آنحضرتؐ کا مکہ میں زلف اور ولیمہ زرقانی کہتے ہیں کہ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ قریش نے حویطب کو آپ کے مکہ سے نکلنے پر مامور کیا تھا، چنانچہ اس نے کارادہ کرنا اور اہل مکہ کا انکار کرنا کہا: یہاں سے نکل جاؤ، آپ نے فرمایا: تمہارا کیا حرج ہے اگر تم مجھے رہنے کی اجازت دو تاکہ میں تمہارے یہاں رہ کر رخصتی کی رسم انجام دوں۔ اور ہم کھانا پکائیں۔ اس میں تم لوگ بھی شرکت کرو، انہوں نے کہا ہمیں آپ کے کھانے کی حاجت نہیں، پس یہاں سے چلے جاتے“ اور خمیس میں ہے کہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عروہ سے فارغ ہو کر تین

دن کہیں رہے، اہل مکہ سے تین ہی دن کی ٹرٹ ٹھہری تھی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو (کفار کے پاس یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ اگر تم چاہو تو تمہارے پاس تین دن اور رہو اور اپنی اہلیہ سے زنا ف کروں۔ اور تمہیں ولیمہ کھلاؤں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عروس سے پہلے حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تھا، اور ابھی رخصتی نہیں ہوتی تھی۔ مگر اہل مکہ نے کہا: ”ہمیں آپ کے ولیعہ کی مزدورت نہیں، بس یہاں سے نکل جاتے“ اس روایت سے ان لوگوں کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ آپؐ نے احرام کی حالت میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تھا۔ اور حافظ ابن قیمؒ اور ضیاء بن عقیبہ کے الفاظ ابن کثیرؒ کی نقل کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حویطب کے مخاطبہ کا ذکر کرنے کے بعد یہ ہیں: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حویطب اور سیل کو اواز دے کر فرمایا: میں نے تمہارے یہاں کی ایک خاتون سے نکاح کیا ہے۔ اس میں تمہارا کیا نقصان ہے کہ میں کچھ وقت مزید ٹھہرون یہاں تک کہ اس سے زنا ف کروں، اور ہم کھانا تیار کریں گے، تم بھی ہمارے ساتھ مل کر کھاؤ گے۔ پس انھوں نے کہا: ہم آپؐ کو اللہ تعالیٰ اور معاہدہ کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ آپؐ فوراً نکل جاتیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو رافعؓ کو حکم دیا اور انھوں نے ابطح سے کوچ کا اعلان کر دیا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے کسی مکان میں نہیں ٹھہرتے تھے۔

زرقانی کہتے ہیں: ”واقعی کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ کا قیام ابطح میں رہا۔ کسی مکان میں نہیں ٹھہرتے تھے، بلکہ ابطح میں آپؐ کے لیے چمڑے کا خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ آپؐ مکہ سے واپسی تک اسی میں رہے، اور مکہ کے کسی مکان کی چھت کی نیچے نہیں گئے۔ اور طبقات میں کوچ کے اعلان کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ ”شام تک کوئی مسلمان یہاں مکہ میں نہ رہے۔“

مدینہ واپسی اور حضرت حمزہؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اوسنی پر سوار ہوتے، اور حضرت

حمزہؓ کی صاحبزادی آپؐ کے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ زرقانی نے اس بچی کے نام میں سات قول نقل کر کے حافظہ کے حوالہ سے کہا ہے:

کہ اس کا مشہور نام آمار ہے۔ زرقانی نے حافظہ سے اسی طرح نقل کیا ہے لیکن فتح الباری کے جو نسخے ہمارے پاس ہیں ان میں یہ ہے کہ ”حمزہؓ کی صاحبزادی کا نام عمارہ یا فاطمہ یا آمار یا امہ اللہ یا سلی ہے، اور اول ہی مشہور ہے۔“ یہ بچی آپؐ کو چچا چچا کہہ کر پکار رہی تھی، حافظہ کہتے ہیں کہ غالباً اس نے تعظیم کی بنا پر آپؐ کو چچا کہا ہو گا۔ ورنہ آپؐ اس کے چچا زاد بھائی ہوتے ہیں، پس حضرت علیؓ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اٹھایا۔ شیخ بذلؒ میں

فرماتے ہیں کہ اس روایت کا یہ بیان کہ حضرت علیؑ نے اس کو لے لیا۔ اس حدیث کے خلاف ہے جو پہلے گزر چکی ہے یعنی ابو داؤد میں کہ حضرت زید بن حارثہؓ کہتے ہیں کہ حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کو لاتے : الخ دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ کمرے تو سب سے پہلے زید بن حارثہ لاتے تھے اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حافظ نے مغازی سلیمانؒ قبی سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے اہل خانہ کی طرف واپس آتے تو حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کو پایا، اس سے دریافت کیا تو کیسے آتی؟ اس نے کہا آپ کے اہل میں سے ایک شخص مجھے لے گیا ہے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ میں پہنچی تو لوگوں میں گھومنے لگی اور آپؐ پر نظر پڑی تو یاعلم یا علمؑ کہتی ہوئی آپ کے پیچھے چل پڑی۔ پس حضرت علیؑ نے اس کو اٹھالیا اور حضرت فاطمہؓ کے ہودج میں سوار کر دیا۔ اس کی تائید حافظ کے قول سے ہوتی ہے وہ کہتے ہیں کہ ابن سعد کی روایت میں بسند صحیح مروی ہے اس آئینہ میں کہ وہ لوگوں میں گھوم رہی تھی کہ حضرت علیؑ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے حضرت فاطمہ کے سپرد کر دیا۔ ابھی مختصر آ۔ اور حضرت فاطمہ سے فرمایا کہ لے اپنی چھاپاؤں بہن کو کچھ۔ اور حاکم کی روایت میں ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہ سے فرمایا جب کہ وہ اپنے ہودج میں سوار تھیں، اس کو اپنے پاس رکھ۔ پس حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اسے اپنے ساتھ سوار کر لیا۔

اس سچی کی کفالت میں تنازعہ | پھر حضرت علیؑ، حضرت زید، حضرت جعفر رضی اللہ عنہم کا اس کی کفالت میں جھگڑا ہوا، اور یہ تنازعہ مدینہ آنے کے بعد ہوا تھا، جیسا کہ مسند

احمد اور حاکم میں حضرت علیؑ کی حدیث سے واضح ہے۔ اور مغازی ابوالاسود میں عروہ سے مروی ہے کہ جب مدینہ کے قریب پہنچے تو زیدؓ نے اس کے بارے میں آپ سے بات کی اور زیدؓ، حضرت حمزہؓ کے وصی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ موافقات کی رو سے ان کے بھائی تھے یہ روایت اس امر کے مثانی نہیں کہ خلافت مدینہ میں ہوئی ہو، غالباً حضرت زیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں درخواست کی ہوگی، اور نماز عمت بعد میں ہوتی ہوگی؟ (کنانی زرقانی)

شیخ بدل میں فرماتے ہیں کہ محل خصوصیت میں اختلاف ہے۔ حافظ نے فتح میں کہا ہے کہ نوکر کیا گیا ہے کہ حضرت علیؑ، حضرت جعفرؓ اور حضرت زیدؓ کی خلافت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں "مراظرہ ان پہنچنے کے بعد ہوئی۔ بعد ازاں حافظ کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ان کی خصوصیت مدینہ آنے کے بعد ہوئی یہ مسند احمد اور حاکم میں حضرت علیؑ کی روایت سے ہے۔ اور مغازی ابوالاسود میں ہے کہ "زیہاں وہی گزشتہ بالا عبادت

ہے جو زنیانی کے حوالہ سے نقل کی گئی) اس کے بعد شیخ فرماتے ہیں : میں کتا ہوں اگر پہلا قول صحیح اور محفوظ ہو کہ خصوصاً تراثر ان پینچے کے بعد ہوتی تب بھی ان دونوں قولوں کے درمیان مخالفت نہیں، کیونکہ ممکن ہے منازعت پہلے مرانظر ان میں ہوتی ہو جب کہ حضرت علیؓ نے اس کو لے کر حضرت فاطمہؓ کے حوالے کیا، کیونکہ یہ منازعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچی، پھر مدینہ پہنچنے سے پہلے حضرت زینبؓ نے آپؐ سے گفتگو کی، پھر مدینہ آنے کے بعد یہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش ہوا اور اس وقت آپؐ نے فیصلہ فرمایا :

خالد ان کی مثل ہے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ جعفر کے حق میں فرمایا کیونکہ ان کی بیوی اسما بنت عمیسؓ اس بچی کی خالہ تھیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خالد بنسزلہ ان کے بہنے ہیں کتا ہوں کہ مسئلہ حضانت مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ جس کی تفصیل مطولات میں اور آد جز کی کتاب الاقصیہ میں تفصیل سے ذکر کی گئی ہے اور اس کا خلاصہ میرے حاشیہ ثبیل میں ہے۔ اور حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں : اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان باپ کے بعد خالد حضانت میں تمام اقدار سے مقدم ہے : آگے چل کر کہتے ہیں اس قصہ میں ان حضرات کے قول کی دلیل ہے جو خالد کو چھو بھی پر اور ان کی قرابت کو باپ کی قرابت پر ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچی کا فیصلہ اس کی خالہ کے حق میں فرمایا، جب کہ اس کی چھو بھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اس وقت موجود تھیں۔ اور یہ امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے اور یہی ایک روایت امام احمدؒ سے مروی ہے اور ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ چھو بھی خالد سے مقدم ہے اور یہی روایت ہمارے شیخ (حافظ ابن تیمیہؒ) کی مختار ہے۔ اسی طرح باپ کے رشتہ کی عورتیں ان کے رشتہ کی عورتوں سے مقدم ہیں کیونکہ بچے کی ولایت باپ کا حق ہے۔ اور ان کو محض بچے کی مصلحت سے مقدم کیا گیا، کہ ان میں کمال تربیت اور محبت و شفقت ہوا کرتی ہے۔ اور عورتیں پرورش کا کام مردوں کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے سکتی ہیں۔ الخ :-

موضع سرف میں حضرت میمونہؓ کی شخصیت - اور وفات پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام سرف پہنچے تو پڑاؤ کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیتؓ کو چھوڑ گئے تھے تاکہ وہ حضرت میمونہؓ کو لے کر آئیں چنانچہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ہمراہیوں کے آنے تک آپؐ یہاں ٹھہرے، اور ان لوگوں کو مشرکین کے سفہا اور پرہیزگاروں سے اذی اور مشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ کذا فی البدی :-

پس حضرت میمونہ سے یہاں زفاف کیا اور خمیس میں پہنچے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اور ضابطہ آخری خاتون
 ہیں جو حریم نبوت میں آئیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اثبات التومنین میں سب سے آخر میں ان کا انتقال
 ہوا۔ مگر ان کے سن وفات میں چند اقوال ہیں: "زفانی کہتے ہیں: سن اکیادہ گن میں ان کی وفات ہوئی" اور حافظ
 نے الامام میں ان کے سن وفات میں بہت سا اختلاف ذکر کیا ہے، اور وہ خود اس طرف مائل ہیں کہ ان کی وفات
 کے بعد حضرت عائشہ زندہ رہیں، اور خمیس میں پہنچے کہ یہ کہیں بیمار ہو تیں تو فرمایا کہ مجھے مکہ سے لے چلو کیونکہ رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا تھا کہ میں یہاں نہیں مروں گی، چنانچہ ان کو مکہ سے اٹھالتے، جب موضع سرف پہنچے
 تو اس درخت کے نیچے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شب زفاف میں قبہ نصب کرایا تھا، ان کو
 رکھ دیا، اسی جگہ ان کا وصال ہوا اور اسی جگہ ان کی قبر ہے: "ابو حافظ ابن قیم کہتے ہیں: پھر آنحضرت صلی اللہ
 علیہ وسلم موضع سرف سے رات کے آخری حصہ میں روانہ ہوئے، اور منزل بمنزل چلے یہاں تک کہ مدینہ منورہ آباد
 شرفا کرنا پہنچے: "وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم لیما کثیرا کثیرا۔"

چوتھی فصل، عمرہ جعرانہ میں

جعرانہ کا ضبط حرکات اور محل وقوع | ”جعرانہ“ بکسر جیم و سکون عین مہملہ و تخفیف راء۔ اور بکسر عین و تشدید راء۔ اور اجز میں اس کی حرکات کے ضبط پر فصل لکھا ہے۔ اور اس میں ہے کہ یا قوت حموی کہتے ہیں: ”جیم کے کسرہ پر تو اجماع ہے مگر اصحاب حدیث اس کی عین پر کسرہ اور راء پر تشدید پڑھتے ہیں۔ یہ مکہ اور طائف کے درمیان ایک کنواں ہے، جو مکہ سے قریب تر ہے، یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد اور کئی کنوئیں قریب قریب ہیں۔ اور یہ مکہ سے ایک برید کے فاصلہ پر عراق کے راستہ میں واقع ہے۔“ اور باجی کہتے ہیں کہ اس کے اور مکہ کے باہن اٹھارہ میل کا فاصلہ ہے۔“

فتح مکہ کیلئے روانگی کا سبب | عمرہ حدیبیہ کے بیان میں گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار قریش نے اس شرط پر صلح کی تھی کہ دونوں فریقوں کے باہن دس سال تک لڑائی موقوف رہے گی۔ مگر قریش اپنی شرط پر قائم نہیں رہے بلکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلفاء بنو خزاعہ کے مقابلہ میں بنو نضالہ کی غنیہ مدد کی، اس کے نتیجہ میں بنو خزاعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد کی درخواست کی، اور یہ صلح حدیبیہ کے ٹھیک بائیس مہینے بعد شعبان ۶ کا واقعہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ دس رمضان کو مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۲۰ رمضان کو مکہ فتح ہوا۔ پس آپ وہاں پندرہ راتیں یا اس سے زیادہ مقیم رہے اور اس مدت میں مختلف اطراف کی جانب چھوٹے چھوٹے دستے (سرایا) بھیجتے رہے۔

غزوہ حنین کے لیے روانگی | بعد ازاں شوال کی دس تاریخ کو اہل مدینہ کا بارہ ہزار کا لشکر لے کر حنین کی طرف روانہ ہوئے مسلمانوں کو پہلے تو خود پسندی اور اپنی کثرت پر ناز کرنے کی وجہ سے ظاہری شکست کا ابتلا پیش آیا۔ مگر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے انہیں غلبہ نصیب ہوا۔ چھ ہزار قیدی، چوبیس ہزار ادنٹ، چالیس ہزار سے زیادہ بھیڑ بکری اور چار ہزار اوقیہ چاندی غنیمت میں ہاتھ آئی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لے گئے۔ اور اٹھارہ دن تک ان کا محاصرہ کئے رکھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جعرانہ کی جانب) مراجعت فرما ہوئے۔ کذا فی الجمع

جعران میں مال غنیمت کی تقسیم | اور غنیمت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحناء پھر قرن المنازل پھر
نخلہ سے گزرتے ہوئے واپس لوٹے یہاں تک کہ جعران آنکھلے۔“ اور اسی میں ہے: ”پس ۵ ذی قعدہ کو جعران
آپنچے۔ وہاں تیرہ دن قیام رہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف جاتے ہوئے حکم فرما گئے تھے کہ جنگ
حنین میں حاصل شدہ قیدیوں اور مال غنیمت کو جمع کیا جائے چنانچہ ساری چیزیں جعران میں جمع کر دی گئیں
تھیں“ اور اسی جگہ مال غنیمت تقسیم فرمایا، چنانچہ امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ سے یہ حدیث
نقل کی ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جعران سے عمرہ کیا، جہاں آپ نے حنین کا مال غنیمت تقسیم
فرمایا تھا۔“

وفد ہوازن کی آمد | اور لامع کی کتاب الجلبہ کے حاشیہ میں ہے کہ حافظ کہتے ہیں کہ موسیٰ بن عقبہ کی
منازی میں یہ قصہ پوری تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: ”پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
شوال میں طائف سے جعران واپس ہوئے اور یہاں بنو ہوازن کے قیدی جمع تھے۔ ہوازن کا وفد آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بغرض اسلام حاضر ہوا۔ چنانچہ یہ لوگ اسلام اور بیعت سے مشرف ہوئے
پھر آپ سے اپنے قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں گفتگو کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”مال اللہ
قیدی سب تقسیم کئے جا چکے ہیں۔ لیکن میں تمہاری خاطر ان کی واپسی کا مطالبہ کر دوں گا۔ مگر دونوں چیزوں میں
سے کس کی واپسی تمہیں زیادہ محبوب ہے۔ قیدیوں کی؟ یا مال کی؟ (بس ایک چیز واپس کی جاسکتی
ہے)۔ انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے ہمیں مال اور حسب میں سے ایک چیز کا اختیار
دیا ہے۔ حسب ہمیں زیادہ محبوب ہے۔ (یعنی مال کے بجائے قیدی واپس کئے جائیں)۔ فرمایا: ”جی ہاں
کے حصہ کے قیدی تو تمہارے رہے اور دوسرے مسلمانوں سے تمہاری خاطر گفتگو کروں گا۔“
یہاں پورا قصہ تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے اور اس کے آخر میں ہے: ”پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ارشاد فرمایا: ”میں نے تمہارے انتظار میں قیدیوں کی تقسیم میں تاخیر کی تھی۔ مگر تم نے آنے میں تاخیر کی“
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیدیوں کو تقسیم کئے بغیر چھوڑ کر طائف تشریف لے گئے تھے۔ کئی دن طائف
کا محاصرہ رہا، پھر وہاں سے جعران واپس ہوئے، پھر وہاں اموال غنیمت تقسیم کئے۔ اس کے بعد
ہوازن کا وفد آیا۔“

نر فانی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس دن سے زائد تک جعران میں بنو ہوازن کا انتظار

فرماتے رہے کہ وہ مسلمان ہو کر آئیں گے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔ اور جبرانہ وہ جگہ ہے جہاں طائف اور مکہ سے مدینہ جانے کے دونوں راستے جمع ہوتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرانہ میں جنین کے اموال غنیمت تقسیم فرمائے تھے۔

زرقانی کہتے ہیں کہ اہل مغاری نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت کو حکم فرمایا کہ لوگوں کو جمع کیا جائے اور مال غنیمت لایا جائے۔ پھر آپ نے لوگوں میں مال غنیمت تقسیم کیا، چنانچہ ہر شخص کا حصہ چار اونٹ اور چالیس بکریاں لگا۔ پھر آپ نے وہاں سے عمرہ کیا اور صاحب غنیمت کہتے ہیں: ”پھر آپ جبرانہ سے عمرہ کے لیے نکلے، اور باقی ماندہ ”فے“ کے بارے میں حکم فرمایا کہ اسے مرا غلظہ ان کی جانب بمنہ نامی جگہ پر رکھا جائے“ پھر عمرہ سے فراغت کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ”پھر واپس مدینہ کی طرف روانگی ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی ماندہ ”فے“ کو ساق لیا“ اور اس بات کو ابن ہشام نے ابن اسحاق سے بھی نقل کیا ہے۔

عمرہ جبرانہ کا احرام باندھنا | اور امام ابو داؤد نے عرش کعبی سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جبرانہ میں داخل ہوئے۔ پس وہاں جو مسجد تھی اس کی طرف آئے۔ پس جتنی رکعتیں اللہ کو منظور تھیں ادا کیں۔ پھر عمرہ کا احرام باندھا۔ واقعہ یہی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بندہ کو احرام باندھا تھا جب کہ ذیقعدہ کی بارہ راتیں باقی تھیں۔ کذا فی التلخیص اور ابن قیم کہتے ہیں: ”عمرہ جبرانہ اول ذی قعدہ میں ہوا۔ عینی کہتے ہیں: ”یسرا عمرہ“ عمرہ جبرانہ ہے، اور یہ بھی ذیقعدہ میں ہوا۔ یہ عمرہ بن زبیر اور موسیٰ بن عقبہ وغیرہ کا قول ہے اور واقعہ یہی ہی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں کہا ہے کہ عمرہ جبرانہ شوال میں ہوا۔ عتب طبری کہتے ہیں کہ جہاں تک مجھے علم ہے یہ بات ابن حبان کے سوا کسی نے نہیں کہی اور مشہور یہ ہے کہ ذی قعدہ میں ہوا“ کذا فی الادجز۔

عمرہ شوال کا مصداق | اور اجز ہی میں ایک جگہ شوال کے عمرہ پر مفصل بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ابن قیم کہتے ہیں: ”اگر یہ بات محفوظ ہو تو غالباً یہ عمرہ جبرانہ کا واقعہ ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شوال میں نکلے تھے اور احرام ذیقعدہ میں باندھا تھا“ اور ابن حاتم نے فتح میں اور قسطلانی نے شرح بخاری میں بھی اسی پر حزم کیا ہے چنانچہ وہ دونوں کہتے ہیں: ”اس میں اختلاف نہیں

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ کے عمرے چار سے زائد نہیں تھے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان کی تعیین کر دی ہے اور ان کو شمار کر کے بتا دیا ہے۔ ان میں غیر ذی قعدہ کے کسی عمرے کا ذکر نہیں بجز اس عمرے کے جو آپ نے حج کے ساتھ کیا تھا۔ پس جہاں تطبیق ممکن ہو تعارض دور کرنے کے لیے تطبیق دینا ضروری ہے، اور جہاں تطبیق ممکن نہ ہو وہاں اصح و اثبت کے مقتضی پر حکم کیا جاتا ہے۔ اور یہاں عمرہ جہازہ مراد لیکر تطبیق ممکن ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حنین کی طرف شوال میں نکلے تھے اور عمرہ کا احرام ذیقعدہ میں باندھا تھا۔ لہذا قرب کی وجہ ہجازاً شوال کا مہینہ کہلایا، اور اس تطبیق کی ضرورت جب ہے۔ جبکہ شوال کا عمرہ صحیح اور محفوظ روایت سے مروی ہو۔ ورنہ جو ثابت ہے وہی قابل اعتماد ہے۔“

ادجز میں اس پر تفصیل سے لکھا ہے کہ محققین کے نزدیک عمرہ شوال کا محل عمرہ جہازہ ہے۔ اور ادجز میں یہ بھی ہے کہ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جہازہ سے یہ احرام باندھنا متعدد وجوہ کے لیے محتمل ہے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کو ہی مقصد بنا کر اس کا ارادہ کیا ہو۔ کیونکہ آپ اس وقت ان علاقوں سے مدینہ منورہ کی طرف مراجعت کرنے والے تھے، اس لئے ارادہ فرمایا کہ اس وقت آپ کا آخری عمل عمرہ ہو۔ اس صورت میں آپ کے اس فعل میں اس امر کی دلیل ہے کہ جو شخص داخل میقات ہو اور وچ یا عمرہ کا ارادہ کرے تو اس کے احرام باندھنے کی جگہ وہی مقام ہے، جہاں وہ موجود ہو، چنانچہ حدیث میں ہے کہ جو شخص میقات کے اندر ہو۔ پس وہ جہاں سے حج یا عمرہ کا قصد کرے وہی جگہ اس کے لیے میقات ہے۔“

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ مدینہ کی طرف واپسی کا وقت تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد اہل مکہ کے حالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس صورت میں آپ احرام کے بغیر بھی مکہ میں داخل ہو سکتے تھے۔ لیکن عمرہ کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے احرام باندھا اور خود عمرہ مقصود نہیں تھا ان کے علاوہ اور وجوہ بھی محتمل ہیں۔

پس رات کو مکہ میں داخل ہوئے اور راتوں رات طواف اور سعی کی اور مزدہ کے پاس عمرہ کا احرام کھولا۔ صاحب خمیس کہتے ہیں کہ: ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کیا اور سعی کی اور اپنے سر کا حلق کرایا۔ حلق کرنے والے کا نام ابوہند ہے۔“

حضرت معاویہؓ کی حدیث کا مصداق | اور شارح حدیث کے یہاں معروف یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کی یہ حدیث کہ: ”میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کا قصر کیا، مروہ کے پاس تیر کے پر سے کے ساتھ“ اس کا محل عمرہ جعرانہ ہے جیسا کہ جزر حجۃ الوداع میں گزر چکا۔ اور بخاری کے حاشیہ میں ہے کہ نوویؒ کہتے ہیں: ”اور یہ حدیث اس پر محمول ہے کہ انہوں نے (یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے) عمرہ جعرانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر کیا تھا۔ کیونکہ حجۃ الوداع میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن تھا اور یہ ثابت ہے کہ منیٰ میں آپؐ نے حلق کر لیا۔ اور عمرہ القضاء پر محمول کرنا اس بنا پر صحیح نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ وہ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے یہی مشہور ہے“ الخ

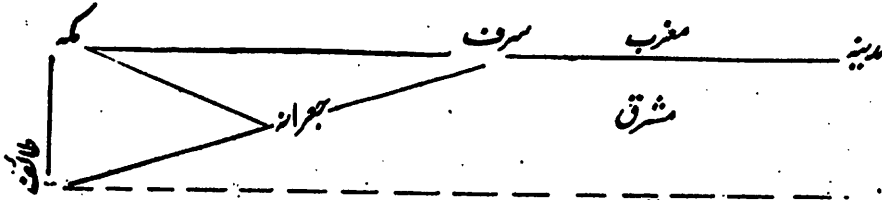
راتوں رات جعرانہ واپس آنا | پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات ہی کو جعرانہ واپس آ گئے، چنانچہ جعرانہ میں اسی طرح صبح کی گویا رات یہیں رہے تھے۔ تمام روایات میں صبح روایت یہی ہے اس کے برعکس البوداؤد میں جو آیا ہے کہ ”آپؐ نے مکہ میں صبح کی گویا رات یہیں رہے تھے“ یہ وہم ہے جیسا کہ شیخؒ نے بذل میں کہا ہے کہ ”صحیح وہ ہے جو ترمذی، نسائی اور احمد وغیرہ کی روایت میں ہے کہ ٹیس جعرانہ میں صبح کی مثل رات یہاں رہنے والے کے“

جعرانہ سے مدینہ کی طرف واپسی | پس جب اگلے دن زوال آفتاب ہوا، بظاہر بدھ کا دن مراد ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدھ کی رات احرام باندھا تھا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، تو اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور بطن سرف کا رخ کیا۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے راستہ سے جا ملے۔ یا یہ مراد ہے کہ وہ راستہ، جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آ رہے تھے، راہ مدینہ سے آ ملا اور یہ بطن سرف ہے (جو جامع الطرق کہلاتا ہے) کیونکہ مکہ اور جعرانہ سے جو راستہ مدینہ جاتے ہیں۔ وہ دونوں یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔

جامع الطرق طریق المدینہ کی بحث | میں کہتا ہوں کہ اس لفظ میں روایات کا اختلاف ہے۔ یہاں جو لفظ ذکر کیا گیا یہ البوداؤد کا لفظ ہے، اور یہ زیادہ واضح ہے اور نسائی اور مسند احمد وغیرہ کا لفظ ہے: ”جامع الطرق طریق المدینہ“ (یہاں تک کہ جمع ہو گیا راستہ راہ مدینہ کے ساتھ) یعنی جس راستہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ سے تشریف لا رہے تھے وہ مدینہ کے راستہ کے ساتھ جمع ہو

گیا، اس روایت میں الطریق کا لفظ فاعل اور طریق مدینہ کا لفظ مفعول ہے اور ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں:
 ”خروجی بطن سرف حتیٰ جاع الطریق طریق جمع بطن سرف“ (آپ آنکھ بطن سرف
 میں، یہاں تک کہ اس راستہ کے ساتھ وہ راستہ آملاجس نے بطن سرف میں (حرین کے راستہ کو) جمع
 کر رکھا تھا۔)

ادیشہ کو کب میں فرماتے ہیں: ”سرف ایک وسیع و عریض جگہ ہے جس میں مکہ اور جمرانہ سے مدینہ کو
 جانے والے دونوں راستے جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر راوی نے یہ کہا، ”یہاں تک آیا اس راستے کے
 ساتھ“ اور اس راستہ سے مراد جمرانہ کا راستہ ہے جس سے آنحضرت تشریف لارہے تھے، اور لفظ
 طریق جاد کا فاعل ہے۔ اور جمع بطن سرف اس کی صفت ہے اور جمع کا مفعول شاید محذوف ہے
 یعنی طریق الحرین (یعنی جس نے جمع کیا تھا بطن سرف میں حرین کے راستہ کو) پس دریافت کیا جائے
 اور اس کا نقشہ جو میں نے ۱۳۵۱ھ میں کوکب کے حاشیہ میں دیا تھا حسب ذیل ہے۔



عقاب بن اسید کو گورنر بنا کر مدینہ واپس آنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے
 آئے اور آنے سے پہلے حضرت عقاب بن اسید کو مکہ کا گورنر مقرر کیا اور ان کے ساتھ معاذ بن جبل کو
 اور واقعہ سی اور حاکم نے ابو موسیٰ کے نام کا بھی اضافہ کیا ہے کہ یہ دونوں لوگوں کو قرآن اور فقہ فی الدین
 کی تعلیم دیں۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقاب کو مکہ کا حاکم مقرر کیا تو
 یومیہ ایک درہم ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ انہوں نے خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ اس شخص کا پیٹ
 ہمیشہ بھوکا رکھے جو ایک درہم کے باوجود بھوکا رہتا ہے۔“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لئے
 ایک درہم یومیہ کا وظیفہ مقرر فرمایا ہے۔ اب مجھے کسی کی حاجت نہیں“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 دو مہینے سولہ دن مدینہ سے باہر رہنے کے بعد اس وقت مدینہ میں تشریف لائے جب کہ فقیہہ کی
 تین راتیں باقی تھیں۔ اور ابن ہشام نے کہا کہ چھ راتیں باقی تھیں اور حافظ فتح میں فرماتے ہیں کہ غیر حاضر
 کی مدت اسی دن سے زیادہ تھی۔ واللہ اعلم۔ کذا فی الزرقانی۔

حضرت ابن عمر کا عمرہ جعرانہ سے انکار | اور یہاں اس امر پر تہیہ فرمادی ہے کہ یہ عمرہ جعرانہ اصحابِ مغازی و سیر مثلاً عروہ ابن زبیر، موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن حبان اور واقعہ آبی و قزو نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے آزاد کردہ غلام حضرت نافع نے اس سے انکار کیا ہے؛ چنانچہ امام بخاری نے بطریق آیوب نافع سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے عمرہ نہیں کیا اور اگر کیا ہوتا تو عبد اللہ (بن عمر رضی اللہ عنہ) پر مخفی نہ رہتا۔ اور امام مسلم نے اس سند سے نافع کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ ابن عمرؓ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرہ جعرانہ کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا، جعرانہ سے آپؐ نے عمرہ نہیں کیا۔ ان دونوں بزرگوں نے جس چیز کی نفی کہے دوسرے حضرات نے اس کا اثبات کیا ہے اور اثبات نفعی سے مقدم ہے۔ نوویؒ کہتے ہیں "یہ انکے علم کی نفی پر محمول ہے۔ یعنی ان کو اس کا علم نہیں، اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے عمرہ کیا تھا اور اثبات نفعی سے مقدم ہے کہ اس میں زیادت علم ہے، اور امام مسلم نے کتاب الحج میں ضمیمہ کے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جعرانہ سے عمرہ کرنا حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے ذکر کیا ہے۔"

عمرہ جعرانہ کی احادیث کی تخریج | میں کہتا ہوں کہ حضرت انسؓ کی حدیث امام احمد، شیعین، ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے۔ اور عمرہ جعرانہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں بھی آیا ہے جس کو ابو داؤد ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے۔ نیز حضرت جابرؓ سے بھی ثابت ہے جس کو بزار اور طبرانی نے واسطیہ روایت کیا ہے اور حیشمیؒ نے کہا ہے کہ اس کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔ نیز حدیثِ عمرؓ کے ثابت ہے جسکو امام احمد، حمیدی، ابو داؤد، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ نیز حدیثِ خالد بن عبدالعزیٰ ابن سلام الخزاعی سے ثابت ہے اس کو حسن بن سفیان اور نسائی نے "الکلی فی روایت کیا ہے جیسا کہ اسباب وغیرہ میں ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں "ان دو بزرگوں (ابن عمرؓ) نافعؓ کے علاوہ تمام اہل نقل، اصحاب صحیح، اصحاب سنن اور اصحاب مسانید اس کی روایت پر متفق ہیں اور اس کو تمام اصحاب مغازی و سیر نے ذکر کیا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ غلطاً کیونکہ وہ ہے جو عمرؓ کی حدیث میں سند احمد اور جامع ترمذی میں مذکور

ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کی تاریکی میں عمرہ کے لیے تشریف لے گئے تھے، رات ہی کو مکہ گئے اور راتوں رات عمرہ کر کے واپس جبرائیل پہنچ گئے۔ اور وہاں اس طرح صبح کی گویا رات وہیں رہے تھے۔ الخ۔ اسی روایت میں ہے کہ اسی وجہ سے آپ کا یہ عمرہ لوگوں سے مخفی رہا، اور امام احمد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ محرش فرماتے ہیں، ”پس اسی وجہ سے آپ کا یہ عمرہ بہت سے لوگوں سے مخفی رہا“ یعنی کہتے ہیں، ”نافع کا قول حجت نہیں کیونکہ ابن عمر کو جتنی احادیث معلوم تھیں وہ ساری انہوں نے نافع سے بیان نہیں کر دی تھیں، نہ یہ ضروری تھا کہ جتنی انہوں نے بیان کیں وہ سب نافع کو یاد بھی رہی ہوں، نہ یہ ضروری تھا کہ جتنے امور ابن عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں آئے ہوں ان میں سے ایک حدیث بھی ان کے حافظہ سے نہ اتر ہی ہو۔ اور جبرائیل کا عمرہ اس قدر مشہور اور ظاہر ہے کہ شک و شبہ سے بالاتر“

پانچویں فصل، متفرقات میں

یعنی عمرہ کے ابواب میں جو تقسیم روایات مروی ہیں ان پر بحث اور دیگر مباحث؛

بحث اول عمرہ رجب میں | امام بخاری وغیرہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے ان میں سے ایک رجب میں ہوا اور حضرت عائشہؓ نے ان پر انکار کرتے ہوئے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ ابو عبد الرحمن عبد اللہ بن عمرؓ پر رحم فرمائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے عمرے کئے وہ ان سب میں حاضر تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں کبھی عمرہ نہیں کیا“ اور ابوجزین میں چار عمروں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے، ”روایات حدیث میں مزید دو عمروں کا ذکر آتا ہے، ایک عمرہ رجب جو ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے صحیحین وغیرہ میں مذکور ہے۔ حافظ کہتے ہیں، ابن عمرؓ نے اس کا ذکر کیا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ابن عمرؓ پر انکار کیا ہے۔ اور عیسیٰ کہتے ہیں: ابو عبد الملک نے کہا ہے کہ یہ ابن عمر کا وہم ہے کیونکہ باجماع مسلمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین (مستقل) عمرے کئے اور اسی طرح ابن قیّمؒ نے ”المدنی“ میں لکھا ہے کہ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا وہم ہے۔“

یعنی کہتے ہیں: اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی نفی کی ہے اور حضرت ابن عمرؓ

نے اس کا اثبات کیا ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف ابن عمرؓ کے حق میں فیصلہ کیوں نہ کیا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ ثابت کرنا کہ رجب میں عمرہ کیا۔ اس کے معارضہ میں ایک دوسرا اثبات ہے کہ آپؐ نے ذی قعدہ میں عمرہ کیا، لہذا دونوں ایک وقت کی نفی کرتے ہیں اور دوسرے وقت کا اثبات کرتے ہیں، پس حضرت عائشہؓ نے اگرچہ رجب میں ہونے کی نفی کی ہے، مگر ذیقعدہ میں ہونے کا اثبات کیا ہے۔ اور پھر حضرت عائشہؓ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ تینوں متفق ہیں کہ آپؐ کے عمروں کی تعداد چار سے زائد نہیں اور حضرت عائشہؓ عمرہ حج کے علاوہ تینوں عمروں کا ذیقعدہ میں ہونا ثابت کرتی ہیں، لہذا حضرت عائشہؓ کا اثبات مقدم ہے، کیونکہ ابن عباسؓ کا اثبات بھی اسکا مؤید ہے اور عمرہ رجب کے اثبات میں ابن عمرؓ متفق ہیں۔ مزید برآں یہ کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عمرہ رجب کی نفی کی تو ابن عمرؓ اس پر خاموش رہے۔ اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کی طرف رجوع مزوری ہوا۔

اور نووی کہتے ہیں: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے انکار پر ابن عمر رضی اللہ عنہ کا سکوت اختیار کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ خود انہیں بھی اشتباہ ہو گیا تھا، یا وہ بھول گئے تھے، یا انہیں شک ہو گیا تھا" الخ۔ ابن عابدین کہتے ہیں: "بعض نے ملا علی قاری کے رسالہ موسومہ "الادب فی رجب" سے نقل کیا ہے کہ رجب میں عمرہ کا سنت ہونا بایں معنی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا یا اس کا حکم فرمایا ہو ثابت نہیں۔ البتہ یہ مروی ہے کہ ابن ربیعؓ جب کعبہ کی تعمیر کی تجدید سے ۷۴ رجب سے قبل فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے اونٹ کا شکر کیا۔ اور کئی بکرے ذبح کئے اور اہل مکہ کو عمرہ ادا کرنے کا حکم فرمایا۔ اور اس میں شک نہیں کہ صحابہ کافل حجت ہے اور جس چیز کو (اس قسم کے) مسلمان مستحسن سمجھیں وہ عند اللہ مستحسن ہوتی ہے۔ پس یہ وجہ ہے کہ اہل مکہ ماہ رجب میں خصوصیت سے عمرہ کرتے ہیں۔"

اور شیخ ابن قیمؒ بسوط کلام کے بعد فرماتے ہیں: "مقصود یہ ہے کہ طریقہ مشرکین کی مخالفت کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمرے حج کے مہینوں میں کئے کیونکہ مشرکین حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا ناجائز سمجھتے تھے اور اس کو افرجہ قرار (منسب سے بڑی بدکاری) کہتے تھے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اشہر حج میں عمرہ کرنا رجب کے عمرے سے بلاشبہ افضل ہے۔"

بحث دوم: عمرہ شوال | امام مالکؒ نے مؤطایں ہشام بن عروہؒ کی سند سے

حضرت عروہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مستقل طور پر) صرف تین عمرے کئے۔ ان میں سے ایک شوال میں تھا۔ یہ روایت امام محمدؒ نے بھی مؤطایں نقل کی ہے۔ اور اوچتر میں ہے کہ یہ روایت مؤطایں مرسل ہے مگر ابو داؤد نے اس کو حضرت عائشہ سے موصول روایت کیا ہے۔ حافظ کتے ہیں: اس کو سعید بن منصور نے بسند قوی روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین عمرے کئے۔ ان میں ایک شوال میں ہوا، لیکن حضرت عائشہؓ کا قول کہ ایک شوال میں ہوا اس کے معارض دو سروں کا قول یہ ہے کہ ذی قعدہ میں ہوا۔ اور ان دونوں کے درمیان تطبیق یہ ہو سکتی ہے کہ یہ آخر شوال اور اول ذی قعدہ میں ہوا ہو، اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابن ماجہ نے بسند صحیح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے کہ آنحضرتؐ نے کوئی عمرہ نہیں کیا مگر ذیقعدہ میں۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں: یہ حدیث مرسل ہے اور غلط بھی، یہ غلطی یا ہشام کو ہوئی یا عروہ کو۔ ابو داؤد نے اس کو مرفوعاً حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور وہ بھی غلط ہے۔ اس کا رفع بھی صحیح نہیں۔ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ ”جو مسند روایات، امام مالکؒ سے صحت نقل سے ثابت ہیں یہ روایت ان میں شامل نہیں۔ اور ابن قیمؒ کہتے ہیں: ”اور حضرت عائشہؓ سے اس حدیث کئے باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابن عباسؓ ان تینوں کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی قعدہ کے سوا کبھی عمرہ نہیں کیا۔ اور یہی صحیح ہے۔ پوری تفصیل اوچتر میں ہے اور اس کے آخر میں ہے کہ اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ جبہور نے عمرہ شوال کو مجازاً عمرہ جعرانہ پر محمول کیا ہے۔“

اور جعرانہ کے بیان میں گزر چکا ہے کہ بر تقدیر صحت روایت، محققین کے نزدیک عمرہ شوال کا محمل عمرہ جعرانہ ہے اور اوچتر میں ہے کہ ”بعض نے عمرہ شوال کو عمرہ حدیبیہ پر محمول کیا ہے۔ مگر یہ مناسب نہیں۔ اور حاشیہ ابو داؤد میں ہمارے شیخ الشائخ شاہ محمد اسحق دیوبند قدس سرہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد کہ ”ایک عمرہ شوال میں ہوا“ یہ عمرہ جعرانہ کی طرف اشارہ ہے جو ذی قعدہ میں ہوا۔ مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حنین کی طرف تشریف لے جانا شوال ہی میں ہوا تھا۔ اور حنین سے واپسی پر اسی سال اسی نفر میں یہ عمرہ ہوا۔ اس لیے اسے شوال کی طرف

منسوب کر دیا اگرچہ ہوا ذی قعدہ میں

بحث سوم: عمرہ رمضان | باقی رہا رمضان کا عمرہ؟ تو اوچتر میں عمرہ القضا کے بیان میں

ہے کہ ”ابن حبان نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے کہ یہ رمضان میں ہوا تھا، محب طبری نے کہا ہے کہ یہ بات ابن حبان کے سوا کسی نے نقل نہیں کی۔ اور شہور یہ ہے کہ ذیقعدہ میں ہوا“ اور زرکانی میں ہے کہ ”ابن قیمؒ نے اس امر کا انکار کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عمرہ رمضان میں بھی کیا تھا۔ البتہ دارقطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ ”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان المبارک میں عمرہ کے لیے گئی تھی، پس آپؐ نے افطار کیا اور میں نے روزہ رکھا۔ اور آپؐ نے قصر کی اور میں نے پوری نماز پڑھی“ دارقطنی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے اور ابن قیمؒ نے کہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں کوئی عمرہ نہیں کیا، یہ بات حافظ نے نقل کی ہے۔ اور مصنف (صاحب مواہب) نے اپنے قول میں ان ہی کی پیروی کی ہے کہ ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ”فی رمضان“ منرجح ہے“ سے متعلق ہے (یعنی سفر رمضان میں ہوا تھا، اور اس سے مراد فتح مکہ کا سفر ہے۔ کہ رمضان ہی میں مکہ فتح ہوا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سال فتح کے بعد جعراند سے عمرہ کیا تھا۔ فتح کے بعد غزوہ حنین اور غزوہ طائف کے لیے تشریف لے گئے۔ پھر حنین کے غنائم تقیم فرمائے اور بعد ازاں عمرہ ادا کیا۔ گروہ ذی قعدہ میں کیا تھا۔ اور حافظ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ”یہ حدیث دارقطنی نے ایک اور سند سے بھی ذکر کی ہے۔ اور اس میں رمضان کا ذکر نہیں“ اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی دارقطنی کی اس حدیث کا انکار کرتے ہوئے اس پر مفصل کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے اور اس حدیث کے رد کرنے کے وجوہ مفصل ذکر کئے ہیں۔

البتہ یہاں ایک بات باقی رہ گئی کہ باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ رمضان کی فضیلت بیان فرمائی۔ مگر خود رمضان میں عمرہ نہیں کیا۔ چنانچہ اوچتر میں ہے کہ حافظ کہتے ہیں: ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف شہر حج ہی میں عمرہ کئے، اور رمضان میں عمرہ کرنے کی فضیلت ہمیشہ الباب سے ثابت ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے افضل کیا ہے؟ جو بات میرے لیے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسروں کے لیے تو رمضان میں

عمرہ کرنا افضل ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وہی افضل تھا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اس چیز کے جواز کو بیان کرنے کے لیے تھا، جس سے اہل طہارت منع کیا کرتے تھے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قول و فعل کے ذریعہ ان کی تردید کا ارادہ فرمایا اور یہ چیز اگر دوسروں کے لیے مکروہ بھی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وہی افضل تھی۔ اور صاحب الہدیٰ کہتے ہیں: "احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں ایسی عبادت میں مشغول رہا کرتے ہوں جو عمرہ سے بھی افضل ہو، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نجات کی مشقت کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں عمرہ کرتے تو لوگ بہر حال اس کی طرف سبقت کرتے، جبکہ انہیں عمرہ اور روزہ جمع کرنے سے مشقت لاحق ہوتی۔ اور بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عمل کرنا چاہتے تھے، مگر صرف اس بنا پر ترک فرما دیتے کہ کہیں امت پر فرض نہ ہو جائے۔ اور ان کی مشقت کا اندیشہ عمل سے مانع ہو جاتا تھا۔"

شیخ ابن حاتم نے بھی اس پر حرم کیا ہے اور اس کی کچھ بحث جُزء الوداع کے آخر میں گزری ہے۔

فوائد

پہلا فائدہ: عمرہ کے لیے حل کی طرف نکلنا جائز ہے یا نہیں؟

حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمارت میں سے کوئی عمرہ ایسا نہیں جو مکہ سے باہر نکل کر کیا گیا ہو۔ جیسا کہ آجکل بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام عمارت باہر سے مکہ میں داخل ہو کر کئے گئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے بعد تیرہ سال مکہ میں رہے مگر یہ کہیں منقول نہیں اپنے اس مدت میں کبھی مکہ سے باہر جا کر عمرہ کیا ہو۔ لہذا جو عمرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا اور جس عمرہ کو شروع فرمایا وہ صرف ایسا عمرہ ہے جو باہر سے مکہ میں داخل ہو نیوالا ادا کرے، نہ کہ اس شخص کا عمرہ جو مکہ میں مقیم ہو اور عمرہ کرنے کیلئے حل کی طرف نکل جائے۔ اس قسم کا عمرہ آپ کے دور میں کبھی کسی نے نہیں کیا البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام رفقاء میں سے تنہا حضرت عائشہؓ اس سے مستثنیٰ ہیں کہ انہوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ چونکہ انکو ماہواری کا غدر پیش آگیا تھا اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انہوں نے عمرہ پر

حج کا احرام باندھ کر قرآن کر لیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا تھا کہ ان کا طواف بالبيت اور صفا و مردہ کی سعی انکے حج و عمرہ دونوں کے لیے کافی ہوگی۔ مگر انکے دل میں یہ کھٹک تھی کہ دیگر اہتمام المؤمنین تو مستقل حج اور مستقل عمرہ کر کے واپس جا رہی ہیں کیونکہ ان کا تمتع تھا۔ اور انہیں ماہواری کا عارضہ پیش نہیں آیا تھا۔ انہوں نے قرآن کیا تھا۔ اور یہ ایسے عمرہ کے ساتھ واپس ہوں گی جو بضمن حج ادا کیا گیا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دلجوئی کی خاطر ان کے بھائی کو حکم فرمایا کہ انہیں تنغیم سے عمرہ کرا لائیں۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حج میں تنغیم سے عمرہ نہیں کیا، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور رفیق نے۔ — میں کہتا ہوں: ابن قیمؒ نے تو یہی کہا ہے، اور زرقانیؒ نے ان کا کلام نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ”اس پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عمرہ کیا تو یہ اس کی مشروعیت کی دلیل ہے، اس کے بعد ابن قیمؒ کا سارا کلام بے معنی ہو جاتا ہے۔ اور الفاکھی نے محمد بن سیرین کی سند سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے لیے تنغیم کو میتقات مقرر فرمایا ہے۔“ اور حضرت عطا سے نقل کیا ہے کہ: ”جو شخص عمرہ کرنا چاہے خواہ وہ اہل مکہ سے ہو یا ان کے علاوہ۔ اسے چاہیے کہ تنغیم یا جبرانہ کی طرف نکل جائے اور وہاں سے احرام باندھ کر آئے۔“ اور موطا میں ہے کہ ابا امامتؒ سے دریافت کیا گیا کہ اہل مکہ میں سے ایک شخص عمرہ کرنا چاہتا ہے کیا وہ مکہ کے اندر ہی سے عمرے کا احرام باندھے؟ فرمایا! انہیں بلکہ حلؒ کی طرف نکل جائے اور وہاں سے احرام باندھ کر آئے۔ اور او جیز میں ہے کہ جبہ و راس کے قائل ہیں کہ احرام عمرہ کے لیے مکہ والوں کا میتقات حلؒ ہے۔

موفق وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اگرچہ علماء کے مابین اس امر میں اختلاف ہے کہ احرام کے لیے سب سے افضل جگہ کونسی ہے، اور حلؒ کی طرف نکلنے کے وجوب کی تصریح، حافظ، قسطلانی، طیبی، قاری، نووی، ابی اور شوکانی وغیرہ نے کی ہے۔ اور امام بخاریؒ نے ”صحیح“ میں ایک باب کا عنوان قائم کیا ہے، ”باب ہل اہل مکہ للجمع والعمرة“ اور اس کے ذیل میں مواقت کی حدیث ذکر کی ہے، جس میں یہ لفظ ہیں: ”یہاں تک کہ احرام باندھیں اہل مکہ مکہ سے“ لیکن شراح صحیحین نے عمرہ کے ساتھ حدیث کی تخصیص کی ہے (یعنی اہل مکہ کو صرف حج کا احرام مکہ سے باندھنے کا حکم ہے، عمرہ کے احرام کا یہ حکم نہیں) بلکہ عمرہ کا احرام حدودِ حرم سے باہر نکل کر باندھا جائے (اور انہوں نے ترجمہ بخاریؒ کی یہ توجیہ یہ کی ہے کہ

موصوف نے عموم لفظ پر نظر کی ہے۔ محب طبری کہتے ہیں: ”مجھے علم نہیں کہ کسی نے مکہ کو عمرہ کا میقات کہا ہو۔“
 کذا فی التلخیص، حافظ نے یہ بھی کہا ہے کہ جب حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عمرہ کیا تو
 یہ اس کی مشروعیت کی دلیل ہے۔“ اھ۔

دوسرا فائدہ: عمرہ کیلئے سب سے
 افضل میقات کون سا ہے؟

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں یہ عنوان قائم کیا ہے:
 اس امر کا بیان کی عمرہ کرنا چاہے تو اسے کس جگہ سے احرام باندھنا چاہئے؟

اور اس کے ذیل حضرت عائشہؓ کے تنعیم سے عمرہ کرنے کی حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ”پس
 کچھ لوگ اس طرف گئے ہیں کہ اہل مکہ کے لیے تنعیم کے سوا عمرہ کا کوئی میقات نہیں۔ یہ لوگ اہل مکہ کے لیے عمرہ کا
 میقات صرف تنعیم ہی قرار دیتے ہیں۔ اور ان کا کہنا ہے کہ اہل مکہ کو اس سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، جس طرح غیر
 اہل مکہ کے لیے جو جو میقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائے ہیں انہیں احرام کے بغیر ان سے
 تجاوز کرنے کی اجازت نہیں۔ اور دوسرے حضرات اس کے خلاف یہ کہتے ہیں کہ اہل مکہ کا میقات، جس سے
 وہ عمرہ کا احرام باندھیں، حل ہے۔ لہذا حل کے جس حصہ سے احرام باندھ لیا جائے کافی ہے۔ ان کے نزدیک
 تنعیم اور غیر تنعیم حل کے تمام مقامات اس حکم میں یکساں ہیں“ اور اس قول کے دلائل ذکر کرنے کے بعد امام طحاویؒ
 فرماتے ہیں: ”اور یہ سب امام ابو حنیفہؒ، امام یوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے۔“ اھ۔ مختصراً۔

اور امام مالکؒ مؤطا میں فرماتے ہیں: ”رہا تنعیم سے عمرہ کرنا سویرہ تنعیم نہیں۔ جو شخص حل کی کسی جگہ
 سے عمرہ کا احرام باندھ لے یہ اس کیلئے انتشار اللہ کفایت کرے گا۔ لیکن افضل یہ ہے کہ اس میقات سے احرام
 باندھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا، یا اس مقام سے جو تنعیم سے بعید تر ہو۔“ اھ

اور آدجنہ میں علیؑ سے نقل کیا ہے: ”جاننا چاہیے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اہل مکہ کے حج کا میقات
 مکہ اور حرم ہے اور عمرہ کا میقات حل ہے تاکہ ایک نوع کا سفر متحقق ہو جائے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے
 کہ احرام عمرہ کے لیے حل کی کونسی جگہ افضل ہے؟ چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں تمام حل یکساں ہے اور
 امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تنعیم افضل ہے اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سب سے افضل جعرانہ ہے، پھر تنعیم
 پھر جو بعید سے بعید تر ہو اور مغنی میں امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ مکہ کی عمرہ احرام کے لیے جس قدر دور چلا
 جائے اسی قدر زیادہ ثواب ہوگا۔ اور ناکئیؒ نے حضرت عطاءؒ سے نقل کیا ہے کہ جو شخص عمرہ کا ارادہ
 رکھتا ہو وہ تنعیم یا جعرانہ چلا جائے اور وہاں سے احرام باندھ کر آئے، اور افضل یہ ہے کہ میقات حج

سے آئے اور ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے لیے تنعیم کو میثاق مقرر کیا ہے۔ اور تحفۃ المحتاج میں ہے کہ عمرہ کا ارادہ کرنے والے کے لیے جل کی افضل جگہ جعراند ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں سے رات کی وقت عمرہ کیا تھا، اس کے بعد تنعیم پھر حدیبیہ ۱ھ۔

میں کتاہوں کو نوی نے "مناسک" میں اور عام فقہائے شافعیہ اور ان کے شارحین نے یہی ترتیب ذکر کی ہے۔ حنابلہ کی کتب نیل المارب اور الردض المربع میں کسی جگہ کی تسنیں کو ترجیح نہیں دی، بلکہ صرف جل کے شرط ہونے پر اکتفا کیا ہے اور ابن قدامہ کہتے ہیں: "جل کی جس جگہ سے بھی احرام باندھ لے جائز ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو تنعیم سے اس لیے عمرہ کرایا تھا کہ وہ مکہ سے جل کی قریب تر جگہ تھی" اور دیرکتے ہیں: "اور اس کا جل کی طرف نکلنا ضروری ہے، اور جعراند دوسری جگہوں سے اولیٰ ہے، اس کے بعد تنعیم" میں کہتا ہوں کہ دسوقی نے ان دونوں کو یکساں قرار دیا ہے۔ کہ ان میں ایک کو دوسری جگہ پر کوئی فضیلت نہیں۔ ۱ھ۔

اور حنفیہ کے نزدیک تنعیم افضل ہے، جیسا کہ بہت سے اہل فروع نے، جن میں صاحب درمناثر بھی شامل ہیں، اس کی تصریح کی ہے۔ ۱ھ۔ ملخصاً۔

تیسرا فائدہ: اشہر حج میں عمرہ کرنا | اوچتر میں ہے کہ اہل جاہلیت اس کو فجر فجر (سب سے بڑی بدکاری) سمجھتے تھے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قولاً فعللاً باطل قرار دیا، اور اسی بنا پر صحابہ کو حج فسخ کر کے عمرہ بنانے کا حکم فرمایا تاکہ اس کے جواز کی خوب شہرت ہو جائے۔ حافظؒ کہتے ہیں: "اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ جو شخص اہل ج میں مشغول ہو اس کے لیے تمام ایام میں عمرہ کرنا جائز ہے، البتہ حنفیہ سے نقل کیا گیا ہے کہ عرفہ، یوم النحر اور ایام تشریق میں مکروہ ہے" میں کتاہوں کہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "یہ بات کمال عمرہ کی موجب ہے کہ غیر اشہر حج میں عمرہ کرے" سیوطیؒ کہتے ہیں کہ ابن ابی شیبہؒ وغیرہ نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ ان سے اشہر حج میں عمرہ کرنے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: "حج کے معروف مہینے ہیں جن میں عمرہ نہیں" اور ابن ابی شیبہؒ اور ابن جریر نے ابن سیرینؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: کہ کسی اہل علم نے اس امر میں شک نہیں کیا کہ غیر اشہر حج میں عمرہ کرنا اشہر حج میں عمرہ کرنے سے افضل ہے" اور ابن عوفؒ سے نقل کیا ہے کہ قاسمؒ سے اشہر حج میں عمرہ کرنے کے بارے میں دریافت

کیا گیا تو فرمایا وہ (یعنی صحابہ کرام) اس کو تمام نہیں سمجھتے تھے۔ اھ ملخصاً۔

اور مؤطا میں ہے کہ امام مالکؒ، نافعؒ سے اور وہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا: ”اپنے چچ اور عمرہ کو جدا جدا کیا کرو، یہ تمہارے چچ کو زیادہ پورا کرنے والی چیز ہے۔ اور عمرہ کو زیادہ پورا کرنے والی بات یہ ہے کہ غیر اشہر چچ میں عمرہ کرے“ میں کہتا ہوں کہ حضرت عمرؓ کا مقصد تمتع سے منع کرنا تھا اور اس مسئلہ میں ان کا مسلک معروف ہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مکہ مکرمہ کی طرف بکثرت سفر کیا جائے، تاکہ چچ اور عمرہ کے لیے مستقل طور پر الگ الگ سفر ہو کرے، علاوہ ازیں اس کی دیگر وجوہ معروف ہیں۔ جن کی تفصیل ادجزہ اور حاشیہ لایع میں مذکور ہے۔

خاتمہ رسالہ | اس مختصر عبارت میں جن امور کے ذکر کرنے کا ارادہ تھا یہاں بحمد اللہ ان کا اختتام ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی مدد سے جمعہ المبارک کی صبح، ماہ مبارک رجب المرجب کی پندرہ تاریخ کو ۱۳۹۵ھ نیرہ سو نوے ہجری (علی صاحبہا الف الف صلوة وتیمہ) میں اس کی تسوید سے فراغت ہوئی، اس کی تکمیل میں تقریباً ایک مینے تک توقف رہا، جس کا سبب یہ ہوا کہ محرم الحرام میں جس آنکھ کا آپریشن ہوا اس کے طبی معائنہ اور علاج معالجہ کے لیے علی گڑھ جانا اور وہاں ہسپتال میں رہنا پڑا۔

اس بندہ پر اللہ رب العزت کے جو بہت ہی عظیم الشان نعمات اور بے شمار احسانات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس بندہ نے جس قدر فضائل کے رسائل تالیف کئے ہیں مثلاً فضائل قرآن اور فضائل چچ وغیرہ اور ان کے علاوہ جو کتابیں تالیف کی ہیں ان سب رسائل و کتب کے بارے میں اس بندہ کو یا اس کے بعض مخلصین اصحاب کو رؤیا صالحہ اور مبشرات سے نوازا گیا۔

یہ رسالہ جز عمات جب اختتام کے قریب پہنچا تو ہمارے ایک مخلص دوست جناب الحاج سلیمان افریقی نے (جو مدت تک مدینہ منورہ میں اس بندہ کے پاس رہ کر اوراد و اشغال میں مشغول رہے اور سعادت چچ سے بہرہ ور ہونے کے بعد سہارنپور آئے۔ اور سفر و حضر میں ہمیشہ میرے ساتھ رہتے ہیں ایک خواب دیکھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالی میں شرف قبول سے سرفراز ہوا۔ الحاج سلیمان کے الفاظ میں خواب کا متن درج ذیل ہے۔

”میں نے خواب دیکھا کہ میرے دل میں زیارت نبوی کا داعیہ پیدا ہوا اور میں مدینہ منورہ

کی طرف پیدل چل کھڑا ہوا۔ ابھی تھوڑی دور چلا تھا کہ مجھے دور سے حرم نبوی نظر آنے لگا۔ دریں اثنا کہ میں حرم شریف کی طرف جا رہا تھا اچانک میں اپنے تئیں آپ کے (یعنی حضرت شیخ کے) حجرے کے سامنے کھڑا پاتا ہوں۔ بہت سے لوگ حجرہ کے باہر کھڑے ہیں اور مولانا محمد یونس صاحب استاذ حدیث مظاہر العلوم سہارنپور حجرہ سے باہر آرہے ہیں۔ اور مجھ سے کسی نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ کے اندر رونق افروز ہیں، یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے داخل ہونے کا اشارہ کیا، میں اندر گیا تو زحمت و مسرت کو ضبط نہ کر سکا اور میرے جسم میں گویا بجلی کی لہر دوڑ گئی، میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کی چارپائی کے سر ہانے کی جانب تکیہ لگائے تشریف فرما ہیں، سفید دستار زیب سر ہے، ریش مبارک سفید ہے، اور آنکھوں پر چشمے لگا رکھے ہیں۔ میں نے سلام عرض کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب مرحمت فرمایا اور مصافحہ کے لیے دست مبارک بڑھایا، پھر آپ کی جانب متوجہ ہوئے۔ آپ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دامنہ جانب زمین پر بیٹھے یہ رسالہ جو ”حجۃ الوداع“ شمار ہے تھے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سنے میں مصروف ہو گئے اور میں چارپائی سے نیچے اقدام عالیہ کی جانب بیٹھ گیا، اھ

اس رڈیا میں جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس بقلائے بیتا کی طرف سماع کے لیے متوجہ ہونا اور اس بعدہ کار سالہ کی قرأت میں مصروف ہونا یہ اس بندہ ضعیف کے لیے شرف و انتہا کا کافی سرمایہ ہے۔ فَلَلهُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔

تصانیف

حضرت اقدس شیخ الحدیث

مولانا محمد زکریا صاحب، مظاہر العلوم سہارنپور

۱۶۔ اکابر کا رمضان	* اردو تصانیف :
۱۷۔ خوان خلیل	۱۔ خصائل نبویؐ شرح شامل اللام الترمذی
۱۸۔ اکابر کا سلوک احسان	۲۔ حکایات صحابہؓ
۱۹۔ مکتوبات شیخ	۳۔ فضائل ذکر
۲۰۔ آپ بیتی	۴۔ فضائل نماز
۲۱۔ فتنہ مودودیت	۵۔ فضائل قرآن مجید
۲۲۔ حجتہ الوداع	۶۔ فضائل رمضان
۲۳۔ الاعتدال فی مراتب الرجال (اسلامی سیاست)	۷۔ فضائل تبلیغ
اس کتاب میں سیاسی مسائل حاضر کے متعلق کافی	۸۔ فضائل درود شریف
ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔ سات سوالوں کے جوابات انتہائی	۹۔ فضائل صدقات
سنجیدگی اور منانیت سے تحریر کئے گئے ہیں۔	۱۰۔ فضائل حج
* عربی تصانیف :	۱۱۔ تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور
۱۔ امالی الاحبار شرح معانی الآثار	ان کے مفصل جوابات
۲۔ لامع القدری علی جامع البخاری	۱۲۔ موت کی یاد
۳۔ ادجز المسائل شرح موطاء امام مالکؒ	۱۳۔ قرآن عظیم اور جبریت تعلیم
۴۔ الکوکب الذری (شرح ترمذی)	۱۴۔ تقریر بخاری
۵۔ حجتہ الوداع و جزعہ عرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۱۵۔ تاریخ مشائخ چشت
۶۔ الابواب والترائج للبخاری	
۷۔ بذل المجهود فی شرح ابی داؤدؒ	

ملنے کا پتہ : مَعْمَدُ الْخَلِیْلِ اِلَیْمِی

بہادر آباد، کراچی، پاکستان ۳۳۵/۳